قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ستمبر 2018 قیمت 15₹

ماہنامہ

اُردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

الوداع

اٹل بہاری واجپئی جی

پ: 25/دسمبر/1924

و: 16/اگست/2018

قومی اردو کونسل میں جشن آزادی کی جھلکیاں

قومی اردو کونسل میں 72واں جشن آزادی جوش وخروش کے ساتھ منایا گیا

مشمولات

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:20، شمارہ:09، ستمبر 2018

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آراسے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ۔
نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

قاری ہی تخلیق کا سب سے بڑا
نقاد ہوتا ہے: قاضی مشتاق احمد مشتاق کریمی 7

زبان و تعلیم

ثانوی درجات کی درسی کتب کا جائزہ رضوانہ بیگم 10

یاد رفتگاں

ایک باغ و بہار آدمی غضنفر 14
پروفیسر عظیم الشان صدیقی اسلم جمشید پوری 16
ڈاکٹر گوپال داس نیرج جمال اختر 19

نقد و نگاہ

استعارہ اور سیاسی ذہن کی کشمکش محمود شیخ 22
باندہ اور غالب داؤد احمد 26
پانی پت کی چند مایہ ناز علمی ادبی ہستیاں رؤف خیر 30
صفی اورنگ آبادی کی رباعی گوئی سید محبوب قادری نظامی 33

ستمبر کے ستارے

منظر کاظمی: سفر مدام کا افسانہ نگار شمع اختر کاظمی 35
بلراج کومل: منفرد لفظیات کا شاعر محمد عارف 38

ہم نے جنھیں بھلا دیا

مبارک مونگیری
منظوم خاکہ نگاری کا امام اشعر حمیدی 41
فانی گورکھپوری فیضان حیدر 44
میرے رشکِ قمر کا شاعر: فنا بلند شہری محمد فاروق خان 47

شخصیات

مہاشویتا دیوی اسد رضا 49
شاہین بدر سید شاہد اقبال 51

نیا آسماں، نئے ستارے

یوسف خاں کمبل پوش کی سفرنامہ نگاری محمد اشتیاق شاکر 53
اردو شاعری میں رام ذاکر حسین 56
شفق کا تخلیقی جہان رابعہ خاتون 59

شہر بین

اردو کا شہر جلالپور زائر حسین ثالثی 61

یوم اساتذہ

معاشرے میں استاد کا کردار اسلم محبوب خان 64

ماحولیات

کچن گارڈن نسیم سعید 67

سائنس

اکیسویں صدی کا سب سے زیادہ
وقفہ والا چاند گرہن! انیس الحسن صدیقی 70

کمپیوٹر

ورڈ پیڈ 73

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف ادارہ 77

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 88

ہماری بات

جو زبانیں اپنی داخلی قوت کی بنیاد پر ارتقائی سفر طے کرتی ہیں وہ کسی خاص ملک اور سرحد میں قید نہیں رہتیں۔ اردو زبان کی خوش بختی یہ ہے کہ یہ بھی کسی خاص مقام یا علاقے تک محدود نہیں ہے بلکہ پوری دنیا میں اردو زبان کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان صرف اپنے رسم الخط کی وجہ سے نہیں بلکہ فنی، فکری اور لسانی قوت کی بنیاد پر بھی پوری دنیا میں الگ پہچان رکھتی ہے۔ بہت سے علاقوں میں اردو اپنے رسم الخط کے ساتھ زندہ ہے۔ لیکن بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں اردو رسم الخط تو نہیں ہے مگر وہاں بھی اردو اپنی موجودگی کا اندراج کرا رہی ہے۔ خاص طور پر اردو کی کلاسیکی شاعری کے جو ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں ان کی وجہ سے اردو سے دلچسپی کا دائرہ بڑھ رہا ہے۔ میر، غالب، اقبال، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، اختر الایمان اور دیگر بڑے شعرا کے ترجمے دنیا کی بڑی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

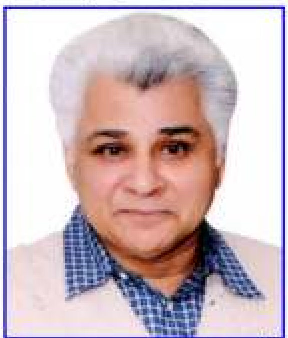

خاص طور پر انگریزی کے جو معتبر اشاعتی ادارے ہیں ان اداروں نے بھی ان بڑے شاعروں کے کلام کو انگریزی میں شائع کیا ہے اور ان کے قارئین کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ اردو میں جتنے بھی کہانی کار ہیں ان میں سے بیشتر ترجمے کی وجہ سے امریکہ، روس، جاپان، جرمنی اور دیگر علاقوں تک پہنچ چکے ہیں۔ پریم چند، منٹو، کرشن چندر، بیدی، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، رشید جہاں، بلونت سنگھ، خواجہ احمد عباس کے علاوہ اردو کی بہت سی کہانیوں اور ناولوں کے ترجمے انگریزی اور دیگر زبانوں میں ہوتے رہے ہیں۔ پریم چند کی کہانیوں کا انگریزی میں چار جلدوں پر محیط ترجمہ پینگوین جیسے معتبر اشاعتی ادارے نے شائع کیا ہے۔ 'امراؤ جان ادا' اور دیگر مشہور ناولوں کے ترجمے بھی انگریزی اور دیگر زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

اردو کے جو کلاسیکی تذکرے اور تاریخ کی کتابیں ہیں ان کے ترجمے بھی انگریزی میں ہوتے رہے ہیں۔ یہاں مولوی محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' کا ذکر ضروری ہے جس کا ترجمہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ 'ذکرِ میر' کا انگریزی ترجمہ بھی آکسفورڈ سے شائع ہوا ہے۔ انگریزی میں اردو ادب کی نہ صرف تاریخیں لکھی گئی ہیں بلکہ بہت سے شعرا کے تذکرے بھی لکھے گئے ہیں۔ دیکھا جائے تو مختلف اصنافِ ادب میں اردو کی جو شاہکار تخلیقات ہیں وہ ترجمے کی وساطت سے پوری دنیا تک پہنچ چکی ہیں۔ اس ضمن میں رالف رسل، خورشید الاسلام، سی ایم نعیم، بیدار بخت، جے رتن، خواجہ طارق محمود، ڈیوڈ میتھیوز، اعجاز احمد، محمد عمر میمن، رخشندہ جلیل، اسدالدین وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے اردو ادبیات کو انگریزی زبان میں متعارف کرایا ہے۔ انگریزی کے علاوہ ہندی اور دیگر زبانوں میں بھی اردو کے شعرا کے انتخابات اور فکشن کے ترجمے ہوتے رہے ہیں۔ یہ ترجمے اردو کی وسعت اور قوت کا مظہر ہیں اور اس بات کا ثبوت کہ اردو زبان و ادب میں فکری اور فنی سطح پر بڑی توانائی اور تازگی ہے اور یہی وجہ ہے کہ انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں کے اشاعتی ادارے ترجیحی طور پر اردو زبان و ادب کے سرمایے کو منتقل کر رہے ہیں اور اردو کو قارئین کا ایک نیا حلقہ عطا کر رہے ہیں۔ اردو کی منتخب تحریروں کے تراجم کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، خاص طور پر اردو کی کہانیاں عالمی سطح پر بہت مقبول ہو رہی ہیں۔

خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ عالمی ادبیات کے ترجمے بھی اردو زبان میں ہو رہے ہیں اور اس طرح اردو کی ثروت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو اپنے رسم الخط والے علاقے میں اگر سکڑتی جا رہی ہے تو دیگر زبانوں میں ترجمے کے ذریعے اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے اردو کے تعلق سے ہمیں زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس زبان میں اتنی قوت ہے کہ اگر یہ اپنے خاص علاقے سے بھی محروم ہو گئی تو دوسرے علاقوں میں اپنے چراغ جلائے رکھے گی۔ ترجمے کے ذریعے اردو کی تقدیر اور تصویر عالمی سطح پر بدل رہی ہے اور اس حقیقت سے سبھی واقف ہیں کہ اردو زبان نہ صرف ہندوستان بلکہ امریکہ، لندن، خلیجی ممالک، یوروپی ممالک میں تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ جرمنی، جاپان اور چین میں بھی اردو کے نہ صرف چاہنے والوں کا ایک بڑا حلقہ موجود ہے بلکہ وہاں اردو مطالعات کے شعبے بھی قائم ہیں اور وہاں کے افراد نہ صرف اس زبان کی تخلیقات کو اپنی زبانوں میں منتقل کر رہے ہیں بلکہ تحقیق و تنقید کا ایک نیا معیار بھی قائم کر رہے ہیں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

✍ جولائی کا شمارہ اردو زبان کے چار ادبا کی تصویروں کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ 'ہماری بات' کے تحت مدیر نے 'کونسل' کی کارکردگی کی قابلِ مدح خط کشی کی ہے۔

جناب رضوان احمد فاروقی نے روش صدیقی کی شاعری پر گفتگو کی ہے۔ گوہر جان گوہر کی سوانح حیات و شاعری سے متعارف کرایا ہے۔ اکبرالہ آبادی ضلع جج کے عہدے سے سبک دوش ہو چکے تھے، ایک دن گوہر ان سے ملاقات کی غرض سے ان کے دولت خانے گئی تھی، لیکن وہاں انھیں حاضر نہ پا کر واپس چلی گئی تھی۔ گھر میں آ کر اکبرالہ آبادی نے اس کی آمد کی بات جان کر یہ طنزیہ ومزاحیہ شعر اس کے لیے کہا تھا۔ 'خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا'۔ دوسرے مصرعے کا اول لفظ 'سب' کی جگہ 'سبھی' ہے۔ اس مقالے کے آخر میں گوہر کے شعر کا موازنہ کسی قدیم شاعر کے اس شعر سے کیا جا سکتا ہے

مجھے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا
نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

ڈاکٹر ندیم احمد ندیم نے اپنے مقالے میں پنجاب کے تناظر میں اردو زبان کے گیتوں کا محاکمہ کیا ہے۔ اس میں صفحہ 38 پر یہ لکھا ہے کہ ''گیت' لفظ سنسکرت کے 'گیتا' لفظ سے ماخوذ ہے۔ اس کے عین برعکس سنسکرت میں 'گا' (بمعنی کچھ گانا) مصدر سے مشتق لفظ 'گیت' کا معنی ہے گانا۔ اسی سے لفظ 'گیتا' بنتا ہے، جس کا معنی ہے ''گایا ہوا' مثلاً 'شری مدبھگود گیتا' الفاظ کا معنی ہے 'شریمان بھگوان کی گائی ہوئی'۔

اسی صفحے پر تیسرے کالم میں درج لفظ 'لوازمات' متنازع فیہ ہے، کیونکہ اتر پردیش ہندی سنستھان سے شائع موقر 'اردو ہندی شبد کوش' میں 'لوازمہ' عربی مذکر لفظ کے یہ معنی درج ہیں: '' دیکھئے 'لوازم'۔ یہ لفظ غلط ہے، لیکن اردو میں بولتے ہیں۔ اس کا جمع لفظ 'لوازمات' بھی بنا لیتے ہیں، جو بالکل غلط ہے''۔ (صفحہ 593)

اردو زبان میں حالانکہ 'حب الوطنی' لفظ کا تصرف مروجہ ہو چکا ہے، اگلے صفحہ 39 کے دوئم کالم میں یہی درج ہے، تاہم اس کی صحیح صورت 'حب الوطن' ہی ہے۔ زبان و املا سے قطع نظر یہ مقالہ معیاری ہے۔ جناب حقانی القاسمی نے بقول علامہ اقبال 'دیدہ ور' ('بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا'۔) خواجہ احمد عباس جیسے مختلف الصفات و جہات شخص پر جو مضمون لکھا ہے، وہ حاصل شمارہ بھی ہے اور اسی موضوع پر تا حال شائع تمام تر مضامین سے سبقت بھی لے گیا ہے۔ مستزاد، 'کلیاتِ خواجہ احمد عباس'، ضخیم کتاب پر مبنی یہ مضمون عباس صاحب کے تئیں صد فی صد ایک معقول و مناسب خراجِ تحسین بھی ہے۔ سرِ تسلیم خم ہے اور برجستہ منہ سے یہی نکلتا ہے۔ 'ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے!''

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاؤک**: کوٹھی نمبر A-201، گورونانک، پٹیالہ

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' کا شمارہ جولائی 2018 وقت پر ہم دست ہوا۔ 'فضیل جعفری اور لحن شور انگیز' میں ان کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ فضیل جعفری نے ادب کو بہت کچھ دیا ہے اور تمام نقادوں میں منفرد مانے جاتے ہیں۔ شمیم طارق نے ذاتی ذوق وشوق سے اپنا مقام ادب میں بنایا ہے، محنت ومطالعہ کو ذات کا جز بنا دیا ہے۔ ان کی گفتگو سے ادبی معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ محمد اطہر حسین نے عہد حاضر میں اساتذہ کی تربیت، ضرورت، اہمیت اور تاریخی پس منظر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ میں تو یہ بات کہوں گا کہ اساتذہ خوف خدا کے تحت فرائض منصبی انجام دیں اور احتساب کا عمل روا رکھیں کیونکہ قوم کی تعمیر وتشکیل ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ پریم چند کے افسانوں میں قومی یک جہتی کے حوالوں سے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ پروفیسر 'محمد حسن کی پریم چند شناسی' بھی عمدہ مضمون ہے۔ قاضی سلیم پر مضمون بہت خوب ہے۔ بدر محمدی نے مراسلہ نگاری اور ذرائع ابلاغ پر مضمون تو لکھا ہے لیکن پہلے مراسلہ نگار کون ہے اس بحث کو قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔ اگر مزید تحقیق کر کے بتلاتے تو اچھا تھا۔ کلیات خواجہ احمد عباس بہت بڑا کام ہے اسی نہج پر مزید دوسرے ادیبوں کی تخلیقات کو جمع کر کے کلیات کی شکل میں شائع کرنا چاہیے۔ نبی احمد نے جے پرکاش یونیورسٹی چھپرہ میں اردو تحقیق کی رفتار پر تفصیل سے لکھا ہے۔

❖ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**: سابق پرنسپل، یاقوت پورہ، نظام آباد

✍ جولائی کا اردو دنیا زیر مطالعہ ہے۔ معروف شاعر، نقاد اور کالم نگار شمیم طارق صاحب کا انٹرویو خاص طور سے متوجہ کرتا ہے۔ محمد انصر صاحب نے سوالات بھی بہت اچھے کیے ہیں اور شمیم طارق صاحب نے ان کے جوابات بھی بہت جامع دیے ہیں۔ انٹرویو پڑھ کر ان کی پوری شخصیت اور فکر سامنے آ جاتی ہے۔ جب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ اس وقت کے شعبۂ اردو کی طرف سے شمیم طارق صاحب ٹیگور پر ایک ایسی کتاب لکھنے کے لیے مدعو کیے گئے تھے جو اردو کے تمام قاری کو ٹیگور سے متعارف کرا دے۔ وہ دو مہینے جامعہ میں رہے، طلبا گھنٹوں ان کے ساتھ رہتے، سوالات پوچھتے اور وہ ہنستے مسکراتے سب کے جوابات دیتے۔ پورا شعبہ ان کی سادگی، خوش مزاجی اور ان کی علمیت کا معترف تھا۔

❖ **حافظ محمد جہانگیر اکرم**: پی جی ٹی اردو (لکچرر)، کے ایم ایم ایس، مانو، دربھنگہ

✍ میں اردو دنیا، بچوں کی دنیا وغیرہ پڑھتی ہوں میں قومی کونسل کے ذریعے چلائے گئے کورس کا امتحان بھی دے رہی ہوں۔ رنگین تصویروں کے ساتھ معیاری مضامین کا انتخاب خوب ہوتا ہے۔ اردو دنیا کے تازہ شمارے میں آپ کا اداریہ، فضیل جعفری، پروفیسر عتیق اللہ کا مضمون، شمیم طارق سے لیا گیا انٹرویو، پریم چند کے افسانوں میں قومی یکجہتی، پروفیسر محمد حسن کی پریم چند شناسی کے علاوہ کتابوں پر تبصرے اور اردو گیت کا سفر بہت معلوماتی ہے تبصروں کی ایک الگ دنیا ہے۔ داستان امیر حمزہ کی مختلف اشاعتیں اور خواجہ احمد عباس سے متعلق تحریریں کافی معیاری ہیں۔

❖ **استوتی اگروال**: اگروال جولیرس، سروج، ایم پی

✍ 'اردو دنیا' ہر ماہ ایک نئی دنیا کے ساتھ آتا ہے اور ہر قاری کے دل میں اپنی جگہ بنالیتا ہے۔ اس رسالہ کا قاری بے صبری سے انتظار کرتا ہے۔ ایسے ہی میں ہر ماہ آپ کے دونوں رسائل 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' کا انتظار کرتا ہوں۔ مجھے گزشتہ ماہ مئی 2018 کا رسالہ موصول ہوا جس میں پانچویں عالمی اردو کانفرنس کی روداد بیان کی گئی ہے جس سے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ تمام مضامین قابل تعریف ہیں۔ 'نیا آسمان نئے ستارے' سچ مچ نئے ستاروں کا کام انجام دے رہا ہے۔

❖ **سہیل الدین خلیل الدین صدیقی**: مراٹھواڑہ یونیورسٹی، دکن

✍ جون 'اردو دنیا' جولائی 2018 میں حاصل ہوسکا۔ زیرِ نظر شمارے میں کشن گنج کتاب میلہ کی چہل پہل نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر توقیر راہی نہایت لائق و فائق مصنف ہیں۔ انھوں نے بڑی تندہی سے اس کی روداد قلمبند کی ہے کہ دلچسپی اوّل تا آخر قائم رہتی ہے۔

دیگر مشمولات میں غالب کی ایک اردو غزل (ص 42) غنیمت ہے۔ اس میں کاغذی پیرہن کی وضاحت اکتاہٹ کا باعث ہے کیونکہ یہ صراحت متعدد بار دہرائی گئی ہے۔ اس شمارے کا بہترین مضمون 'اردو مشینی ترجمہ.....' (ص 67) ہے مگر مضمون سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ابھی اس میدان میں جدوجہد جاری ہے اور یہ کہ ہندوستان میں بھی اس پروجیکٹ میں نہ صرف دلچسپی بلکہ عملی پیش رفت بھی برقرار ہے۔ ص 70 پر مضمون بعنوان 'جھوٹ کی تفتیش' ایک اچھی کوشش ہے لیکن عدلیہ میں ابھی یہ اپنا مقام مستحکم نہ کر پائی۔ البتہ سائنس، نفسیات و جرمیات میں اس پر تحقیق و تنقید کی گنجائش ہے۔ کمپیوٹر کے ذیل میں نوٹ پیڈ (ص 72) پر بہت ہی عمدہ اور دلچسپ مضمون دیا گیا ہے۔ اس کی تفصیلات پڑھنے کے قابل ہیں۔

❖ **مصطفی ندیم خاں غوری**: زرّین ولا، اورنگ آباد، مہاراشٹر

✍ ماہ جولائی کا اردو دنیا ملا۔ آپ کے اداریے کو پڑھ کر ایک بار پھر یہ بات واضح ہوگئی کہ تنقید برائے تنقید نہیں بلکہ تنقید برائے تعمیر ہونی چاہیے۔ ہمیشہ کی طرح رسالہ معلوماتی اور جاندار ہے۔ خاص طور پر شمیم طارق صاحب کا انٹرویو بڑا اچھوتا تھا۔ انصر صاحب کے منفرد سوالات اور شمیم طارق کے بیباکانہ جوابات۔ شمیم صاحب کا انداز بیان ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا''۔

❖ **عظیم تسنیم**: پونے

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' سے چند موضوعات پڑھ چکا ہوں۔ چاہا کہ اختصار کے ساتھ لکھوں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مواد کچھ طویل ہو چکا ہے۔ محترم م ق سلیم (صدر شعبۂ اردو، شاداں کالج، حیدرآباد) نے اپنے مراسلے میں بہترین رسائل کے نام تحریر کیے ہیں۔ (1) اردو دنیا (2) فکر و تحقیق (3) خواتین دنیا (4) بچوں کی دنیا (5) ایوانِ اردو (6) آجکل (7) سائنس (8) سائنس کی دنیا ٹھیک ہے۔ میرے خیال کے مطابق اِس فہرست میں ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ کا نام چھوٹ گیا ہے۔

محترم رفیق ابراہیم پرکار کا یہ جملہ بالکل سچ ہے ''اردو دنیا' کا ہر شمارہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔''

محترم حقانی القاسمی کے ذریعے پیش کی گئی روداد اردو زبان و ثقافت اور موجودہ عالمی مسائل اس عنوان پر پیش کردہ روداد میں تصاویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھارت کے علاوہ سات ممالک کے 16 مندوبین ہیں۔ زبانِ اردو اور محبانِ اردو کے لیے نہایت پرمسرت خبر ہے۔

علامہ سیماب اکبرآبادی پر تحریر کردہ، محترم مقیم احمد کے مقالے سے معلومات میں اضافہ ہوا۔ 'دستورِ اصلاح' فن سخنوری اور اس فن میں، استاد، شاگرد کے مابین رشتہ قائم کرکے اس رشتے کو استوار رکھنے کے لیے کارآمد تصنیف ہے۔

چند مثبت نکات غور طلب ہیں:

(1) سنجیدہ اور ذمے دار اساتذہ اور شعر و ادب کے باشعور طالب علموں نے اِس کتاب کو خوب سراہا اور سیماب اکبرآبادی کی علمی حیثیت بہت بلند ہوگئی۔

(2) یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاعری الہام نہیں بلکہ الہامی کیفیت کی حامی ہوتی ہے۔

(3) دہلی اور لکھنؤ میں مرکزیت قائم ہونے کے بعد اکبرآباد (آگرہ) کی حیثیت ایک ثالث کی سی رہی۔

بذریعہ، مقالہ نگار مقیم احمد مشاعروں میں ترنم میں اشعار پڑھنے سے متعلق، سیماب اکبرآبادی کا جواب نقل کیا ہے۔ ترنم سے کلام سنانے کو مشاعرے کے زوال کا سبب بتایا ہے۔ یہ ایک نظریہ ہے۔

دوسرا نظریہ سماعت فرمائیں'' (کلیاتِ اقبال مطبوعہ دعوت آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی 6 (ستمبر 1999) اس کلیات کی پرنٹنگ میں جہاں سے شاعری شروع ہے وہاں سے صفحہ نمبر کا آغاز ہے۔ اوّلین صفحات میں، پیش لفظ اور دیباچہ، پر صفحہ نمبر نہیں ہیں۔ اپنی سہولت کے لیے بغیر نمبر والے صفحات کو ٹائٹل سے لے کر پیش لفظ کی آخری سطر تک نمبر دیا ہوں۔ (1 تا 16 اِس لحاظ سے بطور دلیل صفحہ 12 اور صفحہ 13 کے چند الفاظ نقل کرتا ہوں۔ از شیخ عبدالقادر بیرسٹر: سابق مدیر مخزن)

(1) اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔

(2) اوّل اوّل جو نظمیں جلسۂ عام میں پڑھی جاتی تھیں۔ تحت اللفظ پڑھی جاتی تھیں اور اس طرز میں بھی ایک لطف تھا۔ مگر بعض دوستوں نے ایک مرتبہ جلسۂ عام میں شیخ محمد سے یہ اصرار کیا کہ وہ نظم ترنم سے پڑھیں۔ ان کی آواز قدرتاً بلند اور خوش آئند ہے۔ طرزِ ترنم سے بھی خاصے واقف ہیں۔ ایسا سماں بندھا کہ سکوت کا عالم چھا گیا اور لوگ جھومنے لگے۔ اس کے دو نتیجے ہوئے۔ ایک تو یہ ان کے لیے تحت اللفظ پڑھنا مشکل ہوگیا۔ جب کبھی پڑھیں لوگ اصرار کرتے ہیں کہ لے سے پڑھا جائے اور دوسرا یہ کہ پہلے تو خواص ہی ان کے کلام کے قدردان تھے اور اس کو سمجھ سکتے تھے۔ اس کشش کے بعد عوام بھی کھنچ آئے۔

❖ **اشفاق کلرنجوی**: جی این آزاد اردو ہائی اسکول و جونیر کالج، مہاراشٹر

✍ مسلسل 15 سال سے اردو دنیا زیر مطالعہ ہے۔ ہر شمارہ اپنے آپ میں ایک دستاویز ہے۔ معیار بلند ہے اور لکھنے والے بہت جانفشانی اور محنت سے مضمون تحریر کرتے ہیں۔ تبصرہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سے مضمون کو ترجیح دی جائے۔ انٹرویو خاصا اچھا ہوتا ہے۔ تفصیل سے ان کی شخصیت اور کام کے متعلق جانکاری ہوتی ہے۔ طباعت اور گیٹ اَپ کا کیا کہنا۔ آپ کی کاوش نہایت عمدہ ہے۔ اردو سے متعلق آپ کی خبر ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔ ہماری بات میں آپ کے تاثرات اور طرزِ تحریر کا کوئی جواب نہیں۔ آپ کی بات میں جو خطوط شائع ہوتے ہیں وہ بھی بہت اہم ہیں۔ ادارہ اردو دنیا غیر جانب داری سے اپنے کام انجام دے رہا ہے۔ کتابوں کا میلہ لوگوں کو بیدار کرنے اور کتابوں کی جانب راغب کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

❖ **ڈاکٹر ایس ڈی خان**: سابق آیوروید آفیسر، رائے پور (چھتیس گڑھ)

■

'اردو دنیا' جولائی 2018 کے شمارے میں 'پریم چند کے افسانوں میں قومی یکجہتی' کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے وہ میرے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ جبکہ یہ مضمون بلال احمد شاہ کا ہے۔ میں اپنی غلطی پر بہت نادم ہوں۔ تکنیکی غلطی کی وجہ سے ایسا ہوگیا۔ آئندہ میں احتیاط برتوں گا۔

امتیاز احمد خواجہ

(کپوارہ، جموں و کشمیر)

* کسی دوسرے کا مضمون اپنے نام سے بھیجنا اور شائع کرانا اخلاقی جرم ہے۔ اس طرح کی غلطی سے پرہیز کیا جانا چاہیے۔ اس سے قلم کاروں کی معتبریت مشکوک ہوتی ہے اور ادارے کا بھی وقار مجروح ہوتا ہے۔

مشتاق کریمی

قاری ہی تخلیق کا سب سے بڑا نقاد ہوتا ہے

قاضی مشتاق احمد

ریاست مہاراشٹر کا علاقہ خاندیش تین اضلاع جلگاؤں، دھولیہ اور نندوربار پر مشتمل ہے۔جلگائوں کو مشرقی خاندیش بھی کہا جاتا ہے۔یہ علاقہ شدت کی گرمی، کیلوں کی کاشت، دالوں کی پالش، بھساول سے قربت اور خالص سونے کے کاروبار کے لیے مشہور ہے۔اس ضلع میں سرکاری اور نجی اردو مدارس کی تعداد کم وبیش 500ہے۔معروف ادیب قاضی مشتاق احمدکے بال وپر اسی سنگلاخ کہی جانے والی زمین پر نکھرے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب جدیدیت کی آندھی چلی تھی۔اس آندھی نے افسانہ کے لاکھوں قارئین کو افسانہ سے دور کردیا تھا کہ افسانہ سے کہانی پن غائب ہوگیا تھا۔قاضی مشتاق احمد اور اس قبیل کے دیگر فنکاروں نے افسانہ سے روٹھے ہوئے قارئین کو منانے میں اہم کردار ادا کیاجس سے انکار ممکن نہیں۔

مشتاق کریمی: سب سے پہلے آپ اپنا مختصر تعارف بیان کرنے کی زحمت گوارہ کیجیے۔

قاضی مشتاق احمد : ناچیز کا مکمل نام قاضی مشتاق احمد اور والد مرحوم کا قاضی میر چاہت علی ہے۔ صوبۂ مہاراشٹر کا گرم شہر جلگاؤں میں جوبطور خاص کیلے کی کاشت کے لیے ملک بھر میں مشہور ہے، میں میری ولادت 20مارچ 1940 کو ہوئی۔ابتدائی تعلیم میونسپل اردو اسکول نمبر 10 میں حاصل کی جبکہ سیکنڈری ایجوکیشن اینگلو اردو ہائی اسکول جلگاؤں سے مکمل کرنے کے بعد معاشیات اور سیاسیات سے گریجویشن کی ڈگری پونے یونیورسٹی سے حاصل کی۔خواہش تو تھی کہ قانون کی تعلیم حاصل کروں۔اس کے لیے ممبئی کا رخ بھی کیا۔اس زمانے میں مہاراشٹر پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں مسلم بچے خال خال ہی شریک ہوتے تھے۔میں نے بھی قسمت آزمائی کی اور پہلی ہی کوشش میں کامیابی حاصل کر کے تحصیلدار بن گیا۔پھر ترقیات کی منازل طے ہوتی گئیں۔ ڈپٹی کلکٹر،ایڈیشنل کلکٹر اور پھر کمشنر کی ذمے داریاں ادا کیں۔ 20برس قبل یعنی 31مارچ 1998 کو اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوا۔

م ک : اپنے خاندانی پس منظر کے متعلق مختصراً کچھ بتائیں۔

قاضی مشتاق احمد : ہمارا خاندان 1160ھ کے بعد گجرات سے مہاراشٹر منتقل ہوا اور ضلع جلگاؤں کے ایک شہر ارنڈول میں سکونت اختیار کی۔ہمارا سلسلہ نسب حضرت شاہ وجیہہ الدین گجراتی سے ملتا ہے۔ میرے پر دادا قاضی سید مرتضٰی عرف بچّو میاں نے دستی قرآن شریف بھی لکھا تھا اور قرآنی آیتوں کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا۔

م ک : آپ نے اپنا تخلیقی سفر کب اور کن حالات میں شروع کیا؟

قاضی مشتاق احمد : 1957 میں اینگلو اردو ہائی اسکول، جلگاؤں مہاراشٹر کے دستی رسالہ 'شگوفہ' سے تخلیقی سفر کا آغاز ہوا۔اس زمانے میں شعروشاعری کی فضا بنی ہوئی تھی۔نثر نگار انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔یہ وہی زمانہ تھا جب فیروز ہاشمی کہکشاں نامی ادبی رسالہ اطہر جلگانوی کی زیر نگرانی نکالا کرتے تھے۔ مجھے اپنے ارد گرد ادبی ماحول میسر تھا۔میری پھوپھیاں ممتاز بیگم اور اعجاز بیگم کہانیاں اور مضامین لکھا کرتی تھیں۔انھیں بے شمار نظمیں یاد تھیں۔اعجاز بیگم نے اس زمانے میں خواتین کے لیے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔

م ک : پہلی تخلیق؟ پہلا اخبار جس میں تخلیق شائع ہوئی اوراسی طرح پہلا رسالہ؟

قاضی مشتاق احمد : پہلی تخلیق ساتویں جماعت

میں اسکولی نوٹ بک میں 'برسات' کے موضوع پر لکھا ہوا ایک مضمون''، جس پر کلاس ٹیچر سے داد نہیں بلکہ پھٹکار ملی۔ میرے استاد کو میری پہلی تخلیق مضمون کم اور افسانہ زیادہ لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے پھٹکار لگائی لیکن یہ پھٹکار میرے لیے حوصلے کی بہار ثابت ہوئی۔ اسی کی وجہ سے تو میں نے اس وقت یہ محسوس کرلیا تھا کہ میں کوشش کروں تو کہانی لکھ سکتا ہوں۔ اس طرح پہلا اخبار روزنامہ انقلاب کا بچوں کا صفحہ اور پہلا رسالہ معروف ایم جے کالج جلگاؤں کا میگزین 'اجنتا' کا اردو ضمیمہ۔

م ک : آپ کے زیادہ تر افسانے ماہنامہ 'شمع' میں شائع ہوئے جس پر پاپولر لٹریچر کے فروغ کا الزام عائد تھا؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

قاضی مشتاق احمد : ادب میں کوئی درجہ بندی نہیں ہوتی۔ پاپولر، نان پاپولر لٹریچر یہ اصطلاحیں ناکام مصنفین کی ایجاد ہیں۔ شمع میں شائع ہونے کے لیے معیار لازمی شرط تھی۔ افسانوں کا انتخاب بہت چھان پھٹک کے بعد ہوتا تھا۔ اس زمانے میں شمع کا سرکیولیشن زبردست تھا۔ تخلیق کار کی تخلیق ہزاروں ہاتھوں تک پہنچتی تھی۔ یہی وجہ رہی کہ بڑے اور مستند شعرا و افسانہ نگاروں نے بھی شمع میں اپنی تخلیق کی اشاعت کو قابل افتخار ہی جانا۔

م ک : کمرشیل رسائل میں شائع ہونے والی تحریریں 'تحریر بر آب' ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی تحریریں وقت کے بہاؤ میں بہہ جاتی ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟

فکشن میرے خون میں ہے ، صحافت میرا پہلا پیار ہے ،ڈرامہ میرا شوق ہے اوربچوں کا ادب وہ دروازہ ہے جس کے ذریعہ میں ادبی دنیا میں داخل ہوا۔میں جب جس صنف میں کسی موضوع کو اظہار کے لیے ضروری سمجھتا ہوں اس کا استعمال کرتا ہوں۔اس سے طبیعت میں رنگا رنگی آجاتی ہے اور یکسانیت کی پریشانی سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔

قاضی مشتاق احمد : وہ رسالے جو لاکھوں کی پسند ہوں وہ کمرشیل اور سو پچاس کی تعداد میں چھپ کر ردّی فروشوں کی دکانوں کی زینت بڑھائیں وہ معیاری! جناب ذرا یہ بھی تو بتایئے وہ کون سے معیاری 'نان کمرشیل' رسالے ہیں جن میں چھپ کر افسانے لافانی ہوگئے؟ دراصل یہ شوشہ شاید انہی لوگوں نے چھوڑا جنھوں نے کمرشیل رسائل (شمع) میں چھپنے کی بھرپور کوشش کی مگر معیار کی سختی کے سبب جب ناکامی ہاتھ لگی تو 'انگور کھٹے ہیں' کی صدائیں بلند کرنے لگے۔

م ک : ''ترقی پسندی اور جدیدیت کی آندھی نے صنف افسانہ کو خوب نقصان پہنچایا'' کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟

قاضی مشتاق احمد : بالکل... دراصل اس زمانہ میں افسانہ سے کہانی پن، قصہ، پلاٹ غائب ہوگئے تھے۔ افسانے ابہام اور تجریدیت کا شکار ہوگئے تھے۔ جس کے سبب قارئین افسانہ سے روٹھ گئے تھے۔ کچھ اسی طرح کا سوال سلطانہ مہر نے بھی پوچھا تھا کہ جدیدیت نے آرٹ کی لطافت اور حسن کو نکھارا ہے یا بگاڑا ہے۔ میری نظر میں جدیدیت کے نام پر ناکام تجربات ہی ہوئے۔ جانداروں کی بجائے غیر جاندار اشیا کو اہمیت دی جانے لگی جو قطعی فطری نہیں لگا اور قارئین نے افسانہ کا دامن چھوڑ دیا۔

م ک : بطور افسانہ نگار اپنی پہچان بنانے کے بعد آپ ادب کی دیگر اصناف کی جانب متوجہ ہوگئے اس کی کوئی خاص وجہ؟

قاضی مشتاق احمد : اس سوال کا جواب میں کئی بار دے چکا ہوں کہ فکشن میرے خون میں ہے، صحافت میرا پہلا پیار ہے، ڈرامہ میرا شوق ہے اور بچوں کا ادب وہ دروازہ ہے جس کے ذریعہ میں ادبی دنیا میں داخل ہوا۔ میں جب جس صنف میں کسی موضوع کو اظہار کے لیے ضروری سمجھتا ہوں اس کا استعمال کرتا ہوں۔ اس سے طبیعت میں رنگا رنگی آجاتی ہے اور یکسانیت کی پریشانی سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔

م ک : آپ نے اب ڈرامہ نگاری پر توجہ مرکوز کرلی ہے کیا افسانہ نگاری سے اُوب چکے؟

قاضی مشتاق احمد : میں نے ہائی اسکول کے زمانہ سے ڈرامے لکھے اور ہدایت کاری بھی کی۔ پہلا یک بابی ڈرامہ 'ایک اور سُپر اسٹار' جلگاؤں سے ہی شائع ہوا۔ اپنی سرکاری نوکری اور افسانہ نگاری کے بعد ڈرامہ نویسی کے لیے وقت نہیں بچتا تھا۔ اب فرصت کے لمحات میسّر آئے ہیں تو ڈرامے بھی ہو رہے ہیں۔ مگر میں نے اسے کبھی اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ اردو داں طبقہ یہ بخوبی جانتا ہے کہ میرے تحریر کردہ ڈرامے ''آتش کشمیر، مرزا غالب کی حویلی، آزاد کا خواب، بے نام رشتے، آخری مغل، گوہر جان کا شوہر، ہماری پیاری زباں اردو، مہاتما جیوتی با پھلے، علامہ اقبال وغیرہ نے مجیب خان کی ہدایت کاری میں اسٹیج پر کامیابی کے ریکارڈ توڑ دیے۔ رہا سوال افسانہ نگاری سے اُوبنے کا تو میں یہ کہہ دوں کہ افسانے اب بھی ہو رہے ہیں۔

م ک : آپ کے ناقدین یہ راگ الاپتے ہیں کہ موجودہ اردو افسانے کے تقاضے آپ سے پورے نہیں ہو رہے ہیں؟

قاضی مشتاق احمد : ہر زمانے میں افسانے کی ہیئت بدلی ہے، اس کے تقاضے تبدیل ہوئے ہیں۔ ہر تبدیلی کو ہر شخص قبول کرلے یہ ضروری بھی نہیں ہے۔ پھر کسی کی چال کو دیکھ کر اپنی چال بدلنا نقل ہی کہلائے گا۔ جو میری عقل کو منظور نہیں ہے۔ ہاں... اصلاح اگر ضروری ہے تو کرنا چاہیے۔ سریندر پرکاش صاحب نے سب سے

قاضی مشتاق احمد ماہ وسال کے آئینے میں

نام و قلمی نام: قاضی مشتاق احمد
ولدیت : قاضی میر چاہت علی
آمد :20 مارچ 1940
جائے پیدائش :جلگاؤں (مہاراشٹر)
پیشہ :ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈائریکٹر سوشل ویلفیئر (ایڈیشنل کلکٹر سلیکشن گریڈ)

اردو کہانیوں کے مجموعے : (1) صحبت کی خوشبو، (2) وفا کے رنگ، (3) درد کی زبان، (4) لکشمن ریکھا کے پار، (5) خواب بھی بکتے ہیں، (6) تتلیاں آزاد ہیں، (7) قطرہ قطرہ: افسانچوں کا مجموعہ

اردو ناول: (1) ایک دل ارمان بھرا، (2) فٹ پاتھ کی رانی، (3) شہزادہ، (4) آزادی، (5) سہمی ہوئی بہار، (6) درد کا (7) پیوند فٹ پاتھ چی رانی (مراٹھی) ترجمہ: رشید قاسمی

ادبی وتنقیدی مضامین کے مجموعے: (1) اردو شاعری: میر سے پروین شاکر تک، (2) اردو شاعری: کل آج اور ہمیشہ، (3) اردو نثر: ایک مطالعہ، (4) پونے ہے جس کا نام، (5) خاندیش :تاریخی، تہذیبی، ادبی مطالعہ، (6) اردو مراٹھی کے ادبی وثقافتی رشتے، (7) مضامین نو: جدید ادبی فکر

سفرنامے: (1) جس نے یورپ نہیں دیکھا، (2) آٹھ سفرنامے

ہندی کہانیوں کے مجموعے : (1) ایک ہی راستہ، (2) جل سے بوجھل بدلی (3) کہانی ختم ہوئی

تحریر کردہ ڈرامے: ایک اور سپر اسٹار، آتش کشمیر، مرزا غالب کی حویلی، آزاد کا خواب، بے نام رشتے، گوہر جان کا شوہر، میڈم انارکلی، شہید بھگت سنگھ، مہاتما جیوتی با پھلے، آخری مغل، ہماری پیاری زباں اردو، گرودیو اور مہاتما

پہلے میرے افسانوں میں خود کلامی کی کمی کی طرف توجہ دلائی۔ میں نے سر تسلیم خم کر کے اپنے طرز تحریر میں اصلاح کی۔ محترمہ عصمت چغتائی نے مجھ سے کہا تھا کہ ''افسانہ کا فارمیٹ ہمارے بزرگوں کا بُنا ہوا ہے اس میں توڑ پھوڑ کی گنجائش نہیں۔'' فورڈ کمپنی کے مالک فورڈ نے کہا تھا ''میری پہچان اس وجہ سے بنی کہ میں نے اپنی کار کا ماڈل اور اپنی اہلیہ کو کبھی تبدیل نہیں کیا۔ اس معاملہ میں، میں معتقد فورڈ ہوں۔

م ک : کیا آپ کے ساتھ نقادوں نے انصاف کیا ہے؟

قاضی مشتاق احمد : میری نظر میں میری تخلیقات کو پڑھنے والے ہی میرے 'سچے نقاد' ہیں۔ میں اگر اچھا لکھتا ہوں تو وہ تعریف کرتے ہیں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو نشاندہی کرتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ ''تنقید کا کام کسی کو مرعوب کرنا یا اس پر سوچ کے دروازے بند کرنا نہیں بلکہ افہام و تفہیم میں مدد دینا اور سوچ کے دروازے کھولنا ہے۔'' تنقید نگار کی یہ اوّلین ذمہ داری ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو اس مقام تک پہنچا دے جہاں سے تخلیق کے اندر کی دوسری تخلیق شروع ہوتی

ہے۔ وہ قاری کو تخلیق کی زیریں لہروں کے ہچکولوں سے بھی واقف کرا دے تو یہ ادب کی بڑی خدمت ہو سکتی ہے مگر ہمارے کچھ نقاد سلجھی ہوئی باتوں کو بھی پہلے خود الجھا دیتے ہیں اور پھر اس الجھن کو سلجھا کر یہ محسوس کرتے ہیں جیسے انھوں نے بڑا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

م ک : فی زمانہ تنقید اب برائے اصلاح نہیں بلکہ برائے ذاتیات ہو کر رہ گئی ہے، آپ کیا سوچتے ہیں؟

قاضی مشتاق احمد : یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ حامیانِ ذوق، مرزا نوشہ (غالب) کو 'پالک مرزا' کہتے تھے۔ کیونکہ ان کا دعویٰ تھا کہ غالب مرزا عبداللہ بیگ کے 'لے پالے' تھے۔ حامیانِ غالب اُستاد ذوق کو 'ناوڑا' (نائی) کہتے تھے۔ اب عصر حاضر میں اگر ذاتیات پر کچھ کہا جا رہا ہے تو کیچڑ اچھالنے والے خود ہی میلے ہو جاتے ہیں۔

م ک : کیا انعام ملنے سے قلمکار کی توقیر میں اضافہ ہوتا ہے؟

قاضی مشتاق احمد : فرانسیسی ادیب ژاں پال سارتر کا قول ہے کہ ''انعام تو فنکار کی تابوت میں ایک کیل گاڑ دیتا ہے۔'' جس وقت اسے نوبل انعام ملنے کا اعلان ہوا وہ ایک ریسٹورنٹ میں اُبلا ہوا آلو کھا رہا تھا۔ اس نے اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''اس وقت تو میری نظر میں اس آلو کی اہمیت زیادہ ہے جو میں کھا رہا ہوں۔'' بعد میں اس نے یہ انعام لینے سے انکار کر دیا۔

م ک : کس فنکار کے افسانوں نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور کس قلمکار کی صلاحیتوں کا آپ اعتراف کرتے ہیں؟

قاضی مشتاق احمد : کرشن چندر کے افسانوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا اور میں جتیندر بلّو کی صلاحیتوں کا معترف ہوں۔ ان کی سوانح ''ہم نے ایسے بسر کی'' پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

م ک : اردو کے فروغ و بقاء کے لیے آپ کے ذہن میں کوئی تجویز ہے؟

قاضی مشتاق احمد : میری تجویز ہے کہ جس طرح ماہر لسانیات گنیش دیوی نے 2010 میں بھارتیہ لوک بھاشا سروے کے ذریعہ 780 زبانوں کا سروے کرایا

میری نظر میں میری تخلیقات کو پڑھنے والے ہی میرے 'سچے نقاد' ہیں۔ میں اگر اچھا لکھتا ہوں تو وہ تعریف کرتے ہیں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو نشاندہی کرتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ ''تنقید کا کام کسی کو مرعوب کرنا یا اس پر سوچ کے دروازے بند کرنا نہیں بلکہ افہام و تفہیم میں مدد دینا اور سوچ کے دروازے کھولنا ہے۔'

جس کے مطابق ملک کی 200 زبانوں پر خطرے کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ پتہ نہیں اس میں اردو شامل ہے یا نہیں مگر ہمیں اعداد و شمار حاصل کر کے اپنی زبان سے دور ہو جانے والوں کو اسے اپنانے کے لیے کوئی ٹھوس منصوبہ بنانا ہوگا۔ اس کے علاوہ غیر اردو داں طبقے کو اردو سے جوڑنے کی کوشش بھی کرنی ہوگی نیز سائنس و ٹکنالوجی کے مضامین اور کتابیں کثرت سے بے نقص منظر عام پر لائی جائیں تو اردو کو فروغ حاصل ہوگا۔

م ک : اردو کے مستقبل کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

قاضی مشتاق احمد : جس طرح ہر انسان کو اپنے گزر بسر و ترقی کے لیے مختلف محاذوں پر لوہا لینا پڑتا ہے بالکل اسی طرح اردو کی ترقی اور اس کے روشن مستقبل کے لیے اس کی اولادوں کو کمر کسنی ہوگی۔ مگر ہمارے یہاں معاملہ دوسرا نظر آتا ہے۔ سب چاہتے ہیں کہ شہید عبدالحمید جیسے جیالے پیدا ہوں مگر کوئی یہ نہیں چاہتا کہ ان کے گھر میں ہوں۔ اردو اخبارات و رسائل کی خریداری کا معاملہ ہی لے لیجیے اردو والے خرید کر پڑھنے کو شاید اپنی توہین سمجھتے ہیں جبکہ دیگر زبانوں کے شیدائی تنگدستی کی حالت میں بھی اپنے اخبارات و رسائل کے لیے کچھ نہ کچھ بجٹ ضرور رکھتے ہیں۔ یہ صورت بدلنی چاہیے۔

م ک : اچھا قاضی صاحب اس طویل گفتگو کے لیے شکر گزار ہوں۔

قاضی مشتاق احمد : شکریہ آپ کا بھی کہ اس لائق سمجھا۔

■

Mushtaque Karimi
342, Shani Peth,
Jalgaon-425001 (MS)
Mob. 9028222348
Qazi Mushtaque Ahemad
B/6, Ray-Venue Society,
Pune - 411007
Mob. 9422317129

ثانوی درجات کی درسی کتب کا جائزہ
(تلنگانہ بورڈ کے حوالے سے)

رضوانہ بیگم

موجودہ دور کی مادہ پرستی، الکٹرانک ساز وسامان اور لامحدود خواہشات نے سماج کے ہر فرد کو ایسی بھاگ دوڑ میں مبتلا کر دیا ہے کہ اس کے پاس سوچنے اور غور کرنے کا وقت ہی نہیں بچا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ ترقی کی سمت اور منتہا کیا ہے؟ تگ و دو کی یہ منزل کہاں ہے؟ نسل نو کا مستقبل کیا ہے؟ مشترکہ خاندان کا تصور بھی قصہ پارینہ ہو چکا ہے۔ ہر فرد آزاد ہے اور اپنے عمل کے نتائج کا ذمے دار خود ہے۔ ایسے حالات میں نو عمر بچوں کی تربیت اور شخصیت سازی ایک چیلنج کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس چیلنج کو قبول کرنے کی ذمے داری خاندان کے ساتھ ساتھ اسکول کی بھی ہے۔ عہد قدیم میں تو خاندان کے شانہ بہ شانہ اسکول اس ذمے داری کو نبھاتا تھا۔ اسکول کا پورا تعلیمی نظام اخلاقی اقدار کو پیش نظر رکھ کر ہی تیار کیا جاتا تھا۔ تعاون، ہم آہنگی اور امن پسندی جیسے اوصاف کو علاحدہ طور پر نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اب صورت حال مختلف ہے۔ گذشتہ چند سالوں سے اب باقاعدہ طور پر مہارت حیات کے نام سے اسکول کے نصاب میں کچھ ایسی مہارتیں شامل کی گئیں ہیں جو طلبا میں مثبت رویوں کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہوں اور روزمرہ کی زندگی میں درپیش مسائل کو حل کرنے کے قابل بنا سکیں۔ ان مہارتوں میں جذبات پر قابو، باہمی رشتوں کی فہم، آپسی ہم آہنگی، تعاون کو Co-scholastic abilites کی تربیت کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سماجی علوم کے نصاب میں بھی مہارت حیات سے متعلق مختلف صلاحیتوں کو کسی نہ کسی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اسکول کے درس و تدریس کے عمل میں زبان کی اہمیت مرکزی ہے اسی لیے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اسکول کی ساری تعلیم زبان کی تعلیم ہے۔ یوں تو زبان کا اپنا کوئی موضوع نہیں ہے لیکن عرش تا فرش جو موضوعات ہیں وہ زبان کے موضوعات ہیں۔ زبان خیالات کا پیکر ہے، فکر کی تجسیم کرتی ہے، معلومات کا آلہ کار ہے۔ اس لیے طلبا کی ذہن سازی، جذباتی تربیت اور شخصیت کی تعمیر میں زبان کی تعلیم کا رول اہم ہے لہٰذا اسکول کی کسی بھی سطح کا نظام زبان کی درسی کتاب کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔

میرے موضوع کا تعلق اردو زبان سے ہے۔ اردو زبان اپنے آغاز سے تا حال ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ یہ کسی خاص علاقے یا ملک تک محدود نہیں ہے۔ اس کا اپنا ایک تہذیبی ورثہ ہے۔ اس کی شیرینی اس کی شناخت ہے۔

ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان میں بھی تعلیم کی الگ الگ سطحوں کے لیے درسی کتب تیار کی جاتی ہیں۔ یہ درسی کتب ہر سطح کے تدریسی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ہی تیار کی جاتی ہیں۔ اسکول کے تعلیمی نظام کے یہ تین مدارج یعنی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی در اصل بچوں کی تعلیم اور شخصیت سازی کا ایک تسلسل سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن بچوں کی شخصیت کی نشو ونما کے مختلف مدارج کے مطابق ان میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ان کی دلچسپیاں، رویے، رجحانات، سب بدلتے رہتے ہیں جس سے آموزش کا عمل متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے تعلیم کی ہر سطح کے اپنے علیحدہ اغراض ومقاصد ہیں اور ان اغراض ومقاصد کے

ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان میں بھی تعلیم کی الگ الگ سطحوں کے لیے درسی کتب تیار کی جاتی ھیں۔ یہ درسی کتب ہر سطح کے تدریسی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ھی تیار کی جاتی ھیں۔ اسکول کے تعلیمی نظام کے یہ تین مدارج یعنی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی در اصل بچوں کی تعلیم اور شخصیت سازی کا ایک تسلسل سمجھے جاتے ھیں۔ لیکن بچوں کی شخصیت کی نشو ونما کے مختلف مدارج کے مطابق ان میں تبدیلیاں رونما ھوتی ھیں۔ ان کی دلچسپیاں، رویے، رجحانات، سب بدلتے رھتے ھیں جس سے آموزش کا عمل متاثر ھوتا ھے۔ اس لیے تعلیم کی ھر سطح کے اپنے علیحدہ اغراض و مقاصد ھیں اور ان اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے درسی کتب کے متون کا انتخاب کیا جاتا ھے۔

حصول کے لیے درسی کتب کے متون کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

اسکول کی زندگی میں ثانوی سطح (نہم اور دہم) کی تعلیم طلبا کی زندگی کا بہت نازک اور اہم دور ہے۔ اس دور کے بیشتر بچوں میں ایسی جسمانی، جذباتی، ذہنی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں جسے وہ سمجھ نہیں پاتے اور ان تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہونے میں دشواریاں محسوس کرتے ہیں، جس سے ان کی پوری شخصیت متاثر ہوتی ہے۔ ان کے برتاؤ میں بھی واضح طور پر تبدیلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ لہٰذا ثانوی سطح کی درسی کتب کے لیے موضوعات کا تعین اور متون کا انتخاب ان حقائق کو مدنظر رکھ کر ہی کیا جاتا ہے۔

اس ضروری پس منظر کے بعد میں تلنگانہ بورڈ کے ثانوی درجات کی درسی کتب کے حوالے سے بات کروں گی۔ تلنگانہ ایک ایسا صوبہ ہے جہاں پر بیشتر سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سارے اسکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے بھی رائج ہے۔ یہاں میرا موضوع محدود ہے۔ تلنگانہ بورڈ کے ثانوی درجات کی درسی کتب کا جائزہ۔ ان درسی کتب کے نام ہیں: نوائے اردو۔ اول اور نوائے اردو۔ دوئم جو بتدریج جماعت نہم اور دہم کے لیے تجویز شدہ ہیں۔ اس کی اشاعت حکومت تلنگانہ حیدرآباد نے کی ہے۔ یہ کتابیں سال رواں یعنی 2018-19 کے لیے تیار کی گئی ہیں۔ نہم اور دہم دونوں کتابوں میں شامل مضامین اور نظموں کی تعداد 28 ہے۔

اپنے مضمون کو طوالت سے بچانے کے لیے میں نے دونوں کتابوں سے صرف حصہ نظم کو ہی تجزیہ کے لیے منتخب کیا ہے۔ دونوں جماعتوں میں شعری اسباق کی تعداد مجموعی طور پر 14 ہے۔

نظم کے لغوی معنی ترتیب اور آراستگی ہے۔ یہ اردو زبان کی خوش بختی ہے کہ اس نے شعر وشاعری کے لیے 'نظم' کا لفظ اختیار کیا۔ اور یہی نظم کی ترتیب اور آراستگی کلام میں حسن پیدا کرتی ہے۔ حسین شے دیکھ کر کس کو خوشی نہیں ملتی؟ کس کو سکون حاصل نہیں ہوتا؟ اس طرح نظم کی تشکیلی ساخت، اس کی ہیئت ہی سکون کا باعث ہوتی ہے۔ ایک روتے ہوئے نوزائیدہ بچے کو یہ ترتیب اور آراستگی خاموش کردیتی ہے۔ ماں کی آواز میں غنائیت اور نغمگی کا عنصر خواہ ہوں یا نہ ہوں لیکن ترتیب اور آراستگی سے کہے ہوئے الفاظ خواہ کسی بھی زبان میں ہوں بچے کو پرسکون کردیتے ہیں۔ یہ موزوں کلام کی خصوصیت ہے جو اردو میں نظم کے نام سے جانی جاتی ہے۔ نظم کے بھی الگ الگ پیرایہ اظہار ہیں جو نظم کے علاوہ غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، گیت اور رباعی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ تلنگانہ کی نہم درجہ کی درسی کتاب میں درج ذیل شعری اسباق شامل ہیں:

کب تک میرے مولیٰ (شاذ تمکنت)، اے ابر رواں (اختر شیرانی)، مرغ اور صیاد (پنڈت دیا شنکر نسیم)، غزل (پروین شاکر)، جب کربلا میں عترت اطہار لٹ گئی (مرزا سلامت علی دبیر)، شام رنگین (حفیظ جالندھری) اور شیشہ کا آدمی (اختر الایمان) اس کے علاوہ دعا اور ترانہ ہندی (علامہ اقبال) کو دونوں جماعتوں کی کتب میں فہرست مضامین سے پہلے کے ہی صفحات میں جگہ دی گئی ہے۔

درجہ دہم کی درسی کتاب کے لیے درج ذیل شعری اصناف منتخب کیے گئے ہیں۔ نعت (خواجہ الطاف حسین حالی)، قصیدہ (ذوق)، البیلی صبح (جوش ملیح آبادی)، غزل (غالب)، عورت (کیفی اعظمی)، غزل (مغنی تبسم)، خون کا رنگ (بکل اتساہی) ان مذکورہ شعری کلام کو ضمیمہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

تجزیہ کے لیے دو زاویے مختص کیے گئے ہیں۔ اول متون کا انتخاب، دوئم پیرایۂ اظہار اور الفاظ کا استعمال۔ ان دونوں زاویوں سے درسی کتب کے شعری کلام میں امن کی ترغیب کی نشاندہی مقصود ہے۔

امن ایک وسیع معنوں کا لفظ ہے، جس کا حصول تعاون، تحمل، ہم آہنگی، جیسے مثبت عوامل سے کیا جاسکتا ہے۔ امن شور وغل کا متضاد نہیں بلکہ امن ایک اندرونی ذہنی کیفیت ہے جو محسوس کی جاتی ہے اور اس احساس سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ یہ سکون افراد کی ذہنی اور جذباتی صحت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ کوئی ایک عمل، ایک لفظ، صرف ایک لفظ اس سکون کو پامال کرسکتا ہے۔

درسی کتب میں مضامین کی فہرست سے پہلے اقبال کی دو نظمیں شامل کی گئی ہیں، دعا اور ترانہ ہندی۔ یہ دونوں نظمیں اکثر اسکولوں میں صبح کے ترانہ کے طور پر گائی جاتی ہیں اور زیادہ تر اساتذہ اور طلبا کو یاد بھی ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں بھی انھیں شامل کیا جاتا ہے۔ بہت خوبصورت اور مترنم آوازوں میں ان نظموں کے ویڈیو کیسیٹس بھی دستیاب ہیں۔ غرضیکہ بچے ان نظموں سے بہت مانوس ہیں۔ درسی کتب کھولتے ہی ان نظموں کو دیکھ کر طلبا کو اپنی کتاب دلچسپ اور آسان لگتی ہے اور یہیں سے ان کے سکون اور تشفی کی منزل شروع ہوتی ہے۔ دونوں نظمیں بہت آسان بحروں میں ہیں، زبان بھی عام فہم ہے۔ بغیر ترنم کے بھی اگر پڑھی جائیں تو لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ جہاں تک نفس مضمون کا سوال ہے، ان دونوں نظموں کا انتخاب خصوصی طور پر موضوع کی وجہ سے ہی کیا گیا ہے۔ ایک مثالی طالب علم، مثالی شہری اور مثالی انسان کیسا ہونا چاہیے، اس کے لیے شاعر بچے کی طرف سے دعا کررہا ہے، دوسروں کے لیے رحم، ہمدردی اور تعاون کے جذبہ کے پیدا ہونے کی تمنا کررہا ہے۔ اقبال کی دوسری نظم ترانہ ہندی کا موضوع حب الوطنی اور مذہبی رواداری ہے۔ ثانوی سطح کے طلبا میں ان جذبات کی پرورش بے حد ضروری ہے۔ وطن اور ہم وطنوں سے محبت ان میں ہمیشہ مثبت جذبات ہی پیدا کریں گے۔

اس کے علاوہ درجہ نہم کی درسی کتاب کی فہرست میں کل سات شعری اسباق ہیں جس میں چار نظمیں، ایک مرثیہ، ایک غزل اور ایک مثنوی شامل ہے۔ ان شعری اسباق کا انتخاب مختلف موضوعات اور پیرایہ اظہار کو دھیان میں رکھ کر کیا گیا ہے تاکہ طلبا موضوعات کے ساتھ ساتھ اصناف سے بھی روشناس ہوسکیں۔ پہلی نظم مناجات کی شکل میں ہے، دوسری نظم حب الوطنی کے جذبات کی

ترجمانی کرتی ہے، تیسری نظم کا تعلق مناظر قدرت سے ہے اور چوتھی نظم کا موضوع سماجی اقدار ہے۔ جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے ایک غزل بھی شامل ہے۔ واقعہ کربلا سے متعلق ایک مرثیہ اور پرندے کی دانائی کے موضوع پر ایک مثنوی بھی شامل ہے۔

سب سے پہلے نظم 'کب تک مرے مولا' شاذ تمکنت کی ہے۔ اس نظم کا موضوع اور پیرایہ اظہار قاری میں رقتِ قلب اور ترحم پیدا کرتا ہے۔ نظم میں 'کب تک مرے مولا' فقرے کی تکرار، صبر و تحمل کی انتہا ظاہر کرتی ہے۔

دوسری نظم اختر شیرانی کی 'اے ابر رواں' ہے جو بے حد خوبصورت ہے اور غنائیت سے بھرپور ہے۔ بہ ظاہر یہ نظم ایک غریب الوطن کی اپنے وطن کے لیے بے چینی اور تڑپ کا اظہار کرتی ہے۔ شاعر وطن کی خوبصورتی اور عظمت کا اظہار جس بے ساختگی اور درد کے ساتھ کرتا ہے، وہ قابل تعریف اور تقلید ہے لیکن دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ وطن سے دور جاکر اپنے وطن کی خوبیوں کا احساس زیادہ ہو رہا ہے۔ اس سے یہ زاویہ بھی سامنے آسکتا ہے کہ افراد خوب سے خوب تر کی تلاش میں اپنا 'خوب' بھی کہیں کھو دیتے ہیں اور تازندگی محرومی کا شکار رہتے ہیں۔ اگر اسی کو ہم اپنا شعار بنالیں تو پھر تو 'جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں' کے مصداق ہو کر رہ جائیں گے۔ مستقبل کی بہتر اور عیش و عشرت کی زندگی کی خواہش اور کوشش میں اپنے حال کو بھی تکلیف دہ بنادینے میں احساس محرومی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا اور احساس محرومی مثبت شخصیت کی تعمیر میں منفی رول ادا کرتا ہے۔ اس طرح یہ نظم حب الوطنی کے جذبے کے فروغ کے ساتھ ساتھ احساس محرومی کی اذیت کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

درجہ نہم کی اس درسی کتاب کی تیسری مجوزہ نظم حفیظ جالندھری کی 'شام رنگین' ہے جس کا موضوع اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ یہ نظم طلبا میں تحسین کا مادہ پیدا کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''اگر طلوع آفتاب کا منظر حسین ہے تو غروب آفتاب کا نظارہ بھی خوبصورت ہے''۔ شام کی کیفیت کی منظر کشی اسی قول کی تصدیق کرتی ہے اور حسن کو دیکھنے سمجھنے اور اس سے محظوظ ہونے کی نظر پیدا کرتی ہے۔ کسی بھی کیفیت یا شے سے اگر لطف حاصل ہوتا ہے تو بڑے خوش کن جذبات پیدا ہوتے ہیں جو افراد کو پرسکون رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ شام کی کیفیت کی منظر کشی اور خوب صورت تشبیہات کے علاوہ اس نظم کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ یہ شام کا وقت محنت کشوں کے لیے بڑی نعمت ہے وہ پورے دن کی سخت محنت کے بعد گھر لوٹتے ہوئے آرام کے تصور سے ہی خوش ہیں اور گاتے گنگناتے لوٹ رہے ہیں۔ یہ منظر سماج کے اس محنت کش طبقے کے لیے نرم گوشہ تو ضرور پیدا کرتا ہے۔

کتاب کی چوتھی نظم 'شیشہ کا آدمی' اختر الایمان کی ہے۔ اس نظم میں جدید دور کے افراد کی مفاد پرستی، خود پرستی، بے حسی اور سماج سے لاتعلقی کو طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ آج کا مادہ پرست انسان اپنے خول سے باہر نہیں نکلنا چاہتا، وہ ڈرتا ہے کہ کہیں دوسروں کی پریشانیوں کا سامنا نہ ہو جائے اور ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھانا نہ پڑ جائے۔ اسی جذبہ کو شاعر طنزیہ انداز میں اس طرح بیان کرتا ہے۔

زباں سے کلمۂ حق راست کچھ کہا جاتا
ضمیر جاگتا اور اپنا امتحاں ہوتا

شاعر اس طنز کے ذریعہ تعاون اور ہمدردی کی ترغیب کرتا ہے اور کچھ اس طرح کا پیغام دینا چاہتا ہے۔

ہیں لوگ جہاں میں وہی اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

غزل کو شاعری کی ایک صنف کی حیثیت سے درجہ نہم میں متعارف کرایا گیا ہے، جس کے لیے پروین شاکر کی ایک مشہور اور خوب صورت غزل کا انتخاب کیا گیا ہے جو بے حد مناسب ہے۔ غزل کو شامل کرنے کا مقصد اگر ایک طرف جمالیاتی ذوق کی تسکین اور تربیت ہے تو دوسری طرف شاعری کی ایک منفرد ہیئت سے بھی روشناس کرانا ہے۔ غزل کا آہنگ، اس کی علامتی زبان، پیکر تراشی، تشبیہات اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کی صفت بذات خود لطف اندوزی کا جواز پیدا کرتی ہے۔ مجموعی طور پہ یہ سارے عناصر اس عمر کے طلبا میں جستجو پیدا کرتے ہیں اور کسی حد تک تشفی بھی دیتے ہیں۔ موضوعات کے تعلق سے اگر بات کی جائے تو اس غزل میں ایک ماحولیاتی وحدت دکھائی دیتی ہے اور ریزہ خیالی کا احساس کم ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس غزل کو پڑھنے کے بعد طلبا پر ایک مجموعی تاثر مرتسم ہوگا......

نہم جماعت کی درسی کتاب میں صنف مثنوی کو بھی متعارف کرایا گیا ہے، جس کے لیے پنڈت دیا شنکر نسیم کی مشہور مثنوی ''گلزار نسیم'' کا ایک حصہ منتخب کیا گیا ہے۔ یہ بہت دلچسپ نظم ہے جو مکالماتی انداز میں لکھی گئی ہے۔ یہ ایک صیاد اور طائر کا منظوم قصہ ہے اور اس عمر کے بچے قصہ سننا اور پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ صیاد نے طائر کو قید کر رکھا ہے۔ طائر کچھ ایسی فلسفیانہ باتیں کرتا ہے کہ صیاد اس سے متاثر ہو کر اسے آزاد کر دیتا ہے، جس سے دراصل یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طائر نے صیاد کو بے وقوف بنایا اور آزادی حاصل کر لی لیکن طائر کی دلیل سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ اگر کوئی بات سلیقے سے کہی جائے تو انسان اپنے تھوڑے سے فائدے کو ترک کر کے دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے پھر اسے بے وقوفی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

نہم درجہ کی درسی کتاب کا آخری شعری کلام مرزا سلامت علی دبیر کا مرثیہ ہے جو واقعہ کربلا کے دلدوز منظر کا ایک حصہ ہے، جس کا عنوان ہے ''جب کربلا میں عترت اطہار لٹ گئی''۔ مرثیہ کے اس حصہ میں حضرت امام حسینؓ اور ان کے عزیز و رفقائے کار کے جام شہادت نوش کرنے کا بیان ہے۔ درسی کتاب میں مرثیے کو ایک شعری صنف کی حیثیت سے متعارف کرانے کے مقصد کے علاوہ ایک بڑا مقصد اسلامی تاریخ کی عظیم ہستیوں کی قربانیوں سے روشناس کرانا ہے، جنھوں نے سر کٹا دیا لیکن باطل کے آگے سر نہیں جھکایا۔ حق پرستی اور قربانی کی ایک ایسی مثال چھوڑ گئے جو رہتی دنیا تک حق پر چلنے والوں کے لیے مشعل راہ رہے گی۔

دہم جماعت کی درسی کتاب میں بھی کل سات شعری اسباق ہیں جن میں ایک نعت، ایک قصیدہ دو غزلیں اور تین نظمیں شامل ہیں۔ درجہ دہم کے لیے شعری انتخاب میں موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ اصناف کو بھی دھیان میں رکھا گیا ہے۔

محمدؐ کی مدح کے بعد دکن کے صوفی بزرگ حضرت سید عاشق نہال چشتیؒ کی مدح میں ذوق کا شاندار قصیدہ ہے۔ دو غزلیں ہیں اس کے علاوہ مناظر فطرت ''خواتین کی بااختیاری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی'' جیسے موضوعات پر دو نظمیں، اس کے علاوہ ایک گیت بھی شامل درسیات ہیں۔

پہلی نظم خواجہ الطاف حسین حالی کا نعتیہ کلام ہے جو مسدسِ حالی (مد و جزر اسلام) سے ماخوذ ہے۔ حالی نے اس نظم کے ذریعہ محمدؐ سے اپنی عقیدت کے اظہار کے علاوہ

افراد خوب سے خوب تر کی تلاش میں اپنا 'خوب' بھی کھیں کھو دیتے ھیں اور تازندگی محرومی کا شکار رھتے ھیں۔ اگر اسی کوھم اپنا شعار بنا لیں تو پھر تو 'جچتے نھیں بخشے ھوئے فردوس نظر میں' کے مصداق ھو کر رہ جائیں گے۔ مستقبل کی بھتر اور عیش و عشرت کی زندگی کی خواھش اور کوشش میں اپنے حال کو بھی تکلیف دہ بنا دینے میں احساس محرومی کے علاوہ کچھ حاصل نھیں ھوتا اور احساس محرومی مثبت شخصیت کی تعمیر میں منفی رول ادا کرتا ھے۔ اس طرح یہ نظم حب الوطنی کے جذبے کے فروغ کے ساتھ ساتھ احساس محرومی کی اذیت کو بھی ظاھر کرتی ھے۔

قاری کے سامنے اس عظیم شخصیت کے اوصاف حمیدہ کو اس غرض سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والوں کے ایمان وعقائد کا احیا ہو سکے اور وہ ان خصائل جمیلہ کی تقلید کرنے کی کوشش کریں۔ نوعمر بچوں کے لیے یہ کردار براہ راست ایک مثال ہے۔ شاید کہ ان کے دل میں کچھ اوصاف گھر کر جائیں۔ نظم میں بہت روانی ہے اور اوزان کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے۔

دوسرا شعری کلام شیخ محمد ابراہیم ذوق کا قصیدہ ہے جو سید عاشق نہال چشتی کی مدح میں لکھا گیا ہے۔ دہم جماعت کی درسی کتاب میں قصیدہ کی شمولیت کا مقصد شاعری کی ایک اور صنف اور اس کے لوازمات سے روشناس کرانا ہے۔ لوازمات سے یہاں مراد اس کی ہیئت، اجزائے ترکیبی، پرشکوہ الفاظ، زور بیان، تخیل کی پرواز اور صنائع بدائع کا جابہ جا استعمال ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ مرتبت اشخاص کے تذکرے کے لیے آداب والقاب اور لب و لہجے کے استعمال کا سلیقہ سکھانا بھی مقصود ہے۔ کن اسباب اور پس منظر کے تحت قصیدہ بام عروج تک پہنچا، یہ نکتہ بھی قصیدے کی تدریس کے مقاصد میں شامل ہے۔ ذوق کے اس قصیدے کی تفہیم قاری میں شعور کی بالیدگی اور ادراک کی وسعت بھی عطا کرتی ہے۔ جو اس عمر کے طلبا کے لیے مطلوب ہیں۔

کتاب میں شامل پہلی نظم جوش ملیح آبادی کی 'البیلی صبح' ہے۔ صبح کا منظر تو تقریباً ہر ذی روح کے لیے فرحت بخش ہوتا ہے۔ لیکن جوش کے اظہار بیان نے اس منظر کو مزید رنگین بنا دیا ہے۔ پوری نظم کا لب ولہجہ بہت دلکش اور مترنم ہے۔ جوش کی پیکر تراشیوں اور تشبیہات نے اس نظم کو اتنا موثر بنا دیا ہے کہ کوئی بھی قاری اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نظم کا پہلا مصرعہ ہی 'نظر جھکائے عروس فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے' اتنا پرکشش اور معنی خیز ہے کہ قاری پوری نظم پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پوری نظم کو پڑھنے کے بعد قاری کے دل و دماغ پر بہت خوش کن جذبات مرتسم ہوتے ہیں جو ایک متوازن شخصیت کے لیے سکون کا جواز ضرور پیدا کرے گا۔ نظم کا نرم و نازک لب ولہجہ مزاج میں نرمی کا باعث ہوگا۔

دوسری نظم 'عورت' ایسے شاعر (کیفی اعظمی) کی نظم ہے جس نے اپنی شاعری کے ذریعہ ظلم واستبداد کے خلاف ہمیشہ آواز اٹھائی ہے اور سماج کی بدلتی ہوئی اقدار کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ نظم کا پہلا ہی مصرعہ ''اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے''، جنسی برابری کا پیغام دیتا ہے۔ عورتوں کے تئیں سماج کے غیر منصفانہ رویے کا اظہار نظم کے ہر ایک شعر سے عیاں ہے۔ عورتوں پر ظلم و زیادتی کی روداد بیان کرتے ہوئے شاعر کا لب ولہجہ تند اور باغیانہ ہو گیا ہے جس سے شاعر کے حساس دل کا کرب عیاں ہوتا ہے۔ یہ نظم سماج کی نصف آبادی کے لیے مساوی حقوق کی اہمیت کو صرف واضح ہی نہیں کرتی بلکہ پرزور انداز میں حقوق کو چھین لینے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔

اس طرح یہ پوری نظم نوعمر طلبا کے دل و ذہن پر کاری ضرب لگائے گی اور ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی شکل میں عورت کا احترام اور اس کے حقوق کی پاسداری کے تئیں بیدار کرے گی۔

دہم جماعت کی درسی کتاب میں شامل دو غزلوں میں سے پہلی غزل مرزا اسد اللہ خاں غالب کی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے غالب کی یہ غزل آسان غزلوں میں شمار کی جاتی ہے اور استفہامیہ انداز میں کہی گئی ہے۔ غزل کا چوتھا اور پانچواں شعر قطع بند ہے جس میں وحدت الوجود کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ ساتوں اور آٹھواں شعر صلہ رحمی اور ایثار کی ترغیب پر مبنی ہے۔ کچھ اشعار بہ ظاہر عشق و عاشقی کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان میں بھی حیات و کائنات کے معمولات کا ذکر معکوسی انداز میں ملتا ہے کیونکہ غالب کا ہی قول ہے

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غرضیکہ دسویں جماعت کے طلبا کے لیے غالب کی اس غزل کا انتخاب نہایت موزوں ہے۔ اس کے آہنگ اور زور بیان سے تو طلبا محظوظ ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اس غزل کے موضوعات طلبا کی بصیرت کو وسعت بخشیں گے اور حیات و کائنات کے رشتوں کو سمجھنے میں بالغ نظری عطا کریں گے۔

نصاب میں شامل دوسری غزل جدید شاعر مغنی تبسم کی ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی غزل ہے جو غزل مسلسل کے زمرے میں آتی ہے۔ اس غزل کا ہر شعر اللہ کی رحمتوں اور نوازشوں پر بندے کا اعتماد ظاہر کرتا ہے اور کسی بھی کیفیت میں مایوسی سے بچنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ غزل کا مواد ایمان افروز ہونے کے ساتھ ساتھ راہ راست پر چلنے کے لیے بھی آمادہ کرتا ہے۔ خواہ کتنی بھی مشکلیں راہ میں آئیں، بندے کو اللہ کی ذات سے ناامید نہ ہونے کی تلقین کرتا ہے۔

اس درسی کتاب کا آخری شعری سبق گیت کی شکل میں ہے جسے بکل اتساہی نے لکھا ہے۔ گیت ایک منفرد صنف شاعری ہے جس میں غزل کی طرح غنائیت ہوتی ہے اور لہجہ بھی نرم و نازک ہوتا ہے لیکن نظم کی طرح گیت میں بھی ایک ہی موضوع پر مسلسل اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ اس گیت کا موضوع قومی یکجہتی ہے جسے 'خون کا رنگ' کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ قومی یکجہتی کو نقصان پہنچتے دیکھ کر شاعر شدید رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور یاد دلاتا ہے کہ یہ ملک تو دنیا کے لیے امن کا پیغامبر تھا، محبت، امن اور اخوت کا درس دیتا تھا پھر یہ نفرت کا بازار کیوں گرم ہے؟ لیکن شاعر پُر امید ہے اس لیے وہ اس رویہ سے کنارہ کشی کرنے کے لیے تنبیہ کرتا ہے اور محبت، الفت اور رواداری کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔ اس طرح یہ پوری نظم براہ راست امن و آشتی کا پیغام دیتی ہے۔

تلنگانہ بورڈ کی نہم اور دہم جماعتوں کی اردو کی درسی کتب کا تجزیہ کرتے وقت ایک اور اچھی بات سامنے آئی کہ ان کتابوں کے مجوزہ شعری اسباق کے شروع ہونے سے پہلے دوسرے شعرا کے کچھ منتخب اشعار بھی شامل کیے گئے ہیں جو ان موضوعات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ اس سے سبق کا بہتر تعارف تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ موضوع کی تفہیم بھی بہتر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ زاویہ نگاہ بھی وسیع ہوتا ہے۔

تلنگانہ بورڈ کی نہم اور دہم جماعتوں کی اردو کی درسی کتب کا تجزیہ کرتے وقت ایک اور اچھی بات سامنے آئی کہ ان کتابوں کے مجوزہ شعری اسباق کے شروع ہونے سے پہلے دوسرے شعرا کے کچھ منتخب اشعار بھی شامل کیے گئے ہیں جو ان موضوعات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ اس سے سبق کا بہتر تعارف تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ موضوع کی تفہیم بھی بہتر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ زاویہ نگاہ بھی وسیع ہوتا ہے۔

آخیر میں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ نہم اور دہم کی درسی کتب کے اسباق کے انتخاب میں قدیم اور جدید شعرا کے مناسب امتزاج کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے۔

دونوں جماعتوں کی درسی کتب کے شعری مواد کے مطالعے سے مجموعی طور پر یہ حقائق بھی سامنے آتے ہیں کہ یہ شعری اسباق زبان دانی کے فروغ کے ساتھ صالح عمل کی طرف راغب کرنے کے لیے طلبا کی ذہن سازی بھی کرتے ہیں۔

■

Rizwana Begum
179/9, Third Floor, Farhana Manzil
Zakir Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

یاد رفتگاں

ایک باغ و بہار آدمی

غضنفر

زندگی کے سفر میں بہت سے لوگ راہ میں ملتے ہیں، پاس آتے ہیں۔ کچھ دور تک ساتھ چلتے ہیں پھر پیچھے چھوٹ جاتے ہیں یا بہت آگے نکل جاتے ہیں مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پیچھے چھوٹ کر یا آگے نکل کر بھی دل، دماغ اور آنکھ کسی سے اوجھل نہیں ہوتے۔ وہ پتلیوں میں بسے رہتے ہیں۔ سائے کی طرح ساتھ چلتے ہیں، دل کے قریب محسوس ہوتے ہیں اور عمر بھر رگ جاں کے پاس ہونے کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں او۔ان۔کول بھی ایک تھے۔ کول صاحب پہلی بار مجھے رہنما کی صورت میں ملے۔ سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز کی ملازمت کے دوران جو پہلا پروجیکٹ مجھے دیا گیا اس کا نگراں ڈاکٹر او۔این۔کول کو بنایا گیا۔ کول صاحب ان دنوں این۔آر۔ایل۔سی۔پٹیالہ، پنجاب کے پرنسپل ہوا کرتے تھے۔ کام کے سلسلے میں کئی بار ان سے ملاقات ہوئی۔ ہر ملاقات میں انھوں نے مجھے اپنا مہمان بنایا اور ایسا تاثر میرے دل پر ثبت کیا کہ جس کی چمک کبھی ماند نہیں پڑی۔ ان کی نگرانی کی مدت ختم ہوجانے کے بعد بھی ان سے ملنے کا سلسلہ جاری رہا، اس لیے بھی کہ وہ ہمارے ادارے کے مختلف ایسے اہم عہدوں پر فائز رہے کہ جن سے ہمارا واسطہ پڑنا لازمی تھا۔ وہ پرنسپل سے ڈپٹی ڈائریکٹر ہوئے، ڈپٹی ڈائریکٹر سے ڈائریکٹر بنے مگر وہ لیکچرر سے ڈائریکٹر تک ایک جیسے رنگ روپ میں نظر آئے۔ ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مرتبے نے انھیں ذرا بھی متاثر نہیں کیا۔ عہدے کی نفسیات نے کسی بھی موڑ پر اپنا رنگ نہیں دکھایا۔ رتبے کے مطابق سرکار کی طرف سے ملنے والی تعیّشی اور جاہ وجلالی مراعات نے کبھی زعم پیدا نہیں کیا اور نہ ہی ان کے اندر دماغ خراب کردینے والی ان سرکاری سہولتوں سے رعب جمانے والا کوئی روّیہ پروان چڑھا۔ ان کی طرز معاشرت، ان کے معمولات و معاملات، ان کے برتاؤ کسی میں بھی کسی قسم کی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی جبکہ ہمارے معاشرے میں عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ ایسے میں بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ کرسی اپنے آپ بیٹھنے والے کو اوپر اٹھا دیتی ہے۔ کرسی کی اسپرنگ بیٹھنے والے کو اچھالنے لگتی ہے۔ اس میں لگی رِوالونگ مشین جسم کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی گھمانے لگتی ہے۔ گدّی کی گدگداہٹ مزاج کو شوخ وشنگ بنادیتی ہے۔ عمدہ قسم کے اسٹیل سے بنے ہتھّوں کی چمک آنکھوں میں برتری کی چمک بھر دیتی ہے۔ کرسی کی اونچائی پیشانی پر عہدے کی لمبائی کی لکیر کھینچ دیتی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھنے والا کرسی کے اشارے پر خود تو ناچتا ہی ہے، دوسروں کو بھی نچانے لگتا ہے مگر کول صاحب کو ان کی کرسی اوپر نہ اٹھا سکی۔ وہ پہلے جہاں تھے اونچی کرسی پر پہنچنے کے بعد بھی وہیں بنے رہے۔ نہ چمکے نہ دمکے، نہ اوپر اٹھے اور نہ گھومے اور نہ ہی کسی کو گھمایا۔

وہ ہمیشہ انتظامیہ کے اعلا عہدوں پر فائز رہے مگر کام اسکالروں جیسا کیا۔ نہ کوئی شوفوں، نہ کوئی اکڑفوں، نہ طنطنہ، نہ طمطراق۔ ہر جگہ اور ہر کام میں بالکل سادہ اور سہج انداز اپنایا۔ انھوں نے ہمیشہ کام پر توجہ کی، کام کرنے کے رنگ ڈھنگ پر نہیں۔ ویسے تو وہ سوٹ بوٹ میں رہتے تھے مگر کبھی بھی میں نے ان کو فارمل پوزیشن میں نہیں دیکھا۔ ہمیشہ وہ مجھے ان فارمل نظر آئے، میٹنگ کنوین کرنے سے لے کر کھانے کے معاملات تک ہر جگہ انھیں میں نے بے تکلف پایا۔ عام طور پر سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے جلسوں یا تقریبات میں آغاز سے لے کر انجام تک ایک خاص طرح کا اہتمام کیا جاتا ہے مگر کول صاحب کے زیرِ نگرانی منعقد کی جانے والی تقریبات ان تکلفاتی اہتمام اور تام جھام سے خالی ہوتی تھیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ بہت سارا وقت بچ جاتا تھا۔ بہت ساری کام کی باتیں ہوجاتی تھیں۔ بہت سے کام بن جاتے تھے۔ بہت سی بگڑیاں درست ہوجاتی تھیں۔

کول صاحب اتنے ان فارمل تھے کہ سفر میں وہ ایک دو جوڑی سے زیادہ کپڑے نہیں لے جاتے۔ اگر

زیادہ دنوں تک قیام کرنا ہوتو رات میں انھیں کپڑوں کو دھولیا اور صبح خود پریس کر کے پہن لیا۔ ساتھ میں بس ایک چھوٹا سا ہلکا پھلکا سفری بیگ ہوتا جس کا بڑا فائدہ میں نے یہ دیکھا کہ اس نے کول صاحب کو بے جا دباؤ سے بچائے رکھا اور وہ چست درست اور دباؤ سے خالی نظر آئے۔ ان کی یہ سیاحیانہ زندگی مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کول صاحب کا یہ انداز مجھے آجائے مگر میں اگر یہ انداز اپنا تا ہوں تو میری بیوی بشریٰ کی محبت کا کیا ہوگا جو ایک بڑے سے سوٹ کیس میں بھر کر میرے ساتھ کردیا کرتی ہیں۔ محبتوں کے اس بھاری بوجھ کا ایک اپنا ہی مزہ ہے۔

کول صاحب کا یہ بے تکلفانہ انداز ان کے اسکالر شپ میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ چلتے پھرتے ایسے ایسے نکتے بیان کرجاتے تھے جو گہرے اور سنجیدہ مطالعے سے بھی ہاتھ نہیں آتے۔ ایک بار مجھے اورینٹیشن کورس کی ذمّے داری دی گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔ میں اس کورس کو لے کر خاصا پریشان تھا کہ اتفاق سے ایک محفل میں کول صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ حسبِ عادت انھوں نے پوچھ لیا کہ میں ان دنوں کیا کررہا ہوں۔ ان کے اس سوال کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ اور یہ لکھنا تعلیمی معاملات والا لکھنا نہیں، بلکہ ادب وفن والا لکھنا ہوتا تھا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ اورینٹیشن کورس کی تیاری میں لگا ہوا ہوں اور ساتھ میں میں یہ بھی کہہ گیا کہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ مجھے کیا اور کس طرح کرنا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ کول صاحب شروع ہوگئے اور انھوں نے آناً فاناً میں مجھے کچھ نکات نوٹ کروادیے۔ وہ نکات اتنے اہم اور کارآمد نکات تھے کہ ان کی بنیادی پر اورینٹیشن کورس کا پورا خاکہ تیار ہوگیا اور نہ صرف یہ کہ ان نکات سے میری رہنمائی ہوئی بلکہ وہ ہمارے کورس کی کامیابی کے ضامن بھی ثابت ہوئے۔

کول صاحب ایک اچھے اسکالر تو تھے ہی ایک اچھے تخلیق کار بھی تھے اور چوں کہ وہ ایک سے زیادہ زبانیں جانتے تھے اس لیے وہ اپنی ادبی کاوشوں کو کشمیری، ہندی انگریزی اردو وغیرہ کئی زبانوں میں پیش کرنے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ اس لیے وہ کشمیری کے ساتھ ساتھ، ہندی، انگریزی اور اردو کے ادیب بھی بن جاتے تھے۔

کول صاحب ادب کے پارکھی بھی تھے۔ کئی زبانوں کے ادب پاروں، جن میں غیر ملکی زبانوں کے ادب پارے بھی شامل ہیں، کا انھوں نے لسانیاتی اور اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے جانچا اور پرکھا۔ اس تنقیدی کاروبار میں بھی کول صاحب

پروفیسر اونکار ناتھ کول کی تصنیفات

- اردو اصناف کی تدریس
- ملاقات (افسانوی مجموعہ)
- اردو اسکرپٹ ریڈنگ اینڈ رائٹنگ
- اردو فونٹک ریڈر (کوآتھروِتھ نذیر حسن)
- Modern Hindi Grammar
- Modern Kashmiri Grammar
- A Dictionary of Kashmiri Proverb s

ایک ادیب کا روّیہ اپناتے۔ کہیں بھی کوئی ڈنڈی نہیں مارتے۔ بالکل معروضی نقطۂ نظر سے فن پاروں کو پرکھتے اور ان پر بے لاگ تبصرہ کرتے تھے۔ میرے ناول دویہ بانی کی انھوں نے جی کھول کر داد دی اور انھوں نے اسے اپنے پنڈت دوستوں کو بھی پڑھوایا جبکہ یہ ناول ایک طرح سے برہمنوں کے خلاف جاتا ہے۔

کول صاحب نے کچھ نئی کہانیاں بھی لکھی ہیں اور ان کہانیوں میں زندگی کے نچوڑ کو رکھ دیا ہے جیسے گلِ حیات کا عطر کشید کر کے ان میں بھر دیا گیا ہو، واقعی ان کی نئی کہانیاں خوشبو دیتی ہیں۔ ان کا یہ ایسا تخلیقی عمل ہے جو لفظ میں سطر، سطر میں صفحہ اور صفحے میں اوراق کھول دیتا ہے اور زندگی کے تلخ تجربوں کو ایسا حلوہ بنا کر پیش کرتا ہے کہ بنا محنت کے رگ وریشے میں مٹھاس بھر جاتا ہے۔

کول صاحب ایک اچھے ادیب اور معتبر نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سنجیدہ اور ایمان دار قاری بھی تھے۔ وہ دوسروں کی تخلیقات بھی دلچسپی اور دل جمعی سے پڑھتے اور

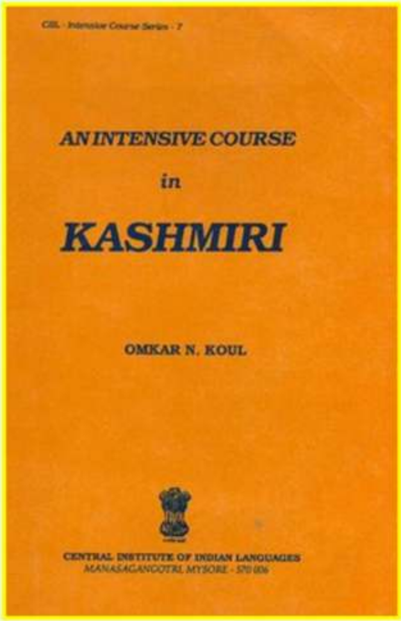

کوئی تحریر پسند آتی تو اس پر جی کھول کر داد دیتے تھے۔ اس کی تشہیر کرتے تھے۔ اسے دوسروں کو بھی پڑھواتے اور ان سے بھی داد دلوایا کرتے تھے۔ یہ کام بہت کم لوگ کرتے ہیں اور خاص طور پر وہ تو بالکل ہی نہیں کرتے جو خود وہ لکھتے بھی ہیں۔

کول صاحب کو میں نے حالتِ سکوت میں کبھی نہیں دیکھا۔ انھیں ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے دیکھا۔ انھیں ہر وقت متحرک پایا۔ ان کے دل، دماغ اور جسم تینوں اپنی جولانیوں کی جلوہ فشانی کرتے نظر آئے اور دل تو ان کا ہمیشہ جوان رہا۔ ان کے دل کی امیری کا رنگ آج بھی اپنی شعاعیں منعکس کررہا ہے۔ ان کے چہرے کے کشمیری رامش کو آج بھی پرکشش بنا رہا ہے۔ ان کا سروصفت قد ایک ایک نظر خصوصاً نگاہِ نازنیناں کو مرکزِ نگاہ بناتا رہا۔ ان کے اس جوان دل نے حفیظ جالندھری کی طرح انھیں کسی مصیفت میں نہیں ڈالا جس کے سبب انھیں یہ کہنا پڑا ہو۔

دل ابھی تک جوان ہے پیارے
کس مصیبت میں جان ہے پیارے

بلکہ کول صاحب کے یہاں نظّارہ اس کے برعکس دیکھنے کو ملتا۔ ان کا جوان دل انھیں کسی مصیبت میں نہیں ڈالتا بلکہ ان کی مسّرت کا سبب بنتا، ان کے لیے خوشیوں کے پرندے پکڑ لاتا، لطف وانبساط کی تتلیاں بلا لیتا، پلکوں پر رنگ ونور کے جگنو بٹھا دیتا، رگوں میں کیف وسرور کی موجیں اٹھا دیتا، شریانوں میں ترنگیں جگا دیتا۔ یہ ان کے جوان دل ہی کا کرشمہ ہے کہ رٹائر ہوجانے کے بعد بھی وہ رٹائر نہیں ہوئے اور نہ ہی ان کی زندگی میں مرزا غالب کی طرح یہ کہنے کا مقام آیا۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ان کے چہرے کی رمق، آنکھوں کی چمک اور لہجے کی کھنک سے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انھوں نے ابھی ابھی عنفوانِ شباب میں قدم رکھا ہو اور دیکھنے والوں کو یہ بھی لگتا کہ

ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہوجائے

عمر کے آخری موڑ پر، نامساعد حالات میں بھی کول صاحب کو اس قدر تروتازہ اور شگفتہ دیکھ کر مجھے اپنا شعر یاد آجاتا۔

دل کے زخموں کی عنایات ہیں ہم پر ورنہ
ایسے موسم میں کہاں کوئی جواں لگتا ہے

■

Ghzanfar
'Bushra', Hamza Colony
New Sir Syed Nagar Ext
Aligarh - 202001 (UP)

عظیم الشان صدیقی کی فکشن تنقید

اسلم جمشید پوری

اردو میں فکشن تنقید کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ یوں بھی شاعری کے مقابلے فکشن پر کم لکھا گیا ہے۔سید وقار عظیم ،ممتاز شیریں، حسن عسکری، محمد حسن کے بعد پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی ، وارث علوی، شمیم حنفی، مہدی جعفر، باقر مہدی، شمس الحق عثمانی،ابوالکلام قاسمی، ارتضٰی کریم ،اسلم آزاد، اعجاز علی ارشد، انور پاشا، صغیر افراہیم، خالد اشرف کے علاوہ پاکستان میں فرمان فتح پوری، وزیر آغا، انور سدید، مرزا حامد بیگ، انوار احمد، اصغر ندیم سید، امیر آغا قزلباش، وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔اس فہرست میں دو چار نام اور شامل ہو سکتے ہیں۔پھر بھی یہ فہرست ڈھائی درجن ناموں سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس فہرست میں پروفیسر عظیم الشان صدیقی کا نام بھی شامل ہے۔ انھوں نے فکشن شناسی میں اپنی انفرادیت قائم کی اور کبھی بے جا اشتہاریت یا کسی گروپ میں شامل نہیں رہے۔ اردو ادب کے خاموش خدمت گذاروں میں شمار ہونے والے پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں ناول اور افسانے کی باریکیوں کو گہرائی میں جا کر سمجھنے اور سمجھانے کی جو کوشش کی ہے، وہ انہیں اپنے ہم عصروں میں ممیّز وممتاز کرتی ہے۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی کی فکشن تنقید پر چار بے حد اہم کتب شائع ہوئی ہیں۔ ان کی پہلی فکشن تنقید 'افسانوی ادب' کے عنوان سے 1983 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں داستان، ناول اور افسانے پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ساتھ ہی مرزا ہادی رسوا، پریم چند اور بیدی کے علاوہ کرشن چندر اور انتظار حسین کے فکروفن پر بھی پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے دلجمعی سے لکھا ہے۔

عظیم الشان صدیقی کا ایک اہم کارنامہ 'افسانہ نگار پریم چند: تنقیدی وسماجی محاکمہ' ہے۔جس میں مقالہ نگار نے پریم چند کے افسانوں کے حوالے سے ہر ممکنہ پہلو پر خامہ فرسائی کی ہے۔ بلاشبہ کتاب ہذا پریم چند شناسی میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔اسی کتاب کی بنا پر اتر پردیش اردو اکادمی نے آپ کی خدمت میں 'پریم چند ایوارڈ' پیش کیا تھا۔

'اردو ناول :آغاز و ارتقا(1857 تا 1914)' کی اشاعت 2008 میں عمل میں آئی۔ناول کے آغاز وارتقا پر پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے جس قدر تفصیل سے جائزہ لیا ہے، وہ کم ہی ملتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ 1857 تا 1914 کے دوران لکھے گئے ناولوں اور کچھ قبل کی داستانوں اور قصوں کو سمجھنے کے لیے، اس سے بہتر کتاب شاید ہی کوئی ملے۔

'اردو افسانہ: فکری وفنی مباحث' عظیم الشان صدیقی کے قلم سے نکلنے والا ایک اور شاہکار ہے۔ عظیم الشان صدیقی نے نہ صرف افسانے کے فن اور تکنیک پر تفصیلی گفتگو کی ہے بلکہ پریم چند سے حیات اللہ انصاری اور قرۃ العین حیدر تک کے افسانوں پر کھل کر بحث کی ہے۔ یہی نہیں یہ کتاب 1960 کے بعد کے کئی اہم جدید افسانہ نگاروں کو بھی سامنے لاتی ہے۔ کتاب کے آخر میں ناول، خصوصاً جدید ناول پر بھی کئی مضامین شامل ہیں۔

عظیم الشان صدیقی کے مضامین کا ایک مجموعہ 'اظہار خیال' کے عنوان سے 1990ء میں شائع ہوا گو کہ اس میں متعدد اصناف پر ان کے مضامین شامل ہیں لیکن اس میں بھی داستان، ناول اور افسانہ سے متعلق نصف درجن سے زائد مضامین موجود ہیں۔ان کی تین اور کتب 'مشاہیر کی آپ بیتیاں' (مرتب)، مضامین سیدین (ترتیب ومقدمہ) آہنگ نو: شخص وشاعر' بھی شائع ہوکر ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر عظیم الشان صدیقی کا غالب رجحان فکشن کی تنقید کی طرف رہا ہے۔

جہاں تک اردو فکشن تنقید کی روایت اور عظیم الشان صدیقی کی انفرادیت کا معاملہ ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ عظیم الشان صدیقی فکشن کی باریکیوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ تنقید کرتے وقت وہ انہیں بروئے کار بھی لاتے تھے۔ وہ جزئیات یعنی گرہوں تک رسائی حاصل کرتے تھے اور گرہیں کھول کر اصل معنی ومفہوم تک جاتے، جو کبھی منشائے مصنف سے مماثل ہوتے تو کبھی متضاد بھی۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی ہر بڑے اور مستند ناقد کی طرح، ادب کے تعلق سے اپنا مخصوص نظریہ بھی رکھتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''میرے لیے ادب کبھی وقت گذاری کا ذریعہ نہیں رہا۔ مجھے ازلی وابدی انسان کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں اور اس کی ذہنی کاوشوں کے نقش ونگار نظر آتے ہیں۔ ادب کے ذریعے حاصل ہونے والی مسرت اور بصیرت کے لیے کوئی پیمانۂ قدر تو مقرر نہیں کیا جاسکتا ہے۔''

آگے مزید لکھتے ہیں:

''ان مضامین میں تنقید کے کسی مکتب فکر، اصول و نظریات کو زبردستی اوڑھنے یا مخصوص اصطلاحات کو استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ میرے علم اور تجربے نے مطالعہ کو سمت عطا کی ہے۔ یہ مضامین اس عمل کے براہِ راست اظہار کا نتیجہ ہیں۔''

(افسانوی ادب، عظیم الشان صدیقی، ص 6)

درج بالا اقتباسات پروفیسر عظیم الشان صدیقی کی پہلی کتاب 'افسانوی ادب' کے پیش لفظ سے ہیں۔ ان سے بالکل صاف ہوجاتا ہے کہ عظیم الشان صدیقی کے لیے ادب وقت گذاری کا ذریعہ کبھی نہیں رہا۔ انھوں نے ادب کا ذوق وشوق کے ساتھ مطالعہ کیا اور اس کے معنی اور دیگر انسلاکات سے ناقدانہ بصیرتیں حاصل کیں۔ ان کا یہ خود کہنا کہ وہ کسی مکتب فکر اور اصول ونظریے کو زبردستی اوڑھتے بچھاتے نہیں، کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ کسی نظریے سے وابستہ نہیں تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انھوں نے کسی بھی نظریے کو پروپیگنڈے کے لیے استعمال نہیں کیا۔ یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے کسی ازم اور نظریے کی بے جا اشتہاریت اور شعبدے بازی کو کبھی قبول نہیں کیا۔ ویسے اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ ترقی پسند نظریے کے حامی تھے۔ یہی باعث ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں میں سماجی معنویت اور انسانی اقدار کی بانگی تواتر کے ساتھ ملتی ہے۔ یوں بھی وہ معروف مارکسی نقاد پروفیسر محمد حسن کے شاگرد تھے۔ انھوں نے پروفیسر محمد حسن کی زیرنگرانی ہی اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا تھا۔ افسانوی ادب کے تعلق سے ان کا یہ اقتباس اور دیکھیں، اس سے بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ وہ ترقی پسند نظریے کے حامی تھے:

''افسانوی ادب کا مطالعہ کرتے وقت اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ تصادم اور تضاد کی وہ قوتیں جو زندگی کو فروغ دیتی ہیں وہ کہانی کو بھی وجود میں لاتی ہیں، لیکن نئی کہانی اس وقت ظہور میں آتی ہے جب تصادم وتضاد کی نوعیت بدل جاتی ہے اور افکار واقدار کے پرانے سانچے فرسودہ ہوجاتے ہیں اور سماج میں مصالحت ومفاہمت کے نئے رشتوں اور تحفظ وکفالت کے نئے وسائل کی تلاش ضروری ہو جاتی ہے۔ جاگیرداری سماج میں تصادم کی نوعیت مادی اور تضاد کی نوعیت غیر مادی ہو جاتی ہے اور تضادات مادی صورت اختیار کرنے لگتے ہیں۔''

(افسانوی ادب، عظیم الشان صدیقی، ص7)

متذکرہ بالا اقتباس کے بعد سب کچھ روز روشن کی طرح صاف ہوجاتا ہے کہ عظیم الشان صدیقی نے ادب کو ترقی پسند نظریے سے یعنی زندگی اور سماج کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ بطور ناقد وہ اپنے اس رویے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن یہ تو طے ہے کہ وہ ادب کو سماج کے منظر پس منظر اور اس کے اثرات کے حوالے سے نہ صرف دیکھتے ہیں بلکہ وہ ادب میں زندگی کے عناصر کی تلاش بھی کرلیتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی ہمہ گیریت اور مقبولیت کو ہندوستان میں مزید مستحکم کرنے والوں میں پروفیسر محمد حسن کے کارناموں سے کسی کو انکار ممکن نہیں۔ ان کے سیکڑوں شاگردوں نے ان کے نظریے کو آگے بڑھانے کا اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ پروفیسر عظیم الشان صدیقی ایسے ہی ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے افسانوی ادب پر اظہار خیال کرتے ہوئے تنقید وتحقیق کا حق ادا کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ ان کی فکشن پر تحریر کردہ تنقیدی کتب کے مطالعے سے سب کچھ آئینے کی طرح صاف ہوجاتا ہے۔ وہ ہر صنف، تحریک اور فن کار کے تعلق سے واضح اور دوٹوک بات کہنے کے عادی ہیں۔

اپنے مضمون 'داستان کا آغاز وارتقا' میں صنف داستان گوئی کے تعلق سے ان کا خیال بالکل واضح ہے۔ وہ اس صنف کے وجود اور فروغ کے لیے بھی سماجی عوامل کا ذکر کرتے ہیں:

''ادب میں نئی اصناف نئے سیاسی ومعاشی نظام اور نئے سماج کے ساتھ وجود میں آتی ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنے ارتقا اور زوال کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ داستانیں بھی جاگیردارانہ سماج کی دین ہیں۔ ادب میں ان کی داغ بیل تو اسی وقت پڑنا شروع ہوگئی تھی جب انسان نے قبائلی زندگی کی بدولت اور خانہ بدوشی کو ترک کر کے کسی ایک مقام پر رہنا شروع کیا اور جانوروں کے بجائے زرعی معیشت کو زندگی کا وسیلہ قرار دیا، اس مدنی تہذیب کے آغاز پر اسے اپنے قبائلی دور کے وہ واقعات، معرکہ آرائیاں، جانور، فطرت اور دشمنوں سے اچانک یا منصوبہ بند طریقے سے نبرد آزما ہونے کی وہ باتیں بھی یاد آئیں جو اس کے انفرادی اور اجتماعی تجربے، مشاہدے اور روایات کا حصہ رہی ہیں جن کی شدت تکرار اور بیان کی لذت نے داستانوں کو جنم دیا۔ چونکہ ہر قبیلے کا ایک سردار ہوا کرتا تھا جو اجتماعی قوت کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔ اسی لیے واقعات کا تانا بانا بھی اسی کے گرد بنا جاتا تھا۔ اس لیے قصہ میں طوالت، غیر معمولی واقعات اور ہیرو پرستی کے عناصر ابتدا ہی سے اس میں شامل تھے۔''

(اظہار خیال، عظیم الشان صدیقی، ص11)

یہ بات کسی حد تک درست معلوم ہوتی ہے کہ اصناف کے وجود میں آنے کے اسباب وعلل میں سب سے زیادہ مضبوط ومستحکم سماجی تغیرات ہیں۔ سیاسی اور سماجی تغیر وتبدل سے اصناف کے وجود اور عروج وزوال کا انسلاک ہوتا ہے۔ داستان کے وجود اور ارتقا کے جن اسباب کا ذکر پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے کیا ہے، وہ ان کے عمیق مطالعے کا اور تحقیقی نظر کا کمال ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہماری داستانوں، ناولوں، افسانوں اور فلموں میں ہیرو پرستی کا جو تصور ملتا ہے وہ قبائلی سردار کے وجود سے ہی مستعار ہے۔ بعض ناولوں، کہانیوں میں یہ ہیرو پرستی اس قدر شدت کے ساتھ استعمال ہوئی ہے کہ وہ کہانی کا منفی پہلو بن جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح، جیسے ہندوستانی فلموں کے ہیرو کا حال ہوتا ہے یعنی حقیقت سے پرے ایک ہیرو، دس دس مسلح دشمنوں کو بھی دھول چٹا دیتا ہے اور اس کے زخم کا کوئی نشان بھی نہیں ہوتا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہیرو پرستی کی اس بدعت کی شروعات بھی داستانوں سے ہوتی ہے۔ خاص کر مافوق فطرت عناصر کے کارنامے اور شعبدے بازی کے حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ داستان سے نکل کر یہ ہیرو پرستی ہماری بعض دیگر اصناف میں بھی داخل ہوئی لیکن آپ داستان کے مثبت کردار کے بھی منکر نہیں ہوسکتے۔ ہمارے افسانوی ادب میں سماج، تصادم، تضاد، دلچسپی، تحیر وتجسس بھی داستانوں ہی کی دین ہیں۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی کا شمار فکشن کے ان معتبر ومستند ناقدین میں ہوتا ہے جنھوں نے فکشن کا باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور جو فکشن کی تفہیم کے نت نئے طریقے استعمال کرتے رہے ہیں۔ عظیم الشان صدیقی کا کمال یہ ہے کہ وہ فکشن کے فن سے نہ صرف بخوبی واقف ہیں بلکہ فنی لوازم اور باریکیوں پر ان کی مضبوط گرفت ہے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب 'اردو ناول: آغاز وارتقا' اور 'اردو افسانہ: فنی وفکری مباحث' میں داستان، ناول اور افسانہ کے فن پر مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ ان کے اجزا پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے وہ باریک سے باریک پہلو پر بھی کڑی نظر رکھتے ہیں۔ یوں بھی ہمارے یہاں فکشن کی قواعد پر بہت کم گفتگو ہوئی ہے۔ وقار عظیم نے ضرور اس طرف توجہ دی ہے۔ لیکن وہ بات بہت پرانی ہوگئی اور بدلتے عہد میں جہاں موضوعات تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں وہیں فکشن لکھنے کے اصول وضوابط اور اسلوب وانداز میں بھی زبردست تغیر آیا ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ ہر دس سال میں ان کے اجزائے ترکیبی پر تفصیلی گفتگو ہونی چاہیے۔

اردو ناول کے آغاز کے تعلق سے یوں تو کوئی خاص اختلاف نہیں ہے۔ ناقدین اور دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'مراۃ العروس' کو ہی اردو کا پہلا ناول تسلیم کرتا ہے۔ اسی باعث اردو میں عمومی فضا، اسی ناول کی اولیت کے حق میں ہے۔ لیکن کوئی بھی تحقیق حتمی نہیں ہوا کرتی۔ اسی طرح ناول کے تعلق سے بھی متعدد تحقیق سامنے آئیں کہ پہلا ناول 'خط تقدیر' ہے۔ کسی نے

'ریاض دلربا' کو پہلا ناول قرار دیا۔اس سلسلے میں پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے پروفیسر محمود الٰہی کی تحقیق اور دعوے کو مدلل طریقے سے رد کیا ہے:

''ڈاکٹر محمود الٰہی نے 'خط تقدیر' کو اردو کا پہلا اصلاحی ناول قرار دیا ہے لیکن دلائل سے اسے ناول ثابت نہیں کیا ہے۔اپنے مقدمے میں انھوں نے اس قصہ کے کرداروں کے بارے میں کسی قدر طویل بحث کی ہے جس کا پہلا جملہ یہ ہے۔''خط تقدیر کے کردار تمثیلی ہیں۔ اس کا ہر کردار اپنے عمل سے اپنے نام کی تشریح وتوضیح کرتا ہے۔''حقیقت یہ ہے کہ خط تقدیر اردو کی پہلی اور واضح تمثیل ہے۔اس میں تمثیل کی وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جس کا اظہار دوسرے باب کے ابتدا میں کیا گیا ہے۔ اردو میں اس طرح کی دوسری تمثیلیں موجود ہیں۔''

(اردو ناول: آغاز وارتقا، عظیم الشان صدیقی، ص 111)

پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے خود محمود الٰہی کے جملے، ان کی تردید میں بطور دلیل پیش کیے ہیں۔کرداروں کا تمثیلی ہونا اور ان کے ناموں کی توضیح وتشریح کا بھی موجود ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہ ناول نہیں، تمثیلی قصہ ہے۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی یہیں بس نہیں کرتے بلکہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول کے تعلق سے بھی اپنی رائے مدلل پیش کرتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ 'مراۃ العروس' بعض فنی خامیوں کے باوجود، اردو کا پہلا ناول ہے کہ اس سے قبل تحریر ہونے اور شائع ہونے والے ناول فن ناول نگاری پر کھرے نہیں اترتے اور یہ ناول نہیں قصے ہیں۔ داستان اور ناول کے درمیان ایک عرصہ ایسا بھی آتا ہے جب ہمارے یہاں قصوں کا چلن عام ہوجاتا ہے۔ یہ قصے کبھی تمثیلی تو کبھی عام نثری قصے ہوتے ہیں۔ انھیں داستان کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے نہ ہی ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔لہٰذا انہیں قصے ہی کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ 'مراۃ العروس' کے تعلق سے پروفیسر عظیم الشان صدیقی کی یہ رائے ملاحظہ کریں:

''مراۃ العروس، اردو کا پہلا ناول ہے جسے سب ہی نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے۔ اردو کے اس پہلے ناول میں وہ جملہ فنی لوازم موجود نہیں ہیں جن کا جدید ناول سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔لیکن ان کمزوریوں کے باوجود جب ہم مراۃ العروس میں داستانوں کی خیالی دنیا کے برعکس زندگی کی ٹھوس حقیقتیں اور ان حقیقتوں سے دوچار ہونے والے ہم اور آپ سے ملتے جلتے کردار، متوسط طبقہ کی زندگی کا عکس، واقعیت نگاری، فرد اور اس کی اہمیت کا احساس، زندگی کی تنقید تفسیر اور تعمیر کا رجحان اور ایک مرکزی خیال کے تحت موضوع ومواد پیش کرنے کا احساس، مرأۃ العروس میں پاتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ داستانوں سے مختلف کسی نئی صنف کا آغاز ہے اور اس کی یہ خصوصیات اسے داستانوں کے زمرے سے نکال کر ناول کے دائرے میں لے آتی ہیں اور اس کو پہلے ناول کا استحقاق بخشتی ہیں۔

(اردو ناول: آغاز وارتقا، عظیم الشان صدیقی، ص (34-133)

محولہ بالا عبارت میں پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے بہ دلیل ثابت کیا ہے کہ 'مراۃ العروس' اردو کا پہلا ناول ہے۔داستان کی غیر حقیقی دنیا سے یکسر مختلف حقائق کو لفظوں میں پروئے اور قصے کے انداز اور لفظیات سے قدرے مختلف 'مراۃ العروس' نے ثابت کیا ہے کہ وہ ان دو نوں سے الگ ایک صنف ہے، جسے بعد میں ناول کہا گیا ہے۔جس میں مختلف ومتعدد کرداروں کے حوالے سے زندگی کی حقیقتوں کو سامنے لانے اور انسان کے رویے کی عکاسی موجود ہے جو اردو ناول کی شروعات ہے۔ زندگی اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ، انسانی عادات، عمل اور ردعمل، نفسیاتی تجزیہ، وقت کے ساتھ تغیر پذیر ہوتے جذبات، تصادم، منظر نگاری وغیرہ نے مل کر ناول جیسی نئی صنف کو اردو میں متعارف کرایا۔

ناول کے بعد، افسانہ فکشن کی ایک مضبوط ومستحکم صنف کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہاں ناول کی طرح انسانی زندگی کا اظہار بھی ہے اور نفسیاتی عمل اور ردعمل بھی۔ ناول اور افسانے میں طوالت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ افسانہ آزادانہ طور پر ایک صنف ہے جس کے فنی لوازم بھی، ناول سے الگ ہیں۔فکشن میں افسانہ سب سے زیادہ مقبول صنف ہے۔افسانہ زندگی کے مختلف گوشوں کو سامنے رکھ کر تحریر کیا جاتا ہے۔لیکن پھر وہی بات کہ ناول زندگی کو بڑے کینوس پر پیش کرتا ہے جب کہ افسانہ زندگی کی ایک جھلک، کسی ایک کردار یا دو یا زائد کی زندگی کا کبھی ایک پہلو تو کبھی کئی پہلوؤں کے مدنظر تخلیق ہوتا ہے۔

افسانہ کیا ہے؟ افسانے کی تخلیق کا عمل کن مراحل سے گذر کر تکمیل تک پہنچتا ہے۔افسانے کا آغاز کیا ہوتا ہے؟ انجام کیا ہونا چاہئے؟ قصہ اور پلاٹ کی افسانے میں کیا اہمیت ہوتی ہے۔ ان سب کے حوالے سے عظیم الشان صدیقی کا یہ اقتباس بہت واضح ہے:

''افسانے میں ہر لمحہ آزمائش سے گذرنا پڑتا ہے۔یہاں کردار ومسائل کی بہ ذات خود کوئی علاحدہ حیثیت نہیں ہوتی بلکہ وہ واقعہ کی بنت میں ہی شامل ہوتے ہیں۔اس لیے افسانے میں تجسس وتحیر کی فضا اور دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ دکھانے اور کچھ چھپانے کے انداز میں واقعہ کی پرتیں اس طرح دھیرے دھیرے کھولنی پڑتی ہیں کہ انجام ایسے چونکا دینے والے انکشاف میں تبدیل ہوجاتا ہے کہ جذباتی تسکین کے ساتھ ذہن کو بھی فکر کی غذا مل جاتی ہے— لیکن افسانے کا یہ انجام اس کے آغاز کا ہی مرہون منت ہوتا ہے جہاں نفس واقعہ کی مناسبت سے اگر برجستہ اظہار کو ذریعہ نہیں بنایا جاتا ہے تو قاری کی توجہ پر گرفت مضبوط کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس اعتبار سے افسانہ نگاری، ناول نگاری کے مقابلے میں مشکل فن ہے جس میں پلاٹ سازی کی الجھنیں مزید دشواریاں پیدا کردیتی ہیں۔''

(اردو افسانہ: فکری وفنی مباحث، عظیم الشان صدیقی، ص 23)

پریم چند کے فکشن پر ان کی کتاب 'افسانہ نگار پریم چند: تنقیدی وسماجی محاکمہ' انفرادیت کی حامل ہے اور پریم چند شناسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر عظیم الشان صدیقی انگلیوں پہ شمار کیے جانے والے پریم چند شناس ناقدین میں سے ایک ہیں۔

عظیم الشان صدیقی نے کرشن چندر اور انتظار حسین پر بھی بھرپور تنقیدی مضامین تحریر کیے ہیں جو اپنا الگ مقام رکھتے ہیں۔عظیم الشان صدیقی نے اپنی حق گوئی اور بیباکی سے اردو تنقید، خصوصاً اردو فکشن تنقید میں اپنا الگ مقام بنالیا ہے۔وہ اپنا اسلوب رکھتے ہیں، ان کا اپنا زاویۂ نظر ہے، جسے پیش کرنے میں وہ کسی مصلحت سے کام نہیں لیتے اور تحریر میں جو خوبی وخامی موجود ہوتی ہے وہ برملا اس کا اظہار کردیتے ہیں۔

آج کے خود اشتہاریت کے عہد میں عظیم الشان صدیقی جیسے لوگ Unfit سے نظر آتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ اتنی معیاری تنقید نگاری کے باوجود عظیم الشان صدیقی کو وہ شہرت اور مقبولیت نہیں ملی، جس کے وہ حق دار تھے۔لیکن خود اشتہاریت کے سبب حاصل ہونے والی شہرت 'پل بھر کا تماشہ' ثابت ہوتی ہے اگر تحریر میں کوئی وصف ہوتا ہے تو وہ کسی کی محتاج نہیں ہوتی اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کی قدر ہوتی ہے۔ وقت بہت بڑا ناقد اور منصف ہوتا ہے۔ وہ جو فیصلہ کرتا ہے، وہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔عظیم الشان صدیقی بھی اپنی تحریروں کے حوالے سے ہمیشہ ہمارے ذہنوں میں زندہ رہیں گے۔

■

Prof. Aslam Jamshedpuri
HOL, Urdu, Chaudhary Charan Singh University
Meerut - 200005 (UP)
E-mail: aslamjamshedpuri@gmail.com
Mob.:09456259850

لگیں گی آپ کو صدیاں ہمیں بھلانے میں

ڈاکٹر گوپال داس نیرج کی یاد میں

جمال اختر

پ: 6 رجنوری 1924
و: 19 رجولائی 2018

آج رات تقریباً نو بجے میرے دوست ڈاکٹر شاہد امام نے یہ خبر دی کہ ابھی ابھی کوی نیرج جی کا انتقال ہوگیا۔ یہ سن کر میری آنکھوں میں 1986 سے لے کر ان سے آخری ملاقات تک کے سارے مناظر گھومنے لگے اور ان کا فلمی گیت ؎

بادل بجلی چندن پانی ایسا اپنا پیار
لینا ہوگا جنم ہمیں کئی کئی بار

یاد آ گیا پتہ نہیں وہ دوبارہ جنم لے پائیں گے یا نہیں لیکن جو اس جنم میں وہ کر گئے اس کو کرنے کے لیے واقعی کئی جنم چاہیے۔ میری ملاقات نیرج جی سے 1986 میں شہریار صاحب کے گھر فیصل ولا سرسید نگر میں ہوئی تھی۔ دیکھنے سے شہریار صاحب اور نیرج جی بڑے قریبی دوست معلوم ہوتے تھے۔ میں بیٹھا دونوں کی بات چیت اور یارانہ دیکھتا رہا شاعری بھی ہوئی میں سنتا رہا پھر شہریار صاحب نے میرا ایک شعر ان کو سنایا جو انھیں دنوں کی غزل کا تھا ؎

بھیگے کاغذ کی طرح اب تو سلگنا مشکل
اتنا احسان کرو مجھ کو جلانے آؤ

یہ شعر سن کر مہاکوی نے میری طرف دیکھا، سرور کے عالم میں تھے، بولے یہ شعر اس لڑکے کا ہے؟ میں خاموش رہا اور یہ سوچنے لگا کہ شاید میں نے کچھ ایسا کہا ہے جو یہ یقین نہیں کر پا رہے ہیں۔

اس کے بعد میں ان کے گھر جنک پوری میرس روڈ پر اکثر ملنے چلا جاتا تھا دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ آؤ بھئی اختر آؤ۔ وہ ہمیشہ باہر برآمدے میں ہی بیٹھے ملتے۔ میں تو جاتا تھا ان سے فلمی زندگی کے بارے میں جاننے کے لیے لیکن وہ کبھی فلموں کی بات نہیں کرتے تھے۔ مجھ سے کہتے، شاعری سناؤ میں غزلیں سناتا رہتا کسی کسی شعر پر خوش ہو جاتے تو تعریف بھی کرتے۔

ایک روز میں نے ہمت کر کے کہا آج تو آپ بھی شاعری سنائیں۔ بولے شاعری سنو گے میں نے بھی غزلیں لکھی ہیں اور پھر ایک لمبی غزل سنائی جس کے چند اشعار یاد ہیں ؎

سمے نے جب بھی اندھیروں سے دوستی کی ہے
جلا کے اپنا ہی گھر ہم نے روشنی کی ہے

میں لڑکھڑایا کبھی اور کبھی نہ بہکا یوں
مجھے پلانے میں بھی تم نے کیوں کمی کی ہے

ثبوت میں میرے گھر میں دھوئیں کے یہ دھبّے
کبھی یہاں پہ اجالوں نے خودکشی کی ہے

وہ کبھی بھی خود کو ظاہر نہیں کرتے تھے لیکن اکثر اپنا یہ شعر گنگناتے رہتے تھے۔ آواز بہت اچھی تھی ؎

ہم تو مست فقیر ہمارا کوئی نہیں ٹھکانا رے
جیسا اپنا آنا پیارے ویسا اپنا جانا رے

دیکھنے میں وہ فقیرانہ زندگی ہی جیتے تھے۔ دھوتی باندھے بنیان پہنے باہر برآمدے میں بیٹھے رہتے گیٹ کبھی بھی بند نہیں ملتا تھا ان کے گھر کا۔ ایک روز میں نے سوال کیا نیرج جی اپنی زندگی اور فلمی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے میرے کام آئے گا اس روز اتنا ضرور بتایا کہ میاں ہم اٹاوہ کے گاؤں پروالی میں غریب گھر میں پیدا ہوئے ہم چار بھائی تھے میں دوسرے نمبر پر تھا پتا جی جلدی گزر گئے تھے حالات اچھے نہیں تھے پھوپھا جی ایٹہ میں تھے وہ اپنے ساتھ لے آئے پڑھانے کے لیے۔ میرا اگلہ اچھا تھا لوگ ضلع کا اے۔ کے سہگل کہتے تھے۔ پڑھائی کے دوران ہی ایٹہ میں ایک کوی سمیلن ہوا لوگوں نے مجھے بھی منچ پر بٹھا دیا یہ 1941 کی بات ہے۔ میں نے بھی کویتا پڑھی اس کی ادھیکشتا سوہن لال ترویدی جی کر رہے تھے میں نے جو کویتا پڑھی اس کی لائنیں یہ تھیں ؎

مجھ کو جیون آدھار نہیں ملتا ہے
آشاؤں کا سنسار نہیں ملتا ہے

اس منچ سے مجھے کوی کے طور پر پرتشٹھا مل گئی اس کے بعد

1942 میں وہیں گاؤں میں پریم کر بیٹھا جس کا انت دُکھت رہا۔ اب غربت، ماں سے دوری، پیا ر میں نا کامی،کوی من کوآدھار ملنے کے لیےاور کیا چاہیے، پران سب کے باوجود تن روگی من بھوگی اور آتما یوگی رہی دسویں پاس ہوتے ہی پھوپھا جی نے کہہ دیا میری ذمے داری ختم اب آگے بڑھواس طرح پھوپھا کا گھر بھی چھوڑ دیازندہ رہنے کے لیے کچھ تو چاہیے، پان بیڑی بیچی، تانگا چلا یا، دکان پر منیم کی حیثیت سے کام کیا، کسی طرح دہلی میں سپلائی وبھاگ میں ٹائپسٹ کی نوکری مل گئی۔ 1943 میں 67روپیہ ملتے تھے 35روپے ماں کو بھیجنے ہوتے تھے پڑھائی بھی کرتا رہا، اسی دوران کلکتہ میں کوی سمیلن ہوا، مجھے بھی جانے کا موقع ملا، انگریزی حکومت تھی، وہاں میں نے ایک گیت پڑھا۔

ودروھی ہوں میں جگ میں ورودھ کرنے آیا ہوں

جب دہلی لوٹا تو نوکری سے نکال دیا گیا یہ کہہ کر کہ تم حکومت کی نظر میں باغی ہو۔ کیا کرتا پھر وہاں سے کانپور لوٹ آیا۔ برجیند رسکسینہ کے یہاں ٹائپسٹ کی نوکری شروع کردی اب میری کوی کے طور پر پہچان ہوچکی تھی انٹر، بی اے اور ایم اے کی پڑھائی پوری کرنے کے بعد ضلع سوچنا ادھیکاری بن گیا، نوکری میں من نہیں لگا تو چھوڑ دی۔ 1955 میں میرٹھ کالج میں ہندی کا پرادھیا پک بن گیا، میرٹھ کالج کے لوگ خلاف رہتے تھے، نیرج جی آپ وقت پرنہیں آتے کالج کلاس نہیں لیتے، شکایت آتی ہے بھید بھاؤ رکھتے تھے کچھ ہی سمے بعد میرٹھ کالج سے نوکری چھوڑ دی دل اُچاٹ ہوگیا تھا۔

تب علی گڑھ آیا اور یہیں کا ہوگیا۔ دھرم سماج کالج میں نوکری کی اور پھر کہیں نہیں گیا۔ 1951 کے بعد سے لوگ گیت کار ماننے لگے تھے کوئی کوی سمیلن ایسا نہیں ہوتا تھا جہاں کارواں گزر گیا غبار دیکھتے رہے نہ سنانا پڑتا۔ امریکا، کناڈا، لندن جہاں گیا وہاں بھی اسی گیت کی فرمائش آتی تھی۔ یہ بتا کر پھر آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہے۔ بھائی صاحب جس سے پریم ہوا تھا ان کا نام تو یاد ہوگا پھر ملاقات کب ہوئی۔ ہاں اس کا یشودھا نام تھا، میں ایٹہ سے اپنے گھر اٹاوہ چلا گیا اس کی شادی کردی گئی پھر نہیں مل سکے تبھی سے کویتاؤں میں درد بڑھا اور جیون کے مولیہ ادھار پر اترتی چلی گئیں۔

بھائی صاحب کبھی تو ملاقات ہوئی ہوگی یشودھا جی سے۔ ہاں 55 برس بعد، جب وہ 72 برس کی ہوں گی اور میں 75 برس کا تھا۔ برے حال میں تھی، دھوتی کے نیچے پیلی کوٹ تک نہیں تھا، کسی مزدور گھرانے میں شادی

اب غربت، ماں سے دوری، پیا ر میں ناکامی، کوی من کو آدھار ملنے کے لیے اور کیا چاھیے، پر ان سب کے باوجود تن روگی من بھوگی اور آتما یوگی رھی دسویں پاس ھوتے ھی پھوپھا جی نے کھہ دیا میری ذمے داری ختم اب آگے بڑھو اس طرح پھوپھا کا گھر بھی چھوڑ دیازندہ رھنے کے لیے کچھ تو چاھیے، پان بیڑی بیچی، تانگا چلا یا، دکان پر منیم کی حیثیت سے کام کیا، کسی طرح دھلی میں سپلائی وبھاگ میں ٹائپسٹ کی نوکری مل گئی۔ 1943 میں 67روپیہ ملتے تھے 35روپے ماں کو بھیجنے ھوتے تھے پڑھائی بھی کرتا رھا، اسی دوران کلکتہ میں کوی سمیلن ھوا، مجھے بھی جانے کا موقع ملا، انگریزی حکومت تھی، وھاں میں نے ایک گیت پڑھا۔

کردی تھی تب میں نے کہا بھائی صاحب آرام کریں میں چلتا ہوں آج جب وہ نہیں رہے اور شہریار صاحب بھی نہیں رہے میں ایسے کسی اور شخص کے بارے میں نہیں جانتا تھا جو ان کے بارے میں کچھ اور بتا سکے، تب مجھے خیال آیا کہ اردو کے مایہ ناز ناولسٹ پدم شری قاضی عبدالستار صاحب سے ملوں، جو کہ سرسید نگر میں ہی رہتے ہیں۔ ان کے پاس حاضر ہوا، بیٹھنے کے بعد سوال کیا۔ سر کچھ نیرج جی کے بارے میں یاد ہوتو بتائیے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ ستار صاحب نے ایک لمبی سانس لی اور بولے میاں وہ تو 63 سال پرانا تعلق توڑ کر چلا گیا، میری اور اس کی جوانی کے دور سے دوستی تھی۔ ہم تین لوگ تھے جو بہت ساتھ رہے، میں، نیرج اور ڈاکٹر وحید اختر۔ میں اور وحید اختر اس زمانے میں دودھ پور میں آنند بھون میں رہا کرتے تھے وہیں نیرج بھی آجاتے تھے ہم لوگوں نے ساتھ بیٹھ کر پچیس تیس سال تک جام چھلکائے ہیں۔ 1995 میں وحید اختر بھی ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے اس کے بعد میں سرسید نگر آ گیا اور یہ سلسلہ کم ہوگیا اس کے بعد نیرج کبھی میرے گھر آجاتے اور کبھی اپنے گھر جنک پوری میں مجھے بلا لیتے۔ نیرج جس کا نام ہے وہ یاروں کے یا رتھے لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہوا اخبار میں پڑھ کر کے اس کے گھر والوں نے اس کی آخری خواہش پوری کیوں نہیں کی۔ اس کو جلایا جبکہ اس نے کئی برس پہلے یہ لکھ کر سب کو بتایا تھا اور انتظامیہ کو بھی یہ لکھت دی تھی کہ میرا جسدِ خاکی مسلم یونیورسٹی کے جواہرلال نہرو میڈیکل کالج کو دے دیا جائے لوگ اس پر کام کریں ریسرچ کریں۔ مہاکوی نے دو شادیاں کی تھیں پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی تھی پہلی بیوی سے دو بیٹے ایک بیٹی ہے اور دوسری بیوی سے دو بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں لیکن میں نے ہمیشہ ان کے ملازم کو ہی پچھلے تیس برس سے خدمت کرتے دیکھا۔ وہ نوجوان تھا اس وقت کھانا چائے دوا ہر وقت آس پاس ہی رہتا تھا ان کے۔ جو آج تک ہے سنگ سنگ نام کا یہ نیپالی نوکر اس نے پوری زندگی ان کی خدمت میں لگادی۔

میں ایک مرتبہ شام میں ان کے پاس بیٹھا تھا وہ گائے کو چارہ ڈال رہا تھا اس کا ریڈیو بج رہا تھا کچھ ہی دیر میں نیرج جی کا گانا آنے لگا ''پھولوں کے رنگ سے دل کی قلم سے لکھی تجھے روز پاتی'' جب یہ گانا ختم ہوا تو میں نے کہا بھائی صاحب آج تو کوئی گانا سنا دیجیے جو بھی آپ کو پسند ہو۔ بولے گانا سنو گے مجھے پوری امید تھی یہ اپنا گانا سنائیں گے اور شاید یہ گانا سنائیں گے۔ دیکھتی رہی آج درپن تم آئینہ دیکھ صورت مچل جائے گا انہوں نے گانا سنایا گانا یہ تھا ''میرے ساجن ہیں اس پار لے چل یار لے چل یار او میرے ماجھی اب کی بار لے چل پار، پورا گانا سنایا جب گانا ختم ہوا تو میں نے کہا یہ گانا تو شلیندر کا ہے بولے مجھے بھی پتہ ہے یہ تو تم نے کہا تھا اپنی پسند کا گانا سنایئے۔ ایسے گانے لکھ کون پاتا ہے اور پھر برمندہ ایچ ڈی برمن نے اپنا دل نکال کے رکھ دیا ہے۔ گانے میں دادا جیسا کون تھا بہت مانتے تھے ایس ڈی برمن کو۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ان کے پاس بیٹھ کر لگتا نہیں تھا کہ آپ اتنے بڑے کوی اور گیت کار کے ساتھ ہیں۔ بہت خاکساری تھی مہاکوی میں۔ میں نے دیکھا جیسے ان کی شاعری میں الفاظ کا ذخیرہ تھا۔ ایسے ہی ان کے پاس اخلاق کا بھی ذخیرہ تھا پیار کرتے تھے لوگوں سے اور لوگ بھی ان سے بہت پیار کرتے تھے اور عزت بھی'' کچھ روز پہلے جاوید اختر علی گڑھ آئے ہوئے تھے پہلے نیرج جی سے ملنے گئے اور کافی دیر ان کے ساتھ رہے، رات میں میری ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا جاوید بھائی کیسی رہی ملاقات، کہنے لگے جب بھی یہاں آتا ہوں سوچ کر آتا ہوں نیرج جی سے ضرور ملنے جاؤں گا اور کبھی نہیں جا پاتا، اس بار ان سے پہلے ملنے گیا اس کے بعد ادھر آیا، میں جب منٹو سرکل میں پڑھتا تھا جب بھی ان کی شاعری

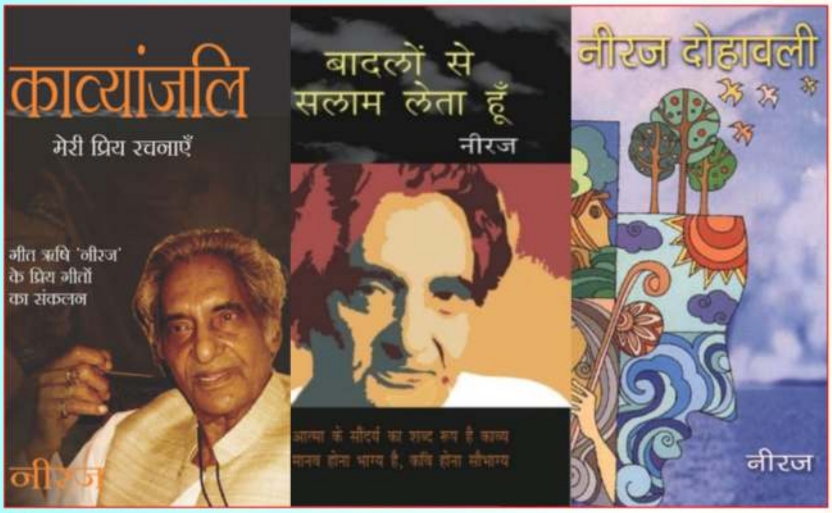

سننے جایا کرتا تھا بہت بڑے آدمی ہیں نیرج جی جو وہ کر چکے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کیا نہیں لکھا انھوں نے، ہندی ادب میں فلموں میں کیا کہنے ان کے۔''

نیرج جی دوسروں کو بھی بڑا مانتے تھے ان کی یہ سوچ کبھی نہیں رہی کہ میں نے فلموں میں جو گیت لکھے یا جو کویتائیں لکھی ہیں تو میرا کسی سے مقابلہ نہیں، کوئی میرے برابر کیسے ہوسکتا ہے، ساحر اور شلیندر کو بہت بڑا شاعر مانتے تھے ایک اخبار کے نمائندے نے ان سے آج کل کے حالات پر بات کی جو مذہب سے بھی تعلق رکھتی تھی انہوں نے جواب میں کہا۔ آپ کیا سوچتے ہیں مجھے نہیں پتہ میں یہ جانتا ہوں دنیا کے سندر دھرموں میں ایک دھرم ہے اسلام اور صرف مسلمانوں کے ہی نہیں سارے سنسار کے رسول ہیں محمد صاحب۔ جس چیز نے مہا کوی کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا وہ ہیں ان کے فلمی گیت۔ ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے نیرج جی نے سو سے زیادہ خوبصورت گیت لکھے جو محمد رفیع، مکیش کشور کمار، مناڈے، ایچ ڈی برمن، آشا بھونسلے اور لتا منگیشکر نے گائے ان کا پہلا گانا فلم نئی عمر کی نئی فصل میں تھا جو آج بھی لوگوں کے دل میں اور زبان پر رہتا ہے۔

1۔ کارواں گزر گیا غبار دیکھتے رہے

اس کے بعد انھوں نے فلموں کے لیے ایسے گیت لکھے جو لوگ شاعری کا شعور رکھتے ہیں وہ ان کے گیت سن کر بتادیتے ہیں کہ یہ گانا نیرج کا ہی ہوگا

2۔ بس یہی اپرادھ میں ہر بار کرتا ہوں
آدمی ہوں آدمی سے پیار کرتا ہوں
3۔ چوڑی نہیں میرا دل ہے دل ہے دیکھو دیکھو ٹوٹے نا
4۔ میں نے تیرے لیے ہی سات رنگ کے سپنے بنے
5۔ اے بھائی ذرا دیکھ کے چلو
آگے بھی نہیں پیچھے بھی
6۔ وہ ہم نہ تھے وہ تم نہ تھیں وہ راہ گزر تھی پیار کی
لٹی جہاں پہ بے وجہ پالکی بہار کی
7۔ میرا جیون کورا کاغذ کورا ہی رہ گیا
8۔ پھولوں کے رنگ سے تجھ کو لکھی روز پاتی
9۔ شوخیوں میں گھولا جائے تھوڑا سا شباب
اس میں پھر ملائی جائے تھوڑی سی شراب
ہوگا یوں نشہ جو تیار...
10۔ صبح نہ آئی شام نہ آئی جس دن تیری یاد نہ آئی
11۔ کیسے کہیں ہم پیار نے ہم کو کیا کیا کھیل دکھائے
12۔ میرا من تیرا پیاسا پوری کب ہوگی آشا
13۔ کہتا ہے جوکر سارا زمانہ آدھی حقیقت آدھا فسانہ

اور ایسے نہ جانے کتنے گیت ہیں ان کے جو آج اور آنے والے زمانوں میں بھی دل کو چھوتے رہیں گے۔ نیرج جی نے جہاں ہندی، اردو فلم میں اپنا سرمایہ یادگار کے طور پر دیا ہے وہیں میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کسی شاعر یا کوی نے اتنے لمبے عرصے مشاعرے اور کوی سمیلن میں شرکت کی ہوگی انھوں نے پہلا کوی سمیلن 1941 میں ایٹہ میں پڑھا تھا اور پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔ موت سے چند روز پہلے بھی کوی سمیلن میں شرکت کی تھی اگر دیکھیں تو ان کی شاعری کی عمر تقریباً 78 برس ہے۔

حالات اور وقت انسان کو کہاں پہنچا دیتے ہیں ایک ایسا شاعر جس کے نغمے سن سن کر لوگ جیتے تھے وہ اس حال کو پہنچ گیا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ علی گڑھ کو اپنا یہ شعر لکھ کر خط لکھتے ہیں کہ ضلع ادھیکاری مہودے۔

دکھتے ہوئے زخموں پر ہوا کون کرے
اس حال میں جینے کی دعا کون کرے

میری دیکھ ریکھ کررہے لوگوں کو اور ڈاکٹروں کو آپ یہ آدیش کردیں کہ مجھے ہائی ڈوز دوا کی زیادہ ماترا دے دی جائے میں زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔

D.M. علی گڑھ چند بھوشن سنگھ نے بتایا کہ، ہاں نیرج جی کی ایک چٹھی سرکاری طور پر ڈاک سے ملی تھی جس میں انہوں نے اچھا مرتیو کی درخواست کی تھی، یہ کچھ روز پہلے کی بات ہے، یعنی انتقال سے کچھ روز پہلے۔

وہ خود کو ظاہر تو نہیں کرتے تھے نہ ہی مہا کوی مانتے تھے لیکن اپنی شخصیت کا اندازہ بخوبی انھیں بھی تھا۔

ہوئے ہیں جس طرح بدنام ہم زمانے میں
لگیں گی آپ کو صدیاں ہمیں بھلانے میں

یہ بات سچ ہے کہ بھلانے میں ان کو زمانے لگیں گے۔ نیرج اس صدی کے سب سے بڑے گیت کار تو نہیں لیکن بہت خوبصورت گیت ضرور لکھ گئے ہم یا کوئی بھی اس شاعر یا کوی کو بڑا کیسے مان سکتے ہیں جو اپنے اردگرد اور معاشرے پر نظر نہ رکھتا ہو لیکن ان کو بگڑے حالات اور گم ہوتی تہذیب بھی جگائے رکھتی تھی۔ ان کا یہ شعر انھیں حالات کی عکاسی کرتا ہے۔

اک مذہب دنیا میں ایسا بھی چلایا جائے
جس میں انسان کو انسان بنایا جائے

(نیرج)

وہ اپنے پیچھے غزلیں کویتاؤں اور فلمی گیتوں کا ایک بڑا سرمایہ دنیا کے لیے چھوڑ گئے اور اچھے اخلاق اور انسانیت بھی۔ ان کی کویتاؤں کے مجموعوں کے نام اس طرح ہیں۔

کارواں گزرتا گیا، کویتا کوش، سنگھرش، درد دیا، وہ گیت جو لکھے نہیں، آساوری، انتر دھونی، ندی کنارے، بادلوں سے سلام لیتا ہوں، تمھارے لیے، بادل برس گئے، وغیرہ۔

تن سے بھاری سانس ہے اسے سمجھ لو خوب
مردہ جل میں تیرتا ہے زندہ جاتا ڈوب

(نیرج)

نیرج کو فلمی گیتوں کی وجہ سے تین بار فلم فیئر اوارڈ دیا گیا اور ان کی غیر فلمی شاعری کے لیے ان کو یہ ایوارڈ بھی ملے۔ پدم شری 1991، یش بھارتی 1994 اور پدم بھوشن 2007۔ مجھے یہ لکھتے وقت ساحر لدھیانوی کا شعر یاد آتا ہے۔

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مرجانے سے انسان نہیں مرتا ہے

(ساحر)

واقعی کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں جو جسم کے مرجانے سے نہیں مرتے وہ زندہ رہتے ہیں اور لوگوں کے دل پر راج کرتے ہیں ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے گوپال داس نیرج بھی۔

■

Jamal Akhtar
Near Jamia Urdu Aigarh
Aligarh - 202001 (UP)

استعارہ اور سیاسی ذہن کی کشمکش

محمود شیخ

اگر میں یہ کہوں کہ 'اسمائے کل' کی ترقی یافتہ شکل استعارہ ہے، تو شاید غلط نہ ہوگا۔ چونکہ اسمائے کل کی تعلیم اللہ نے خود انسان کو عطا کی ہے، اور تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اس لیے دنیا کی تمام زبانیں اور تمام استعارے ذہنِ انسانی کی پیداوار نہیں ہیں۔ انسان کو حواسِ خمسہ کا فطری علم قدرت کی عطا کردہ نعمت کی طرح زبان و بیان کا علم بھی انسانی سرشت میں پیدائشی طور پر موجود ہوتا ہے اور انسانی وجود میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ قومیں جدا ہوسکتی ہیں مگر ان کا فطری تفہیمی شعور متوازن اور معین ہوتا ہے۔ اس لیے زبان کے اختلاف کے باوجود جذبہ و احساس کے بیان میں فرق واقع نہیں ہوتا۔ قوت و طاقت، جدوجہد اور کائنات کی تمام اشیا کے اوصاف ہیئت و ہیبت سے متاثر ہونے کی فطری صلاحیت انسان کو قدرتی طور پر ودیعت کی گئی ہے۔ اگر آسمان نہ ہوتا تو آواز بھی نہ ہوتی اور آواز نہ ہوتی تو الفاظ بھی نہ ہوتے۔ آواز کی دلکشی، چہرے کی خوبصورتی اور جسم کی نزاکت سے محظوظ ہونے کی صلاحیت بھی قدرت کی عطا کردہ نعمت ہے۔ آواز، الفاظ، خوبصورتی اور نزاکت غرض یہ کہ دنیا کی کوئی شے انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے۔ گندم کا ایک دانہ بھی وہ تشکیل نہیں دے سکتا۔ عقل اور مشین کتنی بھی مستحکم کیوں نہ ہوں خاک کا ایک ذرّہ ناچیز بھی پیدا کرنے کی صلاحیت ان میں نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل ایک سویا ہوا آرگن ہے۔ اگر قوتِ احساس نہ ہو تو عقل کا بیدار ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔ حواسِ خمسہ کے ذریعے جو تجربات انسان کو حاصل ہوتے ہیں وہ انھیں اپنی یادداشت کے نہاں خانوں میں محفوظ کرلیتا ہے۔ پھر انھیں بروئے کار لاکر سماج میں عالم و دانا کی حیثیت سے متعارف ہوتا ہے۔

مغربی مفکرین حواسِ خمسہ کی ظاہری حقیقت سے واقف ہیں لیکن باطنی قوتوں کا کوئی بیان ان کی تحریر میں نظر نہیں آتا۔ حس مشترک، قوتِ متخیلہ، قوتِ متصرفہ، قوتِ واہمہ اور قوتِ حافظہ کا تصور صرف مشرقی فن اور فلسفہ کی پیداوار ہے۔ چونکہ قوتِ واہمہ کو دماغی قوتوں میں مرکزیت حاصل ہے۔ لہٰذا قوتِ متخیلہ محفوظ صورتوں کو قوتِ واہمہ کے سامنے پیش کرتی ہے تاکہ وہ صورتوں میں معنی کا ادراک کرسکے اور جب معانی کا ادراک ہوتا ہے تو اسے قوتِ حافظہ کے ذریعے انسان یاد کرلیتا ہے۔ مہاتمابدھ کے مطابق تخیل کی کوئی تعبیر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے جب افعالِ حسیہ میں سے کوئی فعل انجام دیا جاتا ہے تو تصور کا ارتسام ہوتا ہے جس کے ذریعے خیال کو مزین کیا جاتا ہے۔

حواسِ خمسہ کی مزید تشریح کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''روحیں جن جسموں میں قابض ہوتی ہیں۔ وہ پھیلتی ہیں اور سکڑتی ہیں اور ایسی کیفیت ہر زمان میں ہوتی ہے۔ جینیوں کے نزدیک روح تمام جسم میں نفوذ رکھتی ہے اور وہ اس میں رہتی ہے۔ وہ سر کے بال سے پیر کے ناخن تک پھیلی ہوئی ہے۔ جب کسی احساس کا سبب

پیدا ہوتو وہ فوراً محسوس کرتی ہے۔جس طرح روح جسم پر قبضہ کرتی ہے اس کی تشریح ہے کہ وہ چراغ کی طرح ہے جو سارے جسم کو روشن کرتا ہے۔ گو خود ایک کونے میں رکھا ہوا ہے۔ جیو کی جینی تقسیم کی تعداد حسی آلات پر مبنی ہے۔ ادنیٰ ترین طبقہ نباتات کا ہے۔ جو لمس کا حسی آلہ رکھتا ہے۔ اس سے اعلیٰ طبقہ کیڑوں کا ہے جو لمس اور ذائقہ کے حسی آلات رکھتے ہیں۔ پھر چیونٹیوں کا طبقہ ہے جو لمس، ذائقہ اور شامہ رکھتی ہیں۔ ان سے اعلیٰ طبقہ شہد کی مکھیوں کا ہے جو علاوہ لمس و ذائقہ و شامہ کے بصری آلۂ حس بھی رکھتی ہیں۔ ان سے اوپر ریڑھ دار جانور ہیں جن کے پاس حواس کے پانچ آلات ہیں۔ ان سے اعلیٰ طبقہ میں انسان، دوزخ کے دوزخی اور دیوتا ہیں جو علاوہ ان آلات کے باطنی حسی آلہ یعنی من رکھنے والے ہیں جس کے اثر سے وہ ناطق کہلاتے ہیں۔''

(تاریخ ہندی فلسفہ، ایس این داس گپتا، ص 232)

من یا دِل کی بابت حضرت داتا گنج بخش لاہوری فرماتے ہیں:

''عام لوگ گوشت کے لوتھڑے کو دل کہتے ہیں۔ وہ تو پاگلوں، دیوانوں اور بچوں میں بھی ہوتا ہے۔ اگر وہ دل نہیں ہے تو پھر دل ہے کیا؟ اگر عقل کو دل کہیں تو وہ بھی دل نہیں ہے۔ اگر روح کو دل کہیں تو وہ بھی دل نہیں ہے۔ اگر علم کو دل کہیں تو وہ بھی نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ شواہد حق کا قیام جس دل سے کیا جاتا ہے وہ لفظ و بیان میں تو ہے لیکن ظاہر میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔''

(کشف المحجوب، ص 217)

دولت اور شہرت نااہل کو بھی اہل بنا دیتی ہے۔ مغربی دانشور کسی باطنی قوت کے قائل نہیں۔ وہ صرف مادّہ اور نفس کے مقلد ہوتے ہیں، اور اسی بنیاد پر غور وفکر کرتے

''عام لوگ گوشت کے لوتھڑے کو دل کہتے ہیں۔ وہ تو پاگلوں، دیوانوں اور بچوں میں بھی ہوتا ہے۔ اگر وہ دل نہیں ہے تو پھر دل ہے کیا؟ اگر عقل کو دل کہیں تو وہ بھی دل نہیں ہے۔ اگر روح کو دل کہیں تو وہ بھی دل نہیں ہے۔ اگر علم کو دل کہیں تو وہ بھی نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ شواہد حق کا قیام جس دل سے کیا جاتا ہے وہ لفظ و بیان میں تو ہے لیکن ظاہر میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔''

ہیں مگر صالح ذہن افراد حق وصداقت کی بنیاد پر معاملاتِ زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں۔ مغربی مفکرین یا تو مشرقی استعاراتی زبان سے ناواقف ہیں یا انھیں ادب وفن کی سمجھ نہیں ہے۔ رولاں بارتھ (Roland Barthe) کا خیال ہے، لفظ کا ایک معنی ہوتا ہے لیکن یہ اصول شک و شبہ پیدا کرتا ہے اس کی وجہ استعاراتی زبان ہے، رولاں بارتھ سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ استعارہ ایک وسیع المعانی لفظ ہے۔ دراصل مغرب ایک ایسے فوبیا (Phobia) میں گرفتار ہے جس کے دباؤ نے اس کی شخصیت کو Disorder کردیا ہے، اور ایک غیر مستقیم شخصیت (Neuratic personality) ابھر آئی ہے۔ جس نے دانشور، فلسفی اور فنکار میں تحفظ کا زبردست فقدان پیدا کردیا ہے۔ اپنے اس احساس پر غالب آنے کے لیے اس نے اپنی غیر اخلاقی سرگرمیوں کو تعمیریت کا نام دے کر تمام دنیا کو متوجہ کیا ہے۔ تقلید مغرب کے جوش میں مشرقی دانشور سائنس وٹکنالوجی، اور سیاست ومعیشت کے نفسیاتی شعور کو معاملاتِ زندگی اور ادب وفن کے فطری نہج پر منطبق کرنے کا جواز تلاش کرتے ہیں۔ مختلف یونیورسٹیز کے اساتذہ اور یورپ کے نظریہ ساز افراد ایسے مباحث کی تلاش میں ہمہ وقت مشغول رہتے ہیں جن کا ماحصل مشرقی تہذیب وثقافت کی فطری، ایمائی اور مثبت قدروں کو کالعدم قرار دینا ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے میکانکی شعور کی برتری اور دانائی ثابت کرسکیں۔ استعارہ چونکہ علم الاسماء کی پیداوار ہے، لیکن انھیں معلوم ہی نہیں کہ 'علم الاسماء' ہے کیا؟ اس لیے وہ مردہ اور زندہ استعارہ کی بحث قائم کرتے ہیں۔ اس کی اہم وجہ صرف یہی ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ علم زبان و بیان، ذہن انسانی کی ایجاد ہے۔ لہٰذا جمہوری آزادی کے زعم میں وہ کسی بھی فطری اور قدرتی علم وعمل کو متروک قرار دے کر اس کی اہمیت و افادیت پر سوال کھڑا کردیتے ہیں۔ حالانکہ سیاست و سائنس فن کا حصہ ہوسکتی ہیں مگر فن بذات خود سائنس نہیں ہے۔ فنکار کو کسی مدرسہ یا معلم کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ صرف علم زبان کا مطالعہ اور مشاہدۂ قدرت کا شعور کافی ہے۔ تلسی داس، اور کبیر کسی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل نہیں تھے سیاست وسائنس کا دائرۂ کار مخصوص ہوتا ہے مگر فن کا دائرہ کار مخصوص نہیں ہے۔ فن معاملاتِ زندگی کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کرتا ہے۔ یہی خوبی اسے سیاست و سائنس اور معاشیاتی نقد ونظر پر برتری عطا کرتی ہے۔ انسانی افعال کا تجزیہ سائنسی اور میکانکی طور پر کیا جاسکتا ہے لیکن معاشرہ، انسان اور فن میکانکی نقد ونظر کے پابند نہیں

استعارہ کسی وحدتِ عمل کا شاخسانہ نہیں بلکہ انسان کی اجتماعی ضرورتوں کا ترجمان ہے۔ استعارہ کی پشت پر تاریخی شواہد اور تخلیقی شعور کی ایک مکمل داستانِ حیات پوشیدہ ہوتی ہے جس میں تمام علوم و فنون کا تفہیمی شعور شامل ہوتا ہے۔ مشرق میں استعاراتی اسلوب و بیان کی تفہیم، الوہی تصوراتِ ادب کے یقین و اعتماد پر قائم ہے۔ قانون قدرت کے آگے اور قسمت کے سامنے انسان مجبورِ محض ہے۔

ہیں۔ اسی طرح تہذیب وثقافت میکانکی ذہن اور میکانکی ادوار کی پیداوار بھی نہیں ہے۔ فن کوئی جامد شے بھی نہیں بلکہ فطرت انسانی اور جذبہ و احساس کا ترجمان ہے۔ سیاست وسائنس کی زبان فطری جذبہ واحساس کے مرتب کردہ استعاراتی اسلوب و بیان کی ترجمان نہیں ہوسکتی۔ وجہ یہ کہ سائنس، عناصر میں ظہور ترتیب تلاش کرتی ہے اور سیات ومعیشت اس ترتیب سے کاروباری توازن و استحکام حاصل کرنے کے لیے نظریاتِ فن وضع کرتی ہے۔ سیاست وسائنس ومعیشت کا ضابطۂ عمل ایک دائرۂ کار میں محبوس ہوتا ہے مگر فن ضابطۂ اخلاق کے سوا تمام پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔

استعارہ کسی وحدتِ عمل کا شاخسانہ نہیں بلکہ انسان کی اجتماعی ضرورتوں کا ترجمان ہے۔ استعارہ کی پشت پر تاریخی شواہد اور تخلیقی شعور کی ایک مکمل داستانِ حیات پوشیدہ ہوتی ہے جس میں تمام علوم وفنون کا تفہیمی شعور شامل ہوتا ہے۔ مشرق میں استعاراتی اسلوب و بیان کی تفہیم، الوہی تصوراتِ ادب کے یقین و اعتماد پر قائم ہے۔ قانون قدرت کے آگے اور قسمت کے سامنے انسان مجبورِ محض ہے۔ اس حقیقت کو 'نیائے منجری' میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''جس طرح کمہار واقف ہے کہ گھڑے کی تمام غایت کیا ہے۔ جس کو وہ بناتا ہے۔ اسی طرح ایشور عالم کی تمام غایات سے واقف ہے۔ پس وہ ہمہ بیں ہے۔ وہ ہمیشہ سے تمام اشیا سے واقف ہے۔ اس کو یار کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی باطنی حس (من وغیرہ) کی مداخلت کے بغیر تمام اشیا کا راست ادراک کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ سرور

ہے۔ اس کا ارادہ ازلی ہے اور انسانوں کے کرم کے مطابق وہی ارادۂ موت کو پیدا کرتا ہے۔ عالم کو پیدا کرتا ہے اور اس طرح حفاظت کرتا ہے کہ ہر ایک انسان اپنے اعمال کے نتیجے حاصل کرے۔ چونکہ ہماری ذات جو خود بےجسم ہے۔ اس کی مرضی سے ہمارے جسم میں تغیرات کرتی ہے اور اس کے ذریعے خارجی عالم میں تغیر ہوتا ہے۔ پس ایشور اپنے ارادے سے عالم کو پیدا کرتا ہے اگرچہ اس کا جسم نہیں ہے۔ بہرحال بعض کا خیال ہے کہ اگر جسم کا تلازم ایشور کے ساتھ لازمی ہے اس لیے کہ ہم اس کو تصور کرسکیں تو سالمات کو اس کا جسم متصور کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح ہماری ذات کے ارادے سے جسم میں حرکت وتغیر ہوتا ہے یونہی اس کے ارادے سے سالمات میں تغیرات اور حرکات پیدا کیے جاتے ہیں۔

(تاریخ ہندی فلسفہ ایس این داس گپتا، ص 434)

عقل کو جذبہ کا متبادل قرار دینا تو آسان ہے مگر اس میں جذبہ کی خصوصیات کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ جسے حقیقت پسند دانشوروں نے جنس زدہ ذہنیت کا ترجمان بنا کر پیش کیا ہے۔ انسان سے انسان کی محبت کا بیان دورِ گزشتہ کی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ مرد و زن کے درمیان پرخلوص جذبوں کا بیان تخلیقِ فن کی ضرورت نہیں رہی۔ مغرب میں بہت بڑے بڑے ناول نگار اور افسانہ نگار پیدا ہوئے مگر کسی نے انسانی جذبوں کی بےلوث ترجمانی کا حق ادا نہیں کیا۔ مغربی فن و فلسفہ زبان و بیان کی تخلیقی امیجری سے تہی دست ہے۔ وجہ یہ کہ مغرب نے زبان و بیان کی تعمیر اور تہذیب و ثقافت کی تشکیل میں کوئی نمایاں کردار ادا نہیں کیا ہے۔ فطری جذبات واحساسات کے بیان میں بھی اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی اور مساوات کے سیاسی اور غیر جذباتی تصورات نے دانشوروں کو زبان و بیان کے تمام تخلیقی عوامل کو مسدود و محدود کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن اور دیگر تمام رشتے استعارہ ہیں۔ اگر استعارہ کو جدا کردیا جائے تو ماں ایک عورت اور باپ ایک مرد ہی رہ جائے گا۔ رشتے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ انھیں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے ذریعے بھی رشتوں میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔

مغربی دانشور اپنی اس انانیت پسند ذہنیت کو Live in relationship اور Contract marriage مفروضات کے ذریعے مستند ثابت کرنا چاہتے ہیں پھر بھی بات ہے کہ بنتی نہیں۔

ایک عورت کسی مرد کے ساتھ جنسی رشتہ استوار کرتی ہے اور کسی بچہ کو جنم دے کر 'ماں' کا منصب حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ مشرق میں مرد وزن کے جنسی رشتے کسی سماجی ضابطہ کے تحت ہی استوار کیے جاسکتے ہیں۔ شادی بیاہ کا عمل بھی ایک مخصوص ضابطہ کے تحت وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ماں باپ کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے سماجی ضابطوں کو پورا کرنا ضروری ہے۔ اس طرح نہ صرف سماجی ضابطے بلکہ استعارہ، تشبیہ اور دیگر اصول زبان بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اب ذرا Solo living مفروضے پر غور کیا جائے۔ تنہا مرد اور تنہا عورت ہی نہیں تنہا فنکار بھی کیا سماجی تشکیل میں کوئی مثبت کردار ادا کرسکتے ہیں؟ سماجی اجتماعیت کے بغیر تخلیق فن کیا ممکن ہے؟ اس طرح سماجی ضابطے ٹوٹتے رہتے ہیں جس سے زبان و بیان کا فطری ڈسکورس (Discourse) کا مثبت اور فطری تصورِ زندگی مجروح ہوتا ہے۔

عقل کو جذبه کا متبادل قرار دینا تو آسان هے مگر اس میں جذبه کی خصوصیات کا پیدا هونا ناممکن هے۔ محبت ایک فطری جذبه هے۔ جسے حقیقت پسند دانشوروں نے جنس زده ذهنیت کا ترجمان بنا کرپیش کیا هے۔ انسان سے انسان کی محبت کا بیان دورِ گزشته کی یادگار سمجھا جاتا هے۔ مرد و زن کے درمیان پرخلوص جذبوں کا بیان تخلیقِ فن کی ضرورت نهیں رهی۔ مغرب میں بهت بڑے بڑے ناول نگار اور افسانه نگار پیدا هوئے مگر کسی نے انسانی جذبوں کی بے لوث ترجمانی کا حق ادا نهیں کیا۔ مغربی فن و فلسفه زبان و بیان کی تخلیقی امیجری سے تهی دست هے۔ وجه یه که مغرب نے زبان و بیان کی تعمیر اور تهذیب و ثقافت کی تشکیل میں کوئی نمایاں کردار ادا نهیں کیا هے۔

حالانکہ استعارہ کے بغیر تحریر میں لطیف بیان کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی بعض ناقدین مردہ استعارہ کی تاویل کو درست ثابت کرنے کے لیے بے سروپا دلیلیں پیش کرتے ہیں جن کی نہ کوئی عقلی حقیقت ہے نہ جذباتی۔ اس ضمن میں اردو ادب کے بعض بہت معتبر ناقدین کا نام لیا جاتا ہے۔ کسی کو شکایت ہے استعارہ اپنی حقیقت گنوا کر محاورہ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ حالانکہ استعارہ کا محاورہ میں تبدیل ہونا اس کی کمزوری نہیں وسعتِ بیانی کی دلیل ہے۔ کوئی اسے شعوری کاوش قرار دیتا ہے۔ شعور و لاشعور کی بحث سے اجتناب کرتے ہوئے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
عشق ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

یہ درست ہے کہ استعارہ کے لیے مشبہ اور مشبہ بہ کی شرط ضروری ہے۔ لیکن استعارہ کی دوسری اور اہم خوبی جو صرف مشرقی شاعری کا وصفِ خاص ہے، وہ یہ کہ ہزاروں اشعار ایسے ہیں کہ جن کے دونوں مصرعے لاشعوری تصورات سے مزین ہوتے ہیں۔ نہ تو کسی نے دل کو جان سے اٹھتے ہوئے دیکھا ہے اور نہ وہ دھواں ہی دیکھا ہے جو دل سے اٹھتا ہے اور نہ وہ نقشِ ناتمام دیکھے ہیں جنھیں خونِ جگر کی ضرورت ہے اور نہ وہ عشق ہی سے واقف ہیں جسے سودائے خام کہا گیا ہے۔ اس کے باوجود دونوں اشعار جذبے کی صداقت، لہجے کی سادگی اور بیان کی شدت سے اس قدر معمور ہیں کہ مفہوم کی صراحت کے بغیر بھی دل انسانی کو مسحور کرلیتے ہیں جیسے کوئی شیر خوار بچہ انسان کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ وہی سادگی اور سچائی مذکورہ اشعار کا امتیازی وصف ہے۔

نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

نقش فریادی ہے، کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکر تصویر کا

میر و غالب و اقبال کے بیشتر اشعار استعاراتی اسلوب و بیان کی اعلیٰ سطح پر قائم ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لاشعور کی اندھی گہرائیوں میں کیسے کیسے درِ بے بہا پوشیدہ ہوتے ہیں کہ جنھیں مشاہدہ کی دوربیں نظریں بھی دیکھنے سے قاصر ہیں۔ اس حقیقت کو سگمنڈ فرائڈ کے نفسیاتی فلسفہ کی روشنی میں سمجھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ ننگی آنکھوں سے سورج کی کرنوں کا مشاہدہ کرنا۔ جو لوگ عینی شواہد کو استعارہ کے لیے لازمی سمجھتے ہیں انھیں میر و غالب و اقبال کے اشعار کی تفہیم تک پہنچنا انتہائی مشکل ہے۔

یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

''حافظ کے یہاں سرخ شیر، کالا ناگ، سفید باز اور حضرت سیمرغ کے استعاروں کا اچھوتا پن، ان کی قوت وتوانائی اور تازگی ہمیں متحیر اور ہکا بکا کردیتی ہے۔ ان کی تخیلی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے عقلی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی منطق باز حافظ سے پوچھے آپ سرخ شیر، کالا ناگ اور سفید باز کیسے بن گئے تو وہ اس سوال کا جواب خاموشی سے دے گا کیونکہ بد ذوقوں کو اسی طرح جواب دیا جاتا ہے۔ اس کی خاموشی ہزار منطق وتکلم

جب فنکار کے تحت الشعور کی دیگ میں جذبے کی گرمی سے ابال اٹھتا ہے تو جو تخیلی پیکر اس کے جھاگ کے ساتھ باہر نکل پڑتے ہیں وہ شعور میں آکر استعارے بن جاتے ہیں۔ شعرا انہیں اپنے شعور و احساس کا جز بنا کر لفظوں کا جامہ زیب تن کراتا ہے۔ حافظ کے استعاروں کی تہہ میں تحت الشعور کی شدید ریاضت تھی کہ اس کے بغیر وہ ان میں ہیئت و اسلوب کی تازگی نہیں پیدا کرسکتا تھا۔ ان میں فنی اعتبار سے کوئی کور کسر باقی نہیں اور ان کی یقیں آفرین تاثیر ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ ان کی صداقت کے متعلق ہمارے دل میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا۔ ان استعاروں سے کلام کا اصلی مقصد حاصل ہوجاتا ہے یعنی تاثیر۔'

پر بھاری ہے۔ دراصل اس کے استعاروں کی صداقت ان کی تاثیر میں پوشیدہ ہے۔ وہ اپنی دلیل خود آپ ہیں۔ ان سے ہمیں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے نفس میں پراسرار انکشاف ہوگیا ہو جو یقین آفرین ہے۔ استعارے کا یہ بڑا وصف ہے کہ وہ ہمیں استدلال کی تفصیل سے بے نیاز کردیتا ہے اور بغیر کسی واسطے کے ہمیں حق الیقین کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ جب فنکار کے تحت الشعور کی دیگ میں جذبے کی گرمی سے ابال اٹھتا ہے تو جو تخیلی پیکر اس کے جھاگ کے ساتھ باہر نکل پڑتے ہیں وہ شعور میں آکر استعارے بن جاتے ہیں۔ شعرا انھیں اپنے شعور و احساس کا جز بنا کر لفظوں کا جامہ زیب تن کراتا ہے۔ حافظ کے استعاروں کی تہہ میں تحت الشعور کی شدید ریاضت تھی کہ اس کے بغیر وہ ان میں ہیئت و اسلوب کی تازگی نہیں پیدا کرسکتا تھا۔ ان میں فنی اعتبار سے کوئی کور کسر باقی نہیں اوران کی یقیں آفرین تاثیر ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ ان کی صداقت کے متعلق ہمارے دل میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا۔ ان استعاروں سے کلام کا اصلی مقصد حاصل ہوجاتا ہے یعنی تاثیر۔'' (حافظ اور اقبال، ص 277)

حالانکہ گفتگو ذرا طویل ہوجائے گی مگر ایک اقتباس پیش کرنا ضروری ہے تاکہ مضمون میں رقم کیے گئے خیالات مزید واضح ہوسکیں:

''گوئٹے نے اس کی (حافظ) کی غزلوں کا ترجمہ پڑھ کر اس کی فنی گہرائی اور گیرائی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ اس نے حافظ کے استعاروں، علامتوں اور پیکروں کو اپنے کلام میں سمونے کی پوری کوشش کی۔ اس کے توسط سے یورپ کے ہر ملک میں رومانیت کی تحریک میں کسی نہ کسی حیثیت سے حافظ کے اثر کی کارفرمائی ہوئی۔ مختلف زبانوں میں حافظ کے استعارے، علامتوں اور تجلی پیکروں کے سانچے بدلتے رہے۔ حافظ کا اثر جرمن رومانیت پر سب سے زیادہ پڑا اور اس کے بعد انگریزی زبان کی رومانی تحریک پر۔''

(یوسف حسین خاں، حافظ اور اقبال، ص 335)

موسیقی اور مصوری کا فن جذبہ ہے، زبان نہیں...
اگر استعارہ مردنی کا شکار ہے تو موسیقی اور مصوری کا فن کیوں زوال پذیر ہے؟ یہاں تو استعارہ کی حکومت بھی نہیں ہے۔ زبان کے بغیر بھی موسیقی اور مصوری کا لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ مغربی اور امریکی دانشور ادب وفن کے زوال کے اسباب پر کبھی غور وفکر نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانیں اور فن کی تمام ایمائی قوتیں مصنوعی حقیقت پسندانہ شعور کی نذر کردی گئی ہیں۔ بعض ناقدین ادب کا خیال ہے، آئندہ صرف تجارتی زبانیں ہی زندہ رہیں گی۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا یہاں بھی استعارہ کی قوتِ بیانی بے زبانی کا شکار ہوگئی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دنیا ایک بازار کی طرح اپنے وجود پر نوحہ کناں ہے۔ سائنس کی زبان اور فارمولے ہوں یا پھر سیاست ومعیشت کا بیانیہ کسی کو ادبی اور فنی زبان کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہاں صرف خرید وفروخت کی

ہمارے یہاں استعارہ کی موت نہ صرف زبان و بیان بلکہ تہذیب و ثقافت کی موت ثابت ہوگی کیونکہ ہمارا کچھ بھی اندھے یگ (Dark Age) میں دفن نہیں ہے۔ ہم لوگ اپنے ماضی سے سبق لے کر آگے بڑھنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمارا کوئی بھی استعارہ پرانا نہیں ہوتا۔ رائیڈر ہیگرڈ کی ہیروئن 'ایشا' کی طرح تجربہ کی آگ میں غسل کرنے کے بعد بھی ہمیشہ جوان رہتا ہے۔

زبان اور جذباتِ انسانی کو استعمال کرنا آنا چاہیے۔ تمام درسیاتِ کتب میں موضوع کی مناسبت سے زبان و بیان کے اصول وضابطوں کی پابندی کی جاتی ہے۔ شاعر اور ادیب کی زبان سائنسی نظریات کی وضاحت اور سیاسی معیشت کا کاروباری سودا کرنے سے قاصر ہے۔ اساتذہ اور ناقدینِ ادب اسے زبان کی ایک کمزوری سمجھتے ہیں اور ادبی اور فنی زبان کی کاروباری حیثیت تلاش کرتے ہیں تاکہ صارفی سماج کی مادّیاتی ضرورتوں کی تکمیل میں زبان کو ایک آرگن کی طرح استعمال کیا جاسکے۔ لہٰذا زبان میں کاروباری الفاظ کی شمولیت کے لیے روایتی استعاراتی اسلوب و بیان میں تنسیخ وترمیم کرنا ضروری ہے۔

اردو شاعری میں ہزاروں اشعار ایسے ہیں کہ جنھیں استعاراتی اسلوب و بیان کی فطری اور جذباتی سمجھ کے بغیر سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ مغرب میں شاعری کا یہ طرزِ تکلم ناپید ہے۔ لہٰذا وہاں استعارہ کی موت کا اعلان کیا جاسکتا ہے لیکن مشرق میں استعارہ اس قدر پاورفل ہے کہ اس کی رفاقت کے بغیر زبان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے یہاں استعارہ کی موت نہ صرف زبان و بیان بلکہ تہذیب وثقافت کی موت ثابت ہوگی کیونکہ ہمارا کچھ بھی اندھے یگ (Dark Age) میں دفن نہیں ہے۔ ہم لوگ اپنے ماضی سے سبق لے کر آگے بڑھنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمارا کوئی بھی استعارہ پرانا نہیں ہوتا۔ رائیڈر ہیگرڈ کی ہیروئن 'ایشا' کی طرح تجربہ کی آگ میں غسل کرنے کے بعد بھی ہمیشہ جوان رہتا ہے۔

ہم جنسی، معاہدہ کی شادی اور سروگیٹ مدر وغیرہ کے تصورات سے پیدا ہونے والے سماجی مسائل کی ترجمانی کے لیے ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جو جذباتی اور اخلاقی صداقتوں کی کمی کو پورا کرسکے اور مرد و زن کے جنسی رشتوں کو سماجی اور سیاسی اعتبار حاصل ہوسکے۔ چونکہ عورت اور مرد کا جنسی رشتہ سماجی اعتبار کے بغیر ناپسندیدہ قرار دیا جاتا ہے اس لیے Solo Living کا ایک نیا مفروضہ وضع کرلیا گیا ہے۔ اور زبان وادب کو کچھ ایسے جدید موضوعات فراہم کیے گیے ہیں جن سے زبان و بیان کی روایتی تفہیم کو نشانہ بنا کر زبان کی قدر و منزلت کو کم کیا جاسکے۔ جس کا ایک نمونہ استعارہ کی موت بھی ہے۔

■

Dr. Mehmood Shaikh
292, Naya Mohalla, Mirza Ghalib Marg
Jabalpur - 482002 (MP)

باندہ اور غالب

داؤد احمد

شہر باندہ صوبہ اتر پردیش کے جنوب میں واقع خطۂ بندیل کھنڈ میں باندہ ضلع کا صدر مقام ہے۔اس کے شمال میں دریائے جمنا،مشرق میں الہ آباد کا ضلع،جنوب میں بندھیاچل پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ موجودہ مدھیہ پردیش کا علاقہ، مغرب میں دریائے کین اور ہمیر پور کا ضلع واقع ہے۔یہ شہر قدیم قومی شاہراہ گرانڈ ٹرنک روڈ سے کافی دور اور بندیل کھنڈ کے اندرونی حصے میں ہے۔ اس وجہ سے یہ ضلع تمام سمتوں سے کٹ کر گمنام سا ہو گیا تھا۔ ایسے علاقے میں اردو زبان کے تذکرے اور مرزا غالب کی یہاں آمد کو ایک تعجب خیز واقعہ شمار کیا جا سکتا ہے۔

اردو اور فارسی کے مشہور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی باندہ (بندیل کھنڈ) میں آمد اور یہاں کچھ عرصہ قیام اور واپسی، گو کوئی تاریخ ساز واقعہ نہیں ہے لیکن غالب جیسے شاعر کا باندہ (بندیل کھنڈ) کے انتہائی پسماندہ اور گمنام علاقے میں تشریف لانا اپنے آپ میں ایک خصوصیت کا حامل واقعہ تو ہے ہی جس سے یہ اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ اس خطۂ تاریک میں یقینی طور پر غالب کو سمجھنے والے اور قدرداں موجود تھے۔شہر باندہ بندیل کھنڈ کا انتہائی پس ماندہ علاقہ تھا۔نواب علی بہادر اول نے اس علاقہ کو اپنے زور بازو سے فتح کر کے پونا کی پیشوا سرکار کے زیر نگیں کر دیا تھا۔ باندہ میں نواب کے مستقل قیام کی بنا پر یہاں مراٹھے،موپلے،جنوبی اور شمالی ہندوستان کے لوگوں کی آمد و قیام کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ علاقہ ایک مشترکہ تہذیب کا اور اردو زبان کا مرکز بننا شروع ہو گیا تھا۔لیکن تیرہ چودہ سال کے بعد انگریزوں کی آمد سے یہاں نوابی کا خاتمہ ہو گیا۔

نواب علی بہادر اول کے صاحبزادے نواب ذوالفقار علی بہادر مرزا غالب کی سگی ممانی کی بہن سے پیدا تھے۔ وہ اردو زبان کے سرپرست اور اہل علم کے قدر داں تھے۔اسی لیے اطراف و جوانب کے خلفشار سے منتشر ہونے والے اہل علم کے قافلے باندہ آ کر پناہ گزیں ہونے لگے۔جن کی وجہ سے اردو زبان و ادب کا پودا یہاں پھلنے پھولنے لگا۔سعادت یار خاں رنگین بھی ان ہی کے عہد میں 1243 ہجری میں بھرت پور سے واپسی پر باندہ آئے اور یہاں 5-6 سال قیام کیا۔نواب صاحب کی فرمائش پر ایک مثنوی 'جنگ نامہ' 1244 ہجری میں لکھی۔ رنگین بہت قابل شخص تھے۔انھیں سترہ ملکی و غیر ملکی زبانوں پر عبور حاصل تھا اور انھوں نے ہر زبان میں شاعری کی۔ یہ بہت جدت پسند شاعر تھے۔ 1247 ھجری میں ایک رسالہ بھی لکھا جس میں سات قسم کے اسلحہ جات کا ذکر کیا۔ان کے ہاتھ کے لکھے مسودے اور مخطوطات انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں۔باندہ میں یہ شمشیر خاں کے مکان میں مقیم رہے۔باندہ آنے سے پیشتر یہ کچھ روز گوالیار خاں مادھو جی رئیس گوالیار کے یہاں بھی رہے تھے۔ ان کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔رنگین چونکہ گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے اور نواب موصوف کو گھوڑے پالنے کا شوق تھا۔اس لیے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ 1243 ھجری سے قبل بھی باندہ آتے رہے ہوں گے اور اس درمیان ان کے تعلقات نواب موصوف کے مصاحب خاص شمشیر خاں سے قائم ہوئے ہوں گے کیونکہ رنگین نے اپنا پہلا دیوان ریختہ (انڈیا آفس لائبریری) دوبارہ 9 ربیع الثانی 1229 ھجری (1812) میں باندہ میں قیام کے دوران نقل کیا تھا۔اس کے علاوہ رنگین نے خود لکھا ہے۔

باندہ شہر میں جو میں ہوں آیا
مجھے شمشیر خاں نے ہے بلایا

اس طرح تقریباً 23 مسودوں کی ترتیب و کتابت اور تصنیف بھی رنگین نے باندہ میں 1827 سے 1834 کے قیام کے دوران کی جو اسی وقت ممکن تھا کہ جب مصنف کو ہر طرح کا سکون اور آزادی میسر ہو اور اس کی کاوشوں کے قدرداں بھی آس پاس سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی خاطر موجود ہوں اور یہ دونوں چیزیں باندہ میں رہ کر رنگین کو بخوبی میسر تھیں۔ رنگین بہت آزاد منش انسان تھے اور کہیں مستقل قیام ذرا مشکل سے کرتے تھے لیکن نواب موصوف کے مصاحب خاص شمشیر خاں کی دوستی و محبت اور نواب صاحب کی سرپرستی نے انھیں باندہ میں ادبی کاموں میں لگائے رکھا۔رنگین خود راوی ہیں۔

میں اک جا دل کو لگاتا نہیں
مجھے رہنا اک جا کا بھاتا نہیں

چلا ہاتھ سے ہے مرا بس گیا
برس دو سے اس جا پہ پابند ہوں

منیر شکوہ آبادی کا تذکرہ بھی یہاں مناسب ہوگا جو تقریباً 1848 میں باندہ تشریف لائے۔ان کو باندہ لانے والے نواب ذوالفقارعلی بہادر کے صاحبزادے اور ولی عہد علی بہادر ثانی تھے۔ان کے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے کہ کانپور کی کسی محفل میں علی بہادر نے منیر شکوہ آبادی کے کلام سے متاثر ہوکر انھیں اپنا استاد بنا لیا تھا۔منیر شکوہ آبادی نے 1848 میں باندہ میں اپنے مختصر قیام کے دوران اپنا دیوان اول 'منتخب العالم' مرتب کیا تھا ساتھ ہی ایک تاریخی قطعہ 'شہر چارہ گراں' کو بھی ترتیب دیا تھا۔منیر شکوہ آبادی نا معلوم وجوہات کی بنا پر زیادہ عرصہ باندہ میں قیام نہ کر کے واپس فرخ آباد چلے جاتے ہیں۔لیکن ان کا تعلق نواب موصوف سے قائم رہتا ہے۔منیر شکوہ آبادی کی تحریک پر نواب موصوف ایک عشقیہ مثنوی 'مہروماہ' تالیف کرتے ہیں۔

نواب شمشیر بہادر کے انتقال 24/ 1823 کے بعد نواب ذوالفقارعلی بہادر مسند نشین ہوئے۔جن کے عہد میں مرزا غالب 1827 میں باندہ تشریف لائے۔غالب کے باندہ آنے کی وجہ نواب ذوالفقارعلی بہادر کے خالہ زاد بھائی مرزا از بیگ کی یہاں موجودگی بھی تھی جو مرزا کے ہمشیر اور ممانی کے صاحبزادے تھے۔مرزا غالب کے سفر کلکتہ کے طویل ترین سفر کا دوسرا مرحلہ جو باندہ سے کلکتہ تک کے سفر پر محیط ہے واضح ہوکر سامنے آتا ہے۔اس کے علاوہ باندہ کے باسیوں نے مرزا کے ان گردش ایام میں انھیں کس قدر پیار و محبت دی یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے۔ورنہ مرزا جو بیماری کی حالت میں بہت مجبور ہوکر سفر پر نکلے تھے اور اس وقت ان کے پاس راستے کے اخراجات کے نام پر کچھ بھی نہیں رہا تھا۔یقینی طور پر اس طویل سفر کو پورا نہ کر پاتے،یا تو وہ دہلی واپس ہوجاتے یا پھر در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے اور وہ اپنی منزل مقصود کلکتہ تک نہ پہنچ پاتے کیوں کہ لکھنؤ اور کلکتہ کے درمیان ان کی مدد کرنے والا کوئی اور نہ تھا۔

مزا غالب نواب ذوالفقارعلی بہادر کے متعلق دبی زبان سے فرماتے ہیں۔''میرے بزرگوں اور نواب ذوالفقار علی بہادر کے باہمی بہت پرانے تعلقات تھے۔خود میرے دل میں بھی نواب کے لیے حد درجہ محبت اور لگاؤ تھا،اس لیے جوں توں گرتا پڑتا (باندہ) بندیل کھنڈ پہنچ گیا''۔ [1] نواب ذوالفقارعلی بہادر کی عمر اس وقت محض 27 سال تھی کیوں کہ ان کی پیدائش 1800 کی ہے اور مزا غالب بقول مولانا حالی (یادگار غالب ص18) کچھ کم چالیس برس کے تھے۔

مرزا غالب کے متعلق تو یہ امر مصدقہ ہے کہ وہ 1827 میں جب لکھنؤ سے کلکتہ جانے کے لیے روانہ ہوئے تو کان پور پہنچ کر بیمار ہو گئے اور اسی بیماری کی حالت میں وہ باندہ آئے۔ بتاریخ بست وششم ذی قعدہ روز جمعہ ازاں ستم آباد برآمدم و بتاریخ بست ونہم در دارالسرور کان پور رسیدم۔ایں جا دوسہ مقام گزیدہ رہگرائے باندہ می شوم''۔[2] یہاں پر خدا کے فضل وکرم اور نواب ذوالفقارعلی بہادر کی ہمدردی، تیمار داری اور معالجہ سے بالکل صحت یاب ہوگئے۔مرزا غالب کا باندہ میں پانچ ماہ سے زائد قیام رہا۔بقول شیخ محمد اکرام' باندہ میں مرزا غالب کا قیام مولوی محمد علی خاں صدر امین کے مکان پر رہا'۔سعادت یار خاں رنگین نے باندہ میں سرپرستی پا کر اپنے 23 مسودوں کو ترتیب دیا تھا۔منیر شکوہ آبادی نے یہیں اپنا دیوان اول 'منتخب العالم' مرتب کیا تھا تو کیا مرزا غالب ایسے صاحب ذوق حضرات کی صحبت میں خاموش بیٹھے رہے ہوں گے۔محمد مشتاق شارق میرٹھی (مرحوم) اپنے مضمون 'غالب اور بندیل کھنڈ' میں یوں فرماتے ہیں۔''باندہ میں مرزا کو ایسا خوشگوار ماحول میسر آیا کہ انھوں نے کئی غزلیں کہیں۔ان غزلوں کی نشاندہی حافظ محمود شیرانی مرحوم کے مملوکہ دیوان اردو کے اس نسخے میں کی گئی ہے جو اب پنجاب یونیورسٹی لاہور کی ملکیت ہے۔ان غزلوں کے سامنے حاشیے پر''از باندہ فرسادہ'' لکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزلیں قیام باندہ کے نتائج فکر کا حاصل ہیں'' [3] یہاں کے قیام کے زمانہ میں مرزا نے جو غزلیں کہی ہیں وہ حافظ محمود خاں شیرانی کے قلمی نسخہ کے حاشیہ پر درج تھیں اب سب طبع ہوگئی ہیں۔ان کے مطلعے درج ذیل ہیں۔

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا
آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں تنگ پیراہن جو دامن میں نہیں
ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
غالب خدا کرے کہ سوار سمند ناز
دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

مرزا غالب باندہ سے روانہ ہوکر نواب کی جاگیر قصبہ مودھا گئے اور پھر وہاں سے چلہ تارہ گئے جہاں سے کشتی پر سوار ہوکر دریائے جمن کا سفر کرتے ہوئے الہ آباد و بنارس گئے اور پھر وہاں سے کلکتہ چلے گئے۔نواب ذوالفقارعلی بہادر مرزا غالب کی ممانی کی ہمشیرہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اس طرح قرابت داری بھی تھی۔جب مرزا کلکتہ کے لیے روانہ ہونے لگے تو نواب نے اپنی ضمانت پر سیٹھ امین چند سے مرزا کو دو ہزار روپیہ سفر خرچ کے لیے دلوایا۔مرزا نے ایک فارسی مدحیہ قطعہ نواب کے متعلق کہا ہے

نواب ذوالفقار بہادر کہ بودہ است
یاد نو در مصاف فلک ذوالفقار من
دانی کہ در فراق تو اے رشک مہر و ماہ
روزم سیہ تر است زشبہائے تار من

باندہ میں نواب ذوالفقارعلی بہادر کی فراخ حوصلگی، ذوق اور قدردانی کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر فن و ہنر کے واقف و ماہرین کو نواب نے بلوا کر باندہ میں آباد کیا اور ان کی پرورش و سرپرستی بھی کی۔علاوہ سعادت یار خاں رنگین اور مرزا غالب کے نواب کے دربار میں منشی محمد اسمٰعیل، منیر شکوہ آبادی (استاد نواب علی بہادر ثانی) نامی بلگرامی، محمد یار خاں یکتا و بیدل اور دیگر متعدد شعرا کی موجودگی اور نواب کی قدردانی کا حال ان شعرا کے دواوین سے پایا جاتا ہے۔

نواب ذوالفقارعلی بہادر نے باندہ میں دینی تعلیم کی خاطر مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی،قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کو خصوصی طور پر باندہ بلوایا اور ان کی بڑی قدرومنزلت فرمائی۔نواب موصوف نے مولانا خرم علی بلہوری سے صحیح بخاری شریف و مسلم شریف کی احادیث کا اردو ترجمہ 1825 میں مکمل کرا کے لکھنؤ سے طبع کرایا۔یہ حدیث کا پہلا اردو ترجمہ تھا۔

سعادت یار خاں رنگین کے باندہ سے چلے جانے کے بعد 1834 سے 1848 تک تقریباً چودہ (14) سال کا عرصہ ایسا ہے کہ جس میں کسی اہم شاعر کا تذکرہ جو باندہ میں مقیم رہا ہو دستیاب نہیں ہے،سوائے مرزا عباس بیگ بریلوی کے جو نواب علی بہادر ثانی کے خاص آدمی تھے اور جن سے وہ شروع میں مشورہ لیتے رہے تھے۔مرزا عباس بیگ نے بعد میں نادر تخلص اختیار کر لیا تھا۔نواب علی بہادر ثانی کے عہد میں باندہ میں ان کا قتل ہوگیا تھا۔منیر شکوہ آبادی نے ان کے قتل پر ایک تاریخی قطعہ لکھا تھا جو ان کے کلیات میں صفحہ 487 پر درج ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باندہ میں ادبی سرگرمیاں مسلسل جاری تھیں اور شعر و سخن کی محفلیں گرم ہوتی رہتی تھیں کیوں کہ اس کا ایک ثبوت اور بھی ہے وہ یہ کہ نواب ذوالفقارعلی بہادر کے

ذریعے تعمیر کرائی گئی شہر کی جامع مسجد پر جو کتبہ لگا ہے اس سے دو شاعروں کی موجودگی کا اظہار ہوتا ہے۔ جو اس وقت باندہ میں مقیم تھے۔ باندہ کے مشہور شاعر جناب عبد الحی قابل باندوی نے اپنے دیوان کے دیباچے میں تحریر کیا ہے۔ انھیں قابل تخلص حضرت نامی بلگرامی نے عطا کیا تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جب قابل باندوی صاحب سن شعور کو تقریباً 1870 میں پہنچ کر شاعری کی جانب رجوع ہوئے تو یہی نامی بلگرامی جن کا نام مسجد کے کتبے میں درج ہے باندہ میں قیام رکھتے تھے۔

مرزا غالب کے سفر باندہ اور پھر باندہ سے سفر کلکتہ کا احوال خود مرزا کے فارسی خطوط نواب علی بہادر ثانی کے نام ہیں۔ اس کے علاوہ باندہ کے مولوی محمد علی خاں (صدر امین) کے نام بھی متعدد خطوط سے ان کا احوال سفر منکشف ہوتا ہے ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کلکتہ میں مرزا پر کیسی گزری اور باندہ سے کس طرح مزید امداد انھیں پہنچائی گئی۔ [4] مرزا کے دیوان میں ایک غزل کے مقطعے میں یہ شعر خود میں ایک ثبوت ہے کہ جس سے باندہ آنے کی تمنا کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ شعر انھوں نے 1849 میں غالباً نواب علی بہادر ثانی کی مسند نشینی کے وقت کہا تھا۔

غالب خدا کرے کہ سوار سمند ناز
دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

باندہ کے پاس ہی واقع ضلع ہمیر پور اور جالون کے مابین ریاست کدورا (جو اب ضلع جالون میں شامل ہے) کے نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں شفق کو لکھے گئے متعدد خطوط جو 'عود ہندی' میں طبع ہو چکے ہیں۔ مرزا نے کدورا آنے کا پروگرام تحریر کیا ہے۔ اس میں دہلی سے باندہ پہنچنے اور پھر کدورا آنے کی پوری تفصیل درج ہے جس سے مرزا کے باندہ سے تعلقات کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ مرزا کے اس طویل ترین سفر میں باندہ ہی ایک ایسا مقام ہے کہ جہاں سے انھوں نے اپنے سفر کلکتہ کا دوسرا مرحلہ شروع کیا تھا۔ پنشن کی تنگی اور ذہنی الجھنوں، ہر طرف مایوسی کے عالم میں مرزا کو باندہ کا خیال آیا جہاں ان کے ہمشیر ممانی کے صاحبزادے اور ان کے بڑے بھائی اور ممانی کی بہن کے صاحبزادے نواب اور رئیس باندہ تھے اور اس لائق تھے کہ مرزا کی امداد ہر طرح سے کر سکتے تھے۔ اسی خاطر مرزا باندہ جا کر اور وہاں قیام کر کے آرام و علاج کے علاوہ امداد حاصل کرنے کا پروگرام بنا کر خود باندہ کا سفر اختیار کرتے ہیں تاکہ ان کے مقصد کی تکمیل خاطر خواہ ہو سکے۔ یوں بھی مرزا نے اس طویل ترین سفر کا آدھا حصہ تقریباً طے کر لیا تھا۔ بغیر کلکتہ گئے وہ دلی جاتے بھی تو اپنے قرض خواہوں کو کیا منھ دکھاتے، اس لیے ایک موہوم سی امید کے سہارے مرزا لکھنؤ سے عازم باندہ ہوتے ہیں کیونکہ ایسی صورت میں ان کے سامنے سوائے اس کے کوئی دوسرا راستہ بھی نہ تھا اور پھر نواب باندہ ذوالفقار علی بہادر کی علم دوستی اور اہل علم کی سرپرستی کا شہرہ عام تھا۔ اس علاقے کی روایات بھی یہی تھیں کہ جن کا تذکرہ عبدالرحیم خان خاناں کے اس دوہے میں موجود ہے جو انھوں نے اپنے اس علاقے میں قیام کے دوران کیا تھا۔

چترکوٹ میں رم رہے رحمٰن اودھ نریش
جیہہ پہ وپدا پرت ہے وہ آوت یہ دیش

(چترکوٹ باندہ کمشنری میں واقع ہے اور ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے جہاں بن باس کے دنوں میں رام چندر جی، سیتا اور لچھمن مقیم رہے۔ عبدالرحیم خان خاناں بھی اپنے گردش کے دنوں میں یہاں تشریف لائے تھے۔)

اس خاطر مرزا کا سفر باندہ بہت ضروری ہو گیا تھا۔ مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر یہ بات تقریباً طے ہو جاتی ہے کہ مرزا کا باندہ تشریف لانا ایسی مجبوری تھی کہ جس کو وہ کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس اتفاقیہ سفر کے متعلق کچھ تحریر نہیں کیا ہے سوائے اس کے کہ ''میرے بزرگوں اور نواب ذوالفقار علی بہادر کے باہمی پرانے تعلقات تھے۔ خود میرے دل میں بھی نواب کے لیے حد درجہ محبت اور لگاؤ تھا۔ اس لیے جوں توں گرتا پڑتا باندہ (بندیل کھنڈ) پہنچ گیا۔'' مرزا غالب لکھنؤ سے کان پور ہوتے ہوئے فتح پور اور فتح پور سے چل کر چلہ تارا ہوتے ہوئے باندہ پہنچے تھے۔

بقول کالی داس گپتا رضا ''باندہ پہنچ کر مرزا کا قیام نواب ذوالفقار علی بہادر نواب باندہ کے مکان پر رہا''[5] جبکہ سید محمد الیاس مغربی مولف 'تاریخ بندیل کھنڈ' شیخ اکرام کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ مرزا کا قیام مولوی محمد علی خاں صدر امین ضلع باندہ کے مکان پر رہا۔ جناب محمد مشتاق شارق میرٹھی (مرحوم) اس سلسلے میں خود کوئی بات نہ کہہ کر مرزا کے خط کا حوالہ دیتے ہیں جس میں مرزا نے خود کہا ہے کہ ''باندہ میں میرا قیام تقریباً چھ ماہ رہا۔ نواب صاحب کے مکان پر خدا کے کرم و فضل اور نواب موصوف کی ہمدردی، تیمار داری اور توجہ سے مجھے اس خطرناک بیماری سے نجات ملی''۔[6]

باندہ میں غالب کی سب سے پہلے ملاقات مولوی محمد علی خاں سے ہوئی۔ اس وقت وہ باندہ کے صدر امین تھے۔ اونٹ گاڑی سے اترنے کے بعد (انگریزی کچہری) اور نوابین کے متعلق دریافت کیا اور از راہ اخلاق مرزا کو اپنی کوٹھی پر لے جانا اور ان کی خاطر و مدارات کرنا وغیرہ نے ہی مرزا کو ان کے قریب کر دیا تھا۔ یہ تذکرہ غالب نے 'پنج آہنگ' میں موجود فارسی خطوط میں کیا ہے۔[7] باندہ میں قیام کے دوران مرزا کی ملاقاتیں محض علمی اور ادبی گفتگو تک نہ محدود رہی ہوں گی بلکہ مولوی صاحب کو اپنے مسلک اور عقیدے نیز فارسی شاعری سے شغف رکھنے والا دیکھ کر مرزا کو حقیقتاً راحت کا احساس ہوا ہوگا اور یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ مرزا کو فارسی میں شعر کہنے کی تحریک مولوی محمد علی خاں صاحب کی صحبت میں ہی پیدا ہوئی ہوگی کیوں کہ اس سے قبل غالب نے فارسی کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اس سلسلے میں کالی داس گپتا رضا نے تحقیقات کے بعد یوں تحریر کیا ہے:

''فارسی میں شعر گوئی کا باقاعدہ اس سے پہلے کا سرمایۂ فارسی ناقابل اعتنا اور مقدار میں بہت کم ہے۔ گل رعنا میں شامل فارسی انتخاب اس پر شاہد ہے کہ 1828 تک ان کے پاس 27 غزلوں سے زیادہ کلام نہ تھا۔ اور وہ بھی اسی سفر کلکتہ کے درمیان کہا گیا تھا۔ غالب کے قدیم ترین نسخے میں بھی اردو کا مکمل مردف دیوان ہے مگر فارسی کی صرف 12 رباعیاں ہیں''۔[8] اس طرح یقین کیا جاتا ہے کہ یہ شہر باندہ ہی تھا جس نے غالب کو فارسی زبان میں شعر گوئی کی جانب رغبت دلائی اور باندہ سے کلکتہ کے سفر کے درمیان انھوں نے متعدد فارسی غزلیں کہیں۔

مرزا غالب جنھوں نے تمام زندگی کوئی کام و روزگار نہیں کیا اور جائداد وغیرہ کے خاتمے کے بعد جو کچھ انھیں بطور پنشن ملتا تھا اس میں گزر اوقات نہ ہونے پر ہمیشہ قرض لے کر گزر کرتے رہے تھے۔ جس کا تذکرہ انھوں نے بڑے فخریہ انداز میں اپنے مختلف خطوط میں کیا ہے۔ مرزا نے سفر کلکتہ کے سلسلے میں سید محمد الیاس مغربی مولف 'تاریخ بندیل کھنڈ) میں یوں تحریر کیا ہے۔ ''مرزا جب کلکتہ کی خاطر روانہ ہونے لگے تو نواب ذوالفقار علی بہادر نے اپنی ضمانت پر سیٹھ امین چند سے مرزا کو دو ہزار روپیہ (2000) سفر خرچ کے لیے دلوائے۔''[9]

مرزا نے ایک فارسی مدحیہ قطعہ نواب ذوالفقار علی بہادر کے متعلق کہا ہے۔

نواب ذوالفقار بہادر کہ بودہ است
یاد تو در مصاف فلک ذوالفقار من
دانی کہ در فراق تو اے رشک مہر و ماہ
روزم سیہ تر است زشبہائے تار من

مرزا غالب نے باندہ میں قیام کے دوران اپنے کلکتہ کے سفر کے اخراجات کی خاطر روپیہ کا بندوبست باندہ میں ہی

کیا تھا اور ایک نئے عزم کے ساتھ کلکتہ کی جانب روانہ ہوئے تھے تا کہ وہاں پنشن کا معاملہ پیش کرسکیں۔مرزا کے سفر کے متعلق کالی داس گپتا رضا نے ’توقیت غالب‘ میں یوں تحریر کیا ہے۔

”باندہ سے خشکی کے راستے گھوڑوں کی سواری سے کلکتہ کا سفر جاری دو تین ملازم ساتھ تھے۔“

باندہ کے چلہ تارہ سے بذریعہ کشتی مرزا بنارس تک تو بہت آرام سے چلے جاتے ہیں اور بنارس میں آرام فرماتے ہیں۔قدرے تھکن دور ہوتی ہے تو فارسی میں نہایت مرصع مثنوی ”چراغ دیر“ تحریر فرماتے ہیں جو ایک سو آٹھ (108) اشعار پر مشتمل ہے۔یہاں سے جب آگے چلنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ملاحوں سے سودا طے نہیں ہوتا اس لیے مجبوراً انھیں بنارس سے گھوڑوں پر سفر کرنا پڑتا ہے۔وہ 21 دسمبر 1827 کو صبح گھوڑے کی سواری سے کلکتہ کی خاطر روانہ ہوتے ہیں اور 21 فروری 1828 کو کلکتہ پہنچتے ہیں۔کلکتہ میں مرزا کا قیام بقول کالی داس گپتا رضا ”21 فروری 1828 سے 29 نومبر 1829 تک یعنی تقریباً اکیس ماہ سے کچھ اوپر رہا۔اس درمیان وہ پنشن کے مقدمے میں مشغول رہے۔“ باندہ میں غالب نے جو قرض مبلغ دو ہزار روپیہ سیٹھ امین چند سے نواب ذوالفقار علی بہادر کے توسط سے لیا تھا۔اس کا بیشتر حصہ سفر اور کلکتہ کے چار ماہ قیام پر صرف ہو چکا تھا۔ 20 جون 1828 کو غالب نے ایک خط مولوی محمد علی خاں (صدر امین باندہ) کو یہ درخواست کرتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ مبلغ ایک ہزار روپیہ اور قرض دلوائے جانے کا بندوبست کریں۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر یہ شہادت پہنچتی ہے کہ مرزا کو اگر باندہ کے نواب ذوالفقار علی بہادر مرزا کے عزیزوں اور دوستوں نے باندہ سے امداد نہ پہچائی ہوتی تو مرزا نہ تو بیماری سے شفا پاتے اور نہ ہی اپنے کلکتہ کے مجوزہ سفر کی تکمیل کر سکتے تھے اور کلکتہ میں اتنے دنوں قیام کر کے واپس آسکتے تھے۔اس طرح مرزا کے اس طویل ترین سفر میں باندہ کا اہم کردار ہے۔

اپنے کلکتہ کے مشن سے فارغ ہوکر مرزا کی واپسی جب دلی کی جانب ہوتی ہے تو مرزا پھر باندہ تشریف لاتے ہیں اور تقریباً ایک ہفتہ قیام کے بعد دہلی چلے جاتے ہیں۔جناب ترمزی صاحب نے اپنی کتاب میں غالب کے باندہ آنے کی تاریخوں کا اس طرح تذکرہ کیا ہے۔”20 اگست 1829 کلکتہ سے باندہ روانگی، 30 اکتوبر 1829 بروز جمعہ باندہ آمد، 7 نومبر 1829 باندہ سے دہلی روانگی اور 29 نومبر 1829 دہلی آمد“۔[10] کلکتہ میں مرزا کو پنشن کے معاملے میں کوئی کامیابی نہیں ملی تھی اور نہ ہی روپیہ ہاتھ آیا تھا اس لیے سیدھے خالی ہاتھ دہلی پہنچنے پر مرزا اپنے قرض خواہوں کا سامنا کیسے کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس کا حل تلاش کرنا سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا تھا کہ باندہ سے مزید رقم قرض پر لی جائے۔اسی وجہ سے وہ راستے میں باندہ ایک ہفتہ مقیم رہ کر اور اپنی ضرورت پوری کر کے ہی دہلی گئے تھے۔

1857 کی پہلی جنگ آزادی میں انگریزی حکومت کے خلاف نواب علی بہادر ثانی نے جھانسی کی رانی لکشمی بائی اور بٹھور کے نانا صاحب اور تانتیا ٹوپے کے ساتھ مل کر جو کردار ادا کیا تھا اس کی پاداش میں 1859 میں باندہ کی نوابی کا قطعی طور پر انگریزوں کے ہاتھوں خاتمہ ہو گیا تھا اور نواب موصوف 1859 سے اندور میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے تھے جہاں آج بھی ان کے خاندان کے افراد قیام پذیر ہیں۔

مرزا غالب کی باندہ تشریف آوری سے چاہے اردو زبان و ادب پر کوئی اثر پڑا ہو یا نہ پڑا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ باندہ کی ادبی تاریخ میں یہی وہ سنہرا دور ہے کہ جب اردو زبان کے اس نازک پودے کو بندیل کھنڈ کی سنگلاخ اور بے آب و گیاہ سرزمین پر نوابین باندہ نے اپنے پرخلوص ادب پرستی کے جذبے کے تحت لگایا تھا۔آج یہ اسی کا فیض ہے کہ باندہ میں شمع علم و ادب اسی آب و تاب سے تقریباً دو صدی سے روشن ہے اور پرانے چراغوں سے نئے چراغ روشن ہوتے چلے جا رہے ہیں۔اس طویل ادبی روایات سے وابستہ شعرائے کرام کا ایک سلسلہ ہے جس میں قابل باندوی (مرحوم) کامل باندوی (مرحوم) دواریکا پرساد شوق باندوی (مرحوم) ہنر باندوی (مرحوم) ظہیر باندوی (مرحوم) احسان آوارہ (مرحوم) شیو پرساد برگ (مرحوم) ہندی کے عالمی شہرت یافتہ شاعر کیدار ناتھ اگروال (مرحوم) جلیل احمد صدیقی قتیل باندوی (مرحوم) شیو بلی سنگھ بشر باندوی، شمیم باندوی، رئیس احمد خان ابا باندوی، مشرقی باندوی، سہیل احمد خیال باندوی، معین الدین راہی باندوی وغیرہ کا کلام اس بات کا زندہ ثبوت ہے۔

شاعری کبھی خلا میں تخلیق نہیں کی جا سکتی۔غالب جس دور میں شعر و شاعری کر رہے تھے وہ دور اردو شاعری میں ایجاد و روایت سازی کا دور تھا۔غالب نے اس فن میں تقلید کی جگہ اپنا راستہ خود بنایا تھا۔اس لیے ان کی شاعری میں ان کا ماحول، ان کا درد، ان کی سوچ و فکر واضح طور پر نمایاں ہے۔شرط صرف یہ ہے کہ تاریخی سیاق و سباق میں ان کی تخلیقات کو رکھ کر زماں و مکاں کے پس منظر میں افہام و تفہیم کی جائے تو بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔یوں تو غالب کے اشعار کی تشریح کرنے والوں نے محض معنی، تراکیب کو نظر میں رکھتے ہوئے نہ جانے کتنے صفحات سیاہ کر ڈالے لیکن کیا وہ غالب کے ذریعہ کہے گئے اشعار کی معنوی تہہ تک پہنچتے ہیں۔یہ ہنوز سوالیہ نشان ہے اور ان میں تضاد خود اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی بھی ان کی تشریح سائنسی نقطۂ نظر سے نہیں کر سکا ہے۔

غالب بلاشبہ اپنے عہد کی آواز تھے۔انھوں نے غزل میں گہرائی پیدا کی۔ان کے کلام میں چمک دمک اور مہک ہوتی تھی۔غالب کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کلام میں غور و فکر کے انداز کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی پایا جاتا ہے کہ وہ کچھ سوچ رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جا بہ جا سوال ملتے ہیں۔وہ فلسفی نہیں مگر ان کا انداز فلسفیانہ ہے، مفکر نہیں مگر نظریہ حکیمانہ ہے۔

دور حاضر میں جن مشکلات سے نئی نسل دو چار ہے اس کی بھرپور عکاسی غالب کے کلام میں ملتی ہے۔جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا کلام آج کے زمانے کا نہ ہوکر بھی نئی نسل کے فکر و خیال، جذبات و احساسات اور ذہنی رویہ کو مکمل کرتا ہے جو اس کے جذبات و احساسات کی تسکین کا ذریعہ بھی ہے اور ان کو برانگیختہ کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔

حواشی

(1) سید محمد الیاس مغربی؛ تاریخ بندیلکھنڈ، نامی پریس لکھنؤ، پہلا ایڈیشن 1978، ص 23-122

(2) ڈاکٹر جمیل جالبی؛ تاریخ ادب اردو، جلد چہارم (حصہ اول) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، تیسرا ایڈیشن 2016، ص 48

(3) محمد مشتاق شارق میرٹھی؛ غالب اور بندیلکھنڈ، مطبوعہ سہ ماہی تحریر دہلی، ماہ جون 1977

(4) ایس۔اے۔آئی ترمذی؛ غالب کے فارسی خطوط بزبان انگریزی، غالب اکادمی نئی دہلی 1969، ص 38

(5) کالیداس گپتا رضا؛ دیوان غالب کامل ص 86

(6) محمد مشتاق شارق میرٹھی؛ غالب اور بندیلکھنڈ، مطبوعہ سہ ماہی، تحریر دہلی، ماہ جون 1977

(7) کلیات نثر غالب؛ فارسی (پنج آہنگ) ص 164

(8) کالی داس گپتا رضا؛ دیوان غالب کامل ص 87-86

(9) سید محمد الیاس مغربی؛ تاریخ بندیلکھنڈ، نامی پریس لکھنؤ، پہلا ایڈیشن 1978 ص 123

(10) ایس۔اے۔آئی ترمذی؛ غالب کے فارسی خطوط بزبان انگریزی، غالب اکادمی، نئی دہلی 1969، ص 38

■

Daud Ahmad
Asst.Prof. & Head Dept of Urdu,
Govt.Girls PG College, Banda U.p-210001
Mob:08423961475
Email: daudahmad786.gdc@gmail.com

پانی پت
کی چند مایہ ناز علمی ادبی ہستیاں

رؤف خیر

پانی پت کی جنگوں کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے مگر اس کی ادبی و مذہبی شناخت میں جن شخصیات نے اپنا حصہ ادا کیا ہے وہ بھی تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔ ان میں سب سے قد آور شخصیت شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی کی ہے۔ مرزا غالب کو روشناس خلق کروانے میں حالی کی خدمات کے اہل نظر تو معترف ہیں ہی خود غالب کو بھی اس کا احساس رہا خوش گمان غالب یہ کہہ کر دل کو تسلی دے رہے تھے

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

شہ کا مصاحب ہونے سے ذوق کا مقام و مرتبہ اس دور میں اونچا تھا۔ مومن اپنی ذہانت و رومانیت کی وجہ سے مقبول خاص و عام تھے۔ غالب کے بارے میں عام خیال یہی پایا جاتا تھا کہ اپنا کہا خود سمجھیں یا خدا سمجھے۔ اسی لیے غالب گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کی منزل سے گزر رہے تھے۔ سچ پوچھیے تو غالب پر حالی کا بڑا احسان ہے جہاں حالی نے 'یادگارِ غالب' کے ذریعے غالب کو یادگار بنادیا، وہیں سر سید احمد خان کو بھی 'حیاتِ جاوید' بخشی۔ غالب کی طرح سر سید بھی اپنے دور میں سیاسی و مذہبی، سماجی و اصلاحی اعتقادات و اقدامات کی وجہ سے عوام میں نامقبول ہی رہے۔ وہ تو خواجہ الطاف حسین حالی ہیں جنھوں نے غالب و سرسید کی بلند قامتی کا احساس کروایا۔ سرسید کی ایما پر 'مدو جزر اسلام' (مسدس حالی) جیسا شاہ کار ادب کو دیا اسے سر سید بھی اپنے لیے 'شاہ نیکی' خیال کرتے تھے۔ جدید نظم اور جدید تنقید کے بنیاد گزاروں میں بھی حالی کا نام لیا جاتا ہے۔ 'مقدمۂ شعر و شاعری' کے ذریعے حالی نے شعری منظر نامہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ حالی نے شعر کی خصوصیات میں سادگی، اصلیت جوش کی اہمیت دکھائی وہیں شاعر کے لیے رہنما اصول (بلند تخیل، عمیق مطالعۂ کائنات اور تفحص الفاظ) کا بے مثال تحفہ دیا۔

پانی پت کی دوسری بڑی شخصیت پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی کی ہے 1859 میں پیدا ہونے والے سلیم 1928 میں اپنے پیچھے کئی کارنامے چھوڑ گئے۔ پانی پت سے آگے بڑھے تو علی گڑھ میں سر سید احمد خاں کی خدمت میں جٹے رہے۔ فرماں روائے حیدر آباد میر عثمان علی خاں بہادر نظام سابع نے حیدر آباد کو مثالی مملکت بنانے میں سرسید کا تعاون چاہا تو انھوں نے اپنے خاص معتمد و معتبر حضرات جیسے مہدی علی خان اور وحید الدین سلیم کو اپنی سفارش کے ساتھ بھیجا۔ مہدی علی خان محسن الملک ہوگئے اور وحید الدین سلیم عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر ہوگئے۔ دوسرے صدر شعبۂ اردو ہوئے پھر دارالترجمہ میں وضع اصطلاحات کمیٹی کے خاص رکن ٹھہرے۔

خواجہ احمد عباس بھی پانی پت کی خاک سے اٹھنے والے اور حالی کے خاندان کے مشہور و ممتاز فرد تھے۔ ان کا ناول 'انقلاب' شاہ کار سمجھا جاتا تھا۔ وہ پکے سیکولر قلم کار تھے۔ گاندھیائی فلسفے کے ہم نوا مگر کمیونسٹ تھے۔ جب مرے تو وصیت کی کہ ان کی میت کو ترنگے میں لپیٹ کر آخری رسومات ادا کی جائیں۔ ہفتہ وار بلٹز میں وہ 'آزاد قلم' کالم لکھتے تھے جو ان کی حق گوئی و بے باکی کا ترجمان تھا۔ راج کپور کے لیے کئی فلمیں لکھیں جو کامیاب ثابت ہوئیں۔ 'میرا نام جوکر' نے کامیابی کا ریکارڈ قائم کیا۔ انھوں نے اپنے طور پر جو آرٹ فلمیں بنائیں وہ شاہ کار ٹھہریں۔ ان کے افسانے ناول منفرد ہوا کرتے تھے۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتے تھے اور دونوں زبانوں پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ پانی پت میں موجود ان کی موروثی جائیداد کو ان کے جیتے جی کسٹوڈین نے پاکستان سے آنے والے شرنارتھیوں کو الاٹ کر دیا تھا۔ خواجہ احمد عباس نے دس سال تک مقدمہ بازی کر کے کسٹوڈین سے وہ جائیداد بالآخر حاصل کی جس کے وہ یقیناً مستحق تھے مگر چونکہ وہ سیکولر ذہنیت کے حامل ادیب بھی تھے چنانچہ انھوں نے اپنا وہ گھر انہی شرنارتھیوں کو معمولی رقم کے عوض بیچ بھی دیا۔

ڈاکٹر کمار پانی پتی نے اپنی کتاب 'عہد ساز ادبی شخصیتیں' حصہ اول میں لکھا:

''میں سوچتا ہوں کاش اس گھر میں کوئی لائبریری ہوتی یا کسی اردو ادارے کا کوئی دفتر ہوتا اور یہ اردو گھر خواجہ صاحب کے ادبی وقار کی علامت بن جاتا''

پانی پت کے ایک اور مشہور و ممتاز نظم گو شاعر بشیشر ناتھ کنول گزرے ہیں اگرچہ انھوں نے غزلیں بھی کہی

ہیں مگر نظم کی وجہ سے انھیں زیادہ شہرت ملی۔

کنول قومی یک جہتی کے علم بردار بھی تھے۔ چنانچہ اپنی ایک نظم میں وہ کہتے ہیں۔

راستہ کیا ہے وہ جس کی منزل نہ ہو
سوے منزل نہ جاؤ قدم روک لو
ہند و سکھ ہو مسلماں ہوعیسائی ہو
یوں چلو مل کے جیسے سگے بھائی ہو
میری آواز اگر سن سکو تو سنو
تم سبھی ایک ہو،ایک ہو، ایک ہو

افسوس 13 فروری 1990 کو پانی پت کے اس بے باک شاعر کا کریا کرم کیا گیا۔اسی سال ڈاکٹر کمار پانی پتی نے کنول کے فکروفن کوخراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک کتاب 'جام ہاتھوں میں رہا' ترتیب دی۔

پانی پت اردو کے ساتھ ساتھ فارسی ادب کا بھی گڑھ رہا ہے۔ دینی ومذہبی اداروں میں عربی کا بھی زور تھا۔آزادی سے پہلے پانی پت میں سات ہزار کی آبادی تھی جس میں چار ہزار مسلمان اور تین ہزار غیر مسلم تھے مگر جیسے ہی ملک تقسیم ہوا مسلمان بچتے بچاتے پاکستان ہجرت کر گئے۔

ایک زمانہ تھا پانی پت میں غیر مسلم بھی اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں شعر کہا کرتے تھے 1918 میں پیدا ہونے والے کندن لال اخگر شاہانی فارسی اور تاریخ میں ایم۔اے تھے۔ دوآبہ کالج جالندھر اور دیال سنگھ کالج کرنال میں وہ لکچرر تھے۔وہ فتح محمد فاتح کے شاگرد تھے۔اردو میں ان کے چھ شعری مجموعے گستاخیاں، رعنائیاں، رنگینیاں، تجلیاں، بے باکیاں اور گل باریاں شائع ہو چکے ہیں۔ادبی مرکز نے پانی پت سے ان کا ایک مجموعہ 'گلبانگِ پارسی' بھی شائع کیا۔اخگر شاہانی کے بعض اردو شعر تو ضرب المثل ہو کے رہ گئے ہیں اور ان کے احباب کی زبانوں پر ہیں۔جیسے

وقت کے ساتھ میں نہیں چلتا
وقت ہی میرے ساتھ چلتا ہے
کسی کے دل میں اترنا تو مجھ کو آتا ہے
کسی کے دل سے اترنا مجھے نہیں آتا

ڈاکٹر کمار پانی پتی سے ان کی مراسلت رہی۔وہ بزم سخن کرنال کے بانی مبانی تھے۔کسی ادبی شخصیت کی آمد پر یا مہینے دو مہینے بزم کی نشستیں ہوتی تھیں تو وہ احباب کو جمع کرتے تھے اور ان کی آمدورفت کا خرچ برداشت کرتے تھے۔اخگر شاہانی کے بچے کیرل میں ملازمت کرتے تھے اور وہیں Settle ہو گئے تھے۔اخگر صاحب کرنال چھوڑ کر کیرل بادل نخواستہ گئے۔وہ چاہتے تھے کہ ان کے فارسی کلام کا مجموعہ گلبانگِ پارسی جلد چھپ جائے جس کی کتابت ہریانہ کے معروف خوش نویس رام نرائن مستانہ پانی پتی کر رہے تھے۔اخگر شاہانی نے اپنے فارسی شعری مجموعے کا پیش لفظ فارسی میں لکھا اور اس کا انتساب اپنے استاد فتح محمد صاحب فاتح ساہیوال۔ پاکستان کے نام کیا۔ 9 اپریل 1988 کو پیش لفظ لکھنے کے چند ہی دنوں بعد ان کا انتقال ہو گیا مگر ان کے وفادار دوست ڈاکٹر کمار پانی پتی نے گلبانگِ پارسی بہت جلد 1989 ہی میں شائع کر کے اخگر صاحب کی آتما کی شانتی کا سامان کر دیا۔

اخگر شاہانی کی پہلی غزل کا مطلع ہے:

دوش من درخواب دیدم دلبر گلفام را
بادلِ خودجفت دیدم راحت وآ رام را

جملہ ایک سو غزلوں پر مشتمل گلبانگِ پارسی اخگر شاہانی کی فکری خلاقی کا مظہر ہے۔ان میں بعض غزلیں دس اشعار پر 'بعض نو بعض سات یا پانچ اور تین غزلیں دو دو اشعار پر بھی ہیں۔ ان کی چالیسویں غزل کے دو شعر ان کی فکری پرواز کے غماز ہیں۔

رامش گری کمال بکردہ زِتان سین
اِمروزتاجدار اوو شنود گمبراست
شب چوں نظر بہ سوے نجوم فضا کنم
ہراخترایں زند کہ اوتابندہ اخگر است

کتابت کی غلطیاں دور ہو جاتیں اگر یہ مجموعہ ان کی زندگی میں شائع ہو جاتا۔حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ پانی پت جیسے مقام پر رہتے ہوئے اخگر شاہانی نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی مذاق کو بھی زندہ رکھا۔

ہریانہ کے پہلے راج کوی لالہ انوپ چند آفتاب پانی پتی کی حق گوئی وبے باکی سے متعلق ڈاکٹر کمار پانی پتی نے 'عہد ساز ادبی شخصیتیں' میں لکھا کہ جوش ملیح آبادی نے جب ہندوستان میں شراب کی پابندی کے خلاف نظم کہی تھی کہ

انسان کے لہو کو پیو اذنِ عام ہے
انگور کی شراب کا پینا حرام ہے!

آفتاب پانی پتی نے جواباً سخت لہجے میں جوش کا رد کیا۔اور چوٹ کی۔

کیا ان سے درس لیں گے مری قوم کے جواں
عیا شیوں میں کٹ گئیں جن کی جوانیاں

گویا 'یادوں کی برات' کی طرف اشارہ ہے۔ویسے شراب بندی کے خلاف جوش نے لال قلعے کے مشاعرے میں پنڈت جواہر لال نہرو کی موجودگی میں وہ گستاخانہ نظم سنائی تھی تو گوپال متل نے فی البدیہہ اس کا جواب دیا تھا۔ لالہ انوپ چند آفتاب پانی پتی گاندھیائی فلسفے کے ہم نوا اور حب الوطنی سے سرشار تھے۔ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جیسے:

کلام آفتاب۔ 1915،سیلابِ اشک۔ 1921، نغمۂ روح۔ 1921، آفتابِ وطن۔ 1931، زخم وطن۔ 1934، جذباتِ آفتاب۔ 1940، جوشِ وطن۔ 1941، جذبات کی دنیا۔ 1955، حبِ وطن۔ 1961 اور شمشیرِ وطن۔ 1966

پانی پت کی خاک سے اٹھنے والا رام ریاض ایک غیر معمولی ذہین شاعر تھا۔ چوتھی دہائی میں پیدا ہونے والا رام ریاض تقسیم ملک کے ہنگاموں میں اپنے والدین کے ساتھ ہجرت کر کے جھنگ پاکستان پہنچ گیا۔کچھ دن ٹیچری کرنے والا رام ریاض ایم اے کر چکا تھا بھٹو کے دور میں وہ فیملی پلاننگ محکمے میں PPO کے عہدے پر فائز تھا مگر جنرل ضیاء الحق کے دور میں وہ دیگر ملازمین کے ساتھ ملازمت سے سبک دوش کر دیا گیا۔ظاہر ہے نس بندی کو ضیاءالحق نے غیر اسلامی قرار دے دیا ہوگا۔

رام ریاض بڑا اچھا شاعر تھا۔اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ادبی حلقوں اور مشاعروں کا وہ کامیاب باغی شاعر شمار ہوتا تھا۔اس کے چند مشہور شعر ہیں۔

تیرے اور میرے ستارے جو نہیں ملتے ہیں
تجھ میں اور مجھ میں کوئی فرق تو بنیادی ہے
میں تیری مدح تو کر سکتا ہوں لیکن اس میں
میرے فن کی ہی نہیں خلق کی بربادی ہے
اجاڑ سڑکوں پہ خاموش بہتا رہتا ہے
ہمارے خون کو عادت نہیں اُبلنے کی
ہنسی خوشی سے گزارو کہ رُت نہیں آئی
حصارِ حبس سے باہر ابھی نکلنے کی
سب اپنا لہو چاٹ کے ہو جاتے ہیں خاموش
دیتا ہے یہاں کون دہائی،مرے بھائی
دشمن تجھے کیسے نظر آنے لگے دشمن
تونے ابھی دیکھے نہیں بھائی،مرے بھائی

رام ریاض اپنے مولد پانی پت آنے کا بڑا خواہش مند تھا مگر 1986 میں وہ فالج کا شکار ہو گیا اور چار سال بعد ستمبر 1990 میں دنیا سے منہ موڑ گیا۔

ڈاکٹر دولت رام صابر پانی پتی ایک پُر گو شاعر تھے وہ مولانا تاجور کے شاگرد تھے۔ڈاکٹر قمر رئیس نے فرمایا تھا:

''زبان کی دروبست سے سادگی و پرکاری پیدا کرنا اور مصرعوں کو کچھ اس طرح تراشنا کہ وہ برجستہ مکالموں کا مزہ دینے لگیں،مشکل فن ہے مگر مولانا تاجور کا ایک بہترین

شاگرد ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے ڈاکٹر موصوف (دولت رام صابر) نے اس مشکل کام کو خاصا آسان بنا رکھا تھا'' ان کا شعر ہے

کس شان کی حامل ہے مری دشت نوردی
جوتا بھی جو پاؤں میں نہیں ہے تو نہیں ہے

اس کے دوسرے مصرعے پر باضابطہ طرحی مشاعرہ ہوا جس میں کئی ممتاز شاعروں نے طبع آزمائی کی جیسے مہندر پرتاپ چاند، ڈاکٹر رانا گنوری، ڈاکٹر جی آر کنول، اخگر پانی پتی، عرش صہبائی، شمس تبریزی، سید ضیا علوی، مسلم طاہری، سراج پیکر، یعقوب اعظم، محترمہ ممتاز نازاں، پریم لتا اور ڈاکٹر کمار پانی پتی وغیرہ۔

ڈاکٹر کمار پانی پتی کی وجہ سے اردو ادب کے نقشے میں پانی پت کا نام زندہ و تابندہ ہے۔ ادبی مرکز کا قیام اور اس کے تحت شعر و ادب کی محفلیں برپا کرنا اور کتابوں کی اشاعت ان کا مشغلہ رہا وہ یہ ساری خدمات اردو کی محبت میں کرتے رہے ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ 'آج انسان بننے کا وعدہ کرو' 2014 میں منظر عام پر آیا۔ اس کا صرف رسم الخط ہندی ہے ورنہ کمار صاحب تو خالص اردو کے آدمی کہلائے جا سکتے ہیں۔

بے بسی زندگی کی آس میں ہے
کیا بتاؤں کہ کیا گلاس میں ہے
خود خزاں پوچھتی ہے رہ رہ کر
فصل گل آج کس لباس میں ہے

میرے قدموں سے لپٹنے کو ترستی منزلیں
ڈھونڈتی پھرتی ہیں مجھ کو بستی بستی منزلیں
جانے کس برحق زمانے کا پتہ دیتی رہیں
عزم محکم کے اشاروں پر برستی منزلیں

شہر حالی وسلیم کی ہونہار بیٹی کماری رچی ملہوترہ سونو ایم اے انگلش تھی اور اپنے والد ڈاکٹر کمار پانی پتی کی طرح بڑی خوش ذوق اور خوش سخن تھی۔ اُسے دکھ تھا تو بس یہ کہ اچھی خاصی قابلیت کے باوجود اسے کسی اچھے ادارے میں اچھی سرکاری ملازمت نہیں مل سکی وہ ایک خانگی اسکول میں معمولی تنخواہ پر ٹیچری کر رہی تھی۔ اسی ناکامی نے اسے زندگی ہی سے مایوس کر دیا اور اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ 12 اکتوبر 1975 کو پانی پت میں پہلی سانس لینے والی رچی سونو 11 دسمبر 2013 کو آخری سانس لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ سارا پانی پت اداس ہوگیا۔ ڈاکٹر کمار نے اپنی چہیتی بیٹی کی شعری تخلیقات کو 'آنسوؤں کے موتی' نامی کتاب میں جمع کر کے اُسے بے نام و نشاں ہونے سے بچالیا۔ رچی ملہوترہ سونو اپنے شعری رویے کے بارے میں خود لکھتی ہے

شعر لکھتی ہوں کاٹ دیتی ہوں
کیوں کہ دل کو وہ چھو نہیں پاتے
چاہتی ہوں کہ ان میں کچھ بھر دوں
آج کے یگ کو جو بدل ڈالے

دن رات میں پھانسی پہ لٹکتی ہی رہی ہوں
تقدیر کے جنگل میں بھٹکتی ہی رہی ہوں
دشمن تو کسی کی بھی نہیں تھی میں مگر کیوں
ہر شخص کی آنکھوں میں کھٹکتی ہی رہی ہوں

رچی سونو نے زندگی سے بھرپور رومان پرور زندگی کی عکاسی کی ہے

مجھے پیارسے اپنی بانہوں میں کس کر
کوئی جارہا ہے مرے دل میں بس کر
میں تیری حقیقت سے واقف ہوں پیارے
نہ مار اتنی شیخی مرے یار بس کر
میں ناگن ہوں نس نس میں ہے زہر میری
مزہ دیکھ تو بھی مجھے آج ڈس کر

رچی ملہوترہ سونو کی جدائی پر اپنے ہمدردانہ جذبات کا اظہار کرنے والوں میں کئی قلم کار ہیں جیسے اخگر شاہانی، ڈاکٹر شباب للت، وکاس پانی پتی، پرنسپل سکھ دیو، پریم لتا سمن بجاج، آشا متل اور سب سے بڑھ کر ان کے USA دکھی پتا جی ڈاکٹر کمار پانی پتی۔

پانی پت میں علما و فضلا کی کبھی کوئی کمی نہیں رہی جنھوں نے بھید بھاؤ کے بغیر دین و اخلاق کے ذریعے انسانوں کو انسانیت اور بھائی چارگی سے زندگی گزارنے کا درس دیا۔ ''یہ گلیاں ہیں مولانا حالی کی گلیاں'' میں ڈاکٹر دھرم دیو سوامی نے ایسی تمام علمی و ادبی شخصیات کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی ادھر تو ادھر مولانا ثناء اللہ امرتسری دونوں کے علمائے کرام گزرے ہیں جن کی علمی و مذہبی فتوحات نے تہلکہ مچایا ہے۔ ثناء اللہ پانی پتی کے فرزند مولوی احمد اللہ پانی پتی بھی اپنی شناخت رکھتے تھے اور نابغۂ روزگار عالم و شاعر مرزا مظہر جان جاناں دہلوی (1698-1780) کے مرید ہوگئے تھے۔ حضرت شیخ جلال الدین محمد کبیر الاولیا پانی پتی کا سلطان فیروز شاہ تغلق بھی معتقد تھا اور ان کی ملاقات کو پانی پت آیا کرتا تھا۔ شیخ جلال الدین سماع کا اہتمام کرتے تھے اور ان کا لنگر عام تھا۔ حضرت شمس الدین ترک پانی پتی شمس الاولیا کہلاتے تھے۔ بیشتر صوفیہ کی طرح یہ بھی خاندان سادات سے تھے یعنی علوی تھے۔ عبدالسلام پانی پتی، عبدالغفور لاری پانی پتی، مولانا عبدالرحمٰن جانی بھی صاحبِ تصانیف گزرے ہیں۔ فقہ و تصوف میں منفرد مقام کے حامل عبدالقادر پانی پتی، شیخ الجنی کے بیٹے مولانا محمد پانی پتی تھے۔ حضرت سید غوث علی شاہ پانی پتی نے مولوی قلندر علی جلال آبادی سے حدیث، فقہ، منطق، دینیات پڑھیں۔ وہ بوعلی قلندر کے مزار کے قریب رہا کرتے تھے۔ شیخ گدا پانی پتی، شیخ مودود لاری پانی پتی بھی صاحب حال بزرگ پانی پت کی رونق رہے۔ ان صوفیہ کے مزارات پر عوام کا ہجوم عرسوں کے مواقع پر دکھائی دیتا ہے۔ قوالیاں بھی ہوتی ہیں۔

ان کے علاوہ صاحبِ تصانیف علماء میں امان اللہ پانی پتی، قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی، عبدالرحمٰن پانی پتی، شیخ علی بن محمود پانی پتی، عنایت اللہ خاں راسخ پانی پتی، محمد بن محمود، محمد علی انصاری پانی پتی (مصنف تاریخ مظفری) ہیں۔ نظام پانی پتی نے سنسکرت کے آثار 'جوگ وشسٹ' کا فارسی میں ترجمہ کیا اور بادشاہ وقت جہانگیر کو پیش کیا تھا۔

سعد اللہ مسیحائے پانی پتی نے رامائن کا فارسی میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ شاہ اللہ پانی پتی نے 'سیرا الاقطاب' لکھی۔ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی نے بھی ایک مثنوی اور کلیات یادگار چھوڑیں۔ شاہ جہاں کے دور کے شاعر ملا ظاہری پانی پتی نے فارسی شاعری میں اپنا لوہا منوایا۔

قاضی عبدالرحمٰن تحسین پانی پتی خواجہ الطاف حسین حالی کے گہرے دوستوں میں تھے اور غالب کے شاگرد تھے۔ اردو کی بہ نسبت فارسی میں شعر کہتے تھے 1877 میں انتقال کیا۔ پانی پت کے مشہور رسالہ حیاتِ نو میں ان کی ایک فارسی غزل سرنامے کے طور پر شائع کی گئی ہے۔ یہ رسالہ حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت سے شیخ محمد بدرالاسلام فضلی کی ادارت میں نکلتا تھا۔ قادر پانی پتی اور میر قاسم پانی پتی فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔

قلندر بخش ترابی پانی پتی اور قلندر بخش زیرک پانی پتی دونوں فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ترابی کا انتقال ستر برس کی عمر میں ہوا اور عظیم آباد میں مدفون ہیں۔ زیرک کی تعلیم و تربیت شاہ جہاں آباد اور لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے بارے میں آیا ہے کہ ان کا دماغ آسمان پر رہتا ہے یعنی وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

(بحوالہ ڈاکٹر دھرم دیو سوامی۔ 'یہ گلیاں ہیں مولانا حالی کی گلیاں' ادبی مرکز پانی پت 1992)

مختصر یہ کہ پانی پت شروع ہی سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ مشاہیر کے کارنامے قصہء پارینہ ہوکر رہ گئے ہیں اور موجودہ صورتِ حال دیکھ کر دل بھر آتا ہے۔

■

Dr. Raoof Khair
Moti Mahal, Golconda
Hyderabad – 500008 (Telangana)
Mob.:9440945645
Email: raoofkhair@gmail.com

صفی اورنگ آبادی کی رباعی گوئی

سید محبوب قادری نظامی

صفی اورنگ آبادی جن کا اصل نام بہودعلی صدیقی ہے قلمی نام صفی اورنگ آبادی ہے اسی نام سے ان کی اتنی شہرت ہوئی کہ پورا دکن بلکہ ہندوستان گونج اٹھا۔صفی 14 فروری 1893 روز دوشنبہ کو تاریخی شہر اورنگ آباد کے محلّہ نواب پورہ میں حکیم منیرالدین کے گھر پیدا ہوئے۔

روایتی طور پر ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی بعد میں دکن کی مشہور ومعروف درسگاہ جامعہ نظامیہ کی طرف رخ کیا جہاں انھوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، یہاں کی اخلاقی ،تہذیبی ،اور ادبی فضا نے صفی کو ایک پکی اور صحیح سوچ سے آراستہ کیا۔جس کا اثر ان کے پورے کلام میں صاف صاف نظر آتا ہے۔صفی کی انسان دوستی، مروت، پاسداری، ہمدردی اور تہذیبی رچاؤ ان کے مخلص اساتذہ وسرپرستوں کی صحیح تربیت کا نتیجہ ہے۔

صفی فطری طور پر فن طب سے بہت زیادہ لگاو رکھتے تھے اور کیوں نہ ہو جن کے والد گرامی منیرالدین صاحب خود بھی ایک اچھے حکیم تھے، اس لیے انھوں نے 'مدرسہ طیبہ' میں داخلہ لے کر طبی نصاب کی تعلیم اور اپنے ذوق کی تکمیل کی ،لیکن بتایا جاتا ہے کہ صفی طب کے امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔میں نہیں سمجھتا کہ صفی کا منشا طب کی سند یں رکھنا اور طب میں مہارت حاصل کرنا تھا۔وہ تو ان کا ایک ذوق اور وراثت میں ملی ایک فطری شوق کی تکمیل تھی بس،لیکن اس سے بھی بڑھ کر صفی میں ایک اور عنصر تھا جو انھیں اندر سے بار بار صدا دیتا تھا بے چین اور بے قرار کرتا تھا اور وہ تھا شعر گوئی۔جی ہاں یہ فطری عنصر صفی کو پیدائشی طور پر ملا تھا۔جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ''شاعر بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے'' بالکل صفی شاعر پیدا ہوئے اسی لیے بچپن سے ہی شعر کہتے تھے اور اس کی اصلاح اپنے والد سے لیتے تھے۔

شعر گوئی سے صفی کو قلبی سکون اور دماغی راحت ہی نہیں ملتی بلکہ دماغ روشن ہونے لگتا اور نئی نئی راہیں فراہم کرتا تھا۔آخر کار صفی نے طے کر لیا کہ وہ اپنا پورا وقت اپنی دلی تسکین میں ہی صرف کریں،تو انھوں نے اس فن کے ماہرین کی تلاش شروع کی کیونکہ انھیں اس فن میں کمال حاصل کرنا تھا اور وہ کمال صرف ان کی فطری تحریک سے ناممکن تھا اس لیے انھوں نے اس فن کے اساتذہ کے پاس زانوئے ادب تہہ کیا اس بارے میں صفی خود کہتے ہیں کہ

صفی استاد بننا ہے تو استادان عالم کی
اٹھاو جوتیاں تازہ کرو حقے بھرو چلمیں

استادان عالم کی تلاش میں انھوں نے دبستان دہلی اور لکھنو کے ماہر اساتذۂ سخن سے تلمذ حاصل کیا جن میں سید رضی الدین حسن کیفی ،ظہور احمد دہلوی، عبدالولی فروغ یہ سب دبستان دہلی کے اساتذہ سخن ہیں اور دبستان لکھنو سے شہزادہ حافظ منیرالدین ضیا گورگانی محقق ہیں جن کا تعلق دبستان دہلی اور لکھنو دونوں سے ہے۔اس طرح صفی نے اپنے عہد کے معتبر اساتذہ سخن سے تلمذ حاصل کیا جن کا شہرہ پورے متحدہ ہندوستان میں تھا۔

ایسے زبردست اساتذہ اور قلبی میلان نے صفی کو بھی ایک ماہر استاد سخن بنا دیا،جن کے بے شمار ایسے شاگرد ہیں جن کی شاعری نے پورے دکن میں غزل گوئی کی دھوم مچا دی جسے غلام علی حاوی، خواجہ شوق ،سید نظیر علی عدیل،صفی غزل کے مسلم الثبوت استاد بنے جن کی شاعری میں انسان دوستی، ہمدردی، اخلاقیات ،سحر انگیز تاثیر،شہد کی سی مٹھاس، شبنم کی سی لطافت آسمان کی سی بلندی، آگ کی سی گرماہٹ، پانی کی سی روانی اور زمین کی سی کشش نے پوری اردو دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔

صفی کی شاعری سے متعلق اردو کے ماہر نقاد ڈاکٹر جمیل جالبی یوں رقمطراز ہیں کہ:

''حضرت صفی اورنگ آبادی مرد درویش تھے۔ان کا ظاہر و باطن یکساں طور پر اجالا تھا۔یہی اجالا پن ان کی شاعری میں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔صفی صاحب جیسا کہ سب جانتے ہیں از سرتاپا شاعر تھے۔ ساری عمر شعر و شاعری اور خدمت ادب میں گزار دی اور دکن میں وہ نام پیدا کیا کہ چاردانگ عالم میں ان کا ڈنکا بجنے لگا۔ زبان و بیان پر ایسی قدرت کہ جو پڑھے لطف اٹھائے۔ اظہار جذبات ایسا کہ دل کی کلی کھل اٹھے... حضرت صفی کے کلام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے حضرت داغ دہلوی کے بعد اردو شاعری میں سب سے زیادہ محاورات اور ضرب الامثال ایسی صحت اور سلیقے سے باندھے ہیں کہ ان کی شاعری میں وہ تخلیقی رس پیدا ہو گیا ہے جو اچھی شاعری کی جان ہے۔ان کا کلیات پڑھیے تو معلوم ہو گا کہ وہ کتنے بڑے شاعر تھے۔اتنے بڑے کہ سرزمین دکن ان پر جتنا فخر کرے کم ہے۔''

(کلیات صفی ،مرتب محبوب علی خان اخگر،سنہ 2000،ص 7)

صفی اورنگ آبادی کی بنیادی پہچان غزل گوئی سے ہے اور اسی صنف کی بدولت انھیں ملک گیر شہرت ملی ان کی یہ شہرت ہم اہل دکن بالخصوص شہر اورنگ آباد سے تعلق رکھنے والے بغیر کسی تمیز کیے مذہب وملت کے لیے باعث فخر ہے۔صفی نے اپنے ساتھ اپنے وطن کو بھی شہرت دی، ہر کوئی اپنے وطن سے جڑی ہر چیز سے پیار کرتا ہے۔

اگر ہم کلام صفی کا جائزہ لیں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان کے کلام میں غزل، نظم، حمد، نعت، منقبت، تاریخ گوئی، مثنوی، قطعات، اور رباعی جیسی اصناف سخن آسمان میں ستاروں کے سے جھلملا رہے ہیں کہ ہر صنف کا یہ تقاضہ ہے کہ پہلے مجھے دیکھو۔

یہاں پر ہم صرف صنف رباعی پر نظر ڈالتے ہیں کہ صفی اورنگ آبادی رباعی گوئی میں کس قدر اور کتنے کامیاب ہوئے ہیں؟

اہل علم اور ادب دوست اچھی طرح سے واقف ہیں کہ صنف رباعی میں کامیابی ہر کس وناکس شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ اردو شاعری کی تمام اصناف میں رباعی کو اہل سخن و دانشوروں نے بہت ہی کٹھن اور سنگلاخ بتایا ہے۔

کلیاتِ صفی اورنگ آبادی میں صفی نے تقریباً 90 رباعیات مختلف موضوعات پر بڑی کامیابی کے ساتھ منظوم کیے ہیں۔

صفی اورنگ آبادی کی رباعیات زبان و بیان کے اعتبار سے سادہ، سلیس اور عام فہم ہیں۔محاورہ بندی میں تو صاحب امام ہیں۔الفاظ کی بندش چست عام فہم ہر لفظ اس کی جگہ پر جہاں اسے ہونا چاہیے تھا صفی نے بہت عمدگی اور خوبی سے رکھا ہے۔الفاظ کا انتخاب صفی ایک جوہری کی طرح ناپ تول کر کرتے ہیں اور ایک مصور کی طرح ہر لفظ کو مناسب بناتے ہیں اور ان میں نئے نئے معنی و مفاہیم کے رنگ بھرتے ہیں اور نوک پلک کی درستگی کے بعد جو شکل سامنے آتی ہے وہ یہ دکھائی دیتی ہے۔

پھر کیوں نہ رہے گا تم سے دشمن ٹیڑھا
کہتے ہو کہ شاعری کا ہے فن ٹیڑھا
پوری وہی گت ہوئی تمھاری تو صفی
آئے نہیں ناچنا تو آنگن ٹیڑھا

ہوتا نہیں دوست تو کسی کا دشمن
معلوم نہیں دوست ہے وہ یا دشمن
ہر دوست کا دوست، دوست ہوتا ہے مگر
جو دوست ہے ان کا وہ ہمارا دشمن

صفی اپنی شاعری میں صرف زبان و بیان کا خیال نہیں رکھتے بلکہ قوم وملت کی اصلاح، بھائی چارگی، یکجہتی کا بھی پورا پورا خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

لوگوں سے ہر ایک ڈھب سے مل جل کے رہو
اب تک نہ رہے تو اب سے مل جل کے رہو
دنیا میں اگرچہ نیک و بدسب ہیں صفی
رہنا ہے یہاں تو سب سے مل جل کے رہو

صفی اپنے رباعیات میں ایک ہنستی ہنساتی دنیا رکھتے ہیں جب کوئی قاری یا پھر سامع اس دنیا میں پہنچتا ہے تو سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بھی صفی کی اس ہنستی ہنساتی دنیا کا ایک فرد بن کر خوب کھل کر ہنستا ہے۔

میلے ٹھیلے کی جب خبر پاتے ہیں
دس بیس کو گھور کے چلے آتے ہیں
ساری دنیا تو دل کو بہلاتی ہے
ہم ہیں کہ صفی نظر کو بہلاتے ہیں

صفی کے یہاں طنز بھی پایا جاتا ہے جب صفی کسی کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں تو اس کی اس قدر ہجو کرتے ہیں کہ شرم سے پانی پانی ہو جائے۔

یہ کلام رشک و غیرت پہ نہیں
صورت پہ جو رجحان ہے سیرت پہ نہیں
بے فائدہ عینکیں لگا نے والو
ہے آنکھ بصارت پہ بصیرت پہ نہیں

آج کل کے وہ شعرا جو خود کو شاعر کہہ کر تعارف کراتے ہیں جب ان کا کلام دیکھا جاتا ہے تو اس میں نہ الفاظ کی صحیح بندش، نہ سلاست، نہ معانی نہ ہی مفاہیم بس کچھ الفاظ بے جوڑ بے ترتیب جوڑے ہوئے ہیں ان پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

استاد بنا جہل مرکب جن کا
کیا سمجھیں گے رنگ غالب و مومن کا
کیا پائیں گے میر اور مرزا کے نکات
باوا آدم ہی جب نیا ہے ان کا

زندگی گزارنا اتنا آسان نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی بات کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔کبھی بنیادی ضرورتوں، روٹی کپڑا مکان تو کبھی نہ ختم ہونے والی ہزاروں خواہشات ہوتی ہیں۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جنھیں بنیادی ضرورتوں نے ان کی زندگی کی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ نہ پیٹ بھر کھانا نہ سر چھپانے کو چھت اور نہ ہی جسم ڈھانکنے کو کپڑا ملتا ہے ایسے میں اونچی اونچی عمارتوں، درختوں اور چٹانوں پر بیٹھے ہوئے رنگ برنگے گدا نھیں نوچ کھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جس کو صفی نے یوں کہا۔

بے فکر معاش کچھ نہ کچھ ہوتے ہم
آرام سے تنہا تو کبھی سوتے ہم
جھوٹی موتی ہی کاش ہوتے آنسو
رونے کو بنے تھے تو رہے روتے ہم

صفی بڑے ہنس مکھ اور زندہ دل انسان تھے بڑی سے بڑی بات بھی بڑی آسانی سے کہہ دیتے تھے جس سے سامعین اور قارئین ہنستے ہنستے رک کر سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں یہ صفی کا سب سے بڑا کمال ہے کہ وہ ہنسی میں فکر کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

کھویا کہیں تو کچھ کہیں پایا ہے
ادلا بدلا تو ہوتے ہی آیا ہے
طفلی میں صفی کھائی تھی ہم نے مٹی
مرنے پہ مٹی نے ہمیں کھایا ہے

کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سونا پسند کرتے ہیں اور جب بھی فرصت ملی تو کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے آرام سے گھنٹوں سوئے رہتے ہیں نہ کھانے کی فکر نہ پینے کی بس سوئے چلے جارہے ہیں۔ایسوں پر طنز و مزاح سے بھر پورا ایک رباعی کچھ اس طرح ہے۔

یارب کیسے وہ آدمی ہوتے ہیں
مردوں سے شرط باندھ کر سوتے ہیں
تارے ڈوبے گجر بجا صبح ہوئی
ہم شام سے آج نیند کو روتے ہیں

آخر میں اپنی بات زور صاحب کے اس اقتباس پر ختم کرتا ہوں صفی کی شعر گوئی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

'' صفی اورنگ آبادی کے کلام کی ابھی پوری اشاعت نہیں ہوئی۔لیکن اخبار اور رسائل میں جو غزلیں ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے وہ اپنے استاد کیفی مرحوم کے حقیقی جانشین ہیں۔ اور مخصوص رند مزاجی اور آزادہ روی کی وجہ سے غزلوں میں استاد سے زیادہ بے ساختگی اور اصلیت نمایاں ہے۔ان کا ہر شعر دل سے نکلتا ہے اور دل تک پہنچ جاتا ہے وہ اس قدر خاموش اور تنہائی پسند ہیں کہ سوائے سخت اصرار کے کسی مشاعرے میں بھی نہیں جاتے اور نہ کوئی خدمت اختیار کرتے ہیں۔حیدرآباد کے متعدد اہل ذوق ان کی شاگردی کے مشتاق ہیں وہ اکثر اس سے گریز کرتے ہیں۔اس کے باوجود ان کے متعدد شاگرد ہیں۔''

(فردوس صفی، ناشر ادارہ اشاعت ادب کراچی، اشاعت بار اول 1968 ص 27)

■

Syed Mahboob Qaudri
Moallim Lesaniat, Jamia Nizamia
Shibli Ganj, Husaini Alam,
Hyderabad - 500002 (Telangana)

شمع اختر کاظمی

منظر کاظمی
سفر مدام کا افسانہ نگار

اردو ادب کے افق پر اکثر کچھ بادل اٹھ کر نئی رتوں کی بشارت اور نئے موسم کے آنے کا پیام سناتے ہیں اور نئی روایت کے ظہور کا سبب بھی بنتے ہیں جو فن کی حرمت و تقدیس کے لیے تقلیدی جدیدیت کے بجائے نئی تخلیقی توانائی پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے بڑے فن کار کی تخلیقات نسل در نسل سفر کرتی ہیں اور ہر عہد میں اپنی اہمیت منواتی، اعتراف کرواتی ہیں۔ اس کے الفاظ و جملے قاری کی سوچ وفکر میں سانس لیتے ہیں۔ یہ اقتباس منظر کاظمی کے افسانوی جہان کی سیر کے بعد گویا بے ساختہ تحریر ہو گئے۔

منظر کاظمی نے اُس عہد میں قلم تھاما جب ترقی پسند تحریک اپنے نقطۂ منتہا پر تھی۔ اس رجحان سے بے اطمینانی اور ادھورے پن کے مل رہے اشارے میں جدیدیت نے پناہ تلاش کی۔ کوئی بھی تبدل وتحریک نہ جاوداں ہوتی ہے نہ ہمہ وقتی۔ ترقی پسند رجحانات نے تو اخلاقی، تہذیبی روایات سے نہ صرف بوسیدگی کا برملا اظہار کیا بلکہ اردو ادب کے زمین وآسمان بدل دیے۔ لسانیات ونفسیات نے نئی کروٹ لی، ادب میں علوم وفنون کے اظہار کا زاویہ بدلنے لگا۔ اس باڑھ میں سب ایک دوسرے کے کاندھے پر چڑھ کر طومار باندھ رہے تھے۔

زندگی اور ادب ہر دور میں تغیر آمیز رہا ہے اور یہی تغیر اور تبدیلیاں زندہ ادب کی مثال بھی ہیں۔ انتہا کے بعد زوال سے جنم لینے والی جدیدیت کو اپنے ظہور کا معقول جواز پیش کرنا تھا۔ اس اندرونی حقیقت کی عکاسی کے لیے افسانے نے علامت، تجرید اور تمثیل کا سہارا لیا، لیکن المیہ یہ ہوا کہ کہانی کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اس روش سے بیزار لوگوں نے اس کے خلاف رد عمل ظاہر کیا کہ ایک صنف کے زوال کا معاملہ نہیں بلکہ کہانی کی گمشدگی پوری انسانیت کا بنیادی جوہر سے محروم ہونا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ کہانی کی گمشدگی کا اعلان جتنی عجلت میں کیا گیا تھا اس کی واپسی کا شہرہ بھی جلد ہو گیا۔

ادب کی سرزمین پر جدیدیت پسند افسانہ نگاروں کی موجود کھیپ میں منظر کاظمی نے اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کیا وہ ہم عصر افسانہ نگاروں سے مختلف تھا۔ وہ مشکل راستوں سے افسانے کو گذراتے ہوئے اس کے اختتام تک پہنچانے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے ایسے پر پیچ راستوں کا انتخاب کیا جہاں ذرا سی لغزش آبروئے ایمان کو خطرے میں ڈال دے لیکن انھیں پل صراط کا پر خطر راستہ ہی راس آیا۔ تلمیحات، استعارات واشارے سے پیمان وفا باندھ کر واقعات کی انگلی تھامے بندگی کے سفر مدام پر رواں دواں رہے۔

ان کا ذہن روحانیت کی جانب محو پرواز رہا، اسلوب پر الہامی صحیفوں اور اسلامی تاریخ وسیرت کی کتابوں کا خاصا اثر تھا۔ ان کے فن کا موضوع اسلامی تاریخی واقعات کی روشنی میں لکھے افسانے ہیں۔

وہیں عہد نامہ قدیم وجدید اور رامائن ومہابھارت کے اشلوک اور واقعات سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔ منظر کاظمی کی زبان جدید بیانیہ کی بہترین مثال ہے۔ افسانوں کے لب ولہجے میں اس کی بنت، انفرادیت، موضوع، اسلوب، طرز احساس زاویہ نگاہ اور قوت بیان جیسے عناصر کا اپنا اپنا حصہ ہے اور ادب میں یہی انفرادی جوہر ایک قابل قدر چیز کہلاتی ہے۔ کسی بڑے فنکار کی شناخت کا ایک حوالہ یہ بھی ہے کہ اس کی نمو کے مراحل اور انفرادی نشانات ایک بڑے کل میں یا اس کے تہذیبی، سماجی اور اجتماعی تناظر میں زیادہ نمایاں اور واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ خاطر نشاں رہے کہ ادب میں جدت پسندی کی بڑی اہمیت رہی ہے مگر جدت پسندی میں بھی تجربہ وہی زندہ وتابندہ رہتا ہے جس کا خمیر زندہ مٹی کی روایت سے اٹھا ہو۔

منظر کاظمی کا رجحان ساز افسانوی مجموعہ 'لکشمن ریکھا' کا پہلا افسانہ 'سیاہ غلاف اور کالے جرنیل' کی گونج ادبی دنیا میں دور دور تک پہنچی۔ مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی تحقیق کے مطابق رسول اللہؐ کی سیرت مبارکہ کو موضوع بنا کر لکھا گیا یہ اردو کا پہلا افسانہ ہے۔ پریم چند نے بھی اس موضوع کو اپنے افسانے میں برتا لیکن مکمل سیرت پاک کی جھلک منظر کاظمی کے افسانے میں نور پیکر کی طرح ڈھل گئی ہے۔ غزوۂ احد، غزوۂ بدر اور غزوۂ حنین کے حوالے سے یہ حقیقت دنیا پر عیاں ہے کہ تعداد کی کثرت یا قلت اہم نہیں بلکہ اصل چیز مقصد اور اس پر استقامت ہے۔

''مقابل میں کوئی بھی ہو پھر بھی فتح انہیں کی ہوتی ہے جن کو ہونی ہوتی ہے اور یہ بات بھی دیکھی گئی کہ تعداد کوئی جنس نہیں ہوتی اور مقصد سے بڑا کوئی جرنیل نہیں ہوتا'' (سیاہ غلاف اور کالے جرنیل)

قران کریم میں رسولؐ کے شرح صدر کا واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے۔ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ، وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ، اَلَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ، وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ اس واقعہ کا 'سیاہ غلاف اور کالے جرنیل' میں یوں بیان ملتا ہے ''کوئی شے ملنے والی ہے تو اس طرح ملتی

ہے کہ سینہ چاک کر کے اس میں سے کچھ نکال لیا جاتا ہے۔حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ افسانہ 'آسمان سے گرتی ہوئی روٹیاں' میں اس طرح بیان ہوا۔"یہ سچ ہے کہ بہت دنوں پہلے ایک شہر میں بہت بڑا بازار لگا کہ اس دن سورج کی تپتی ہوئی دھوپ میں زمین کا چاند فروخت ہو رہا تھا، اسی چاند نے آگے چل کر جھلسا دینے والی گرمیاں ختم کر ڈالیں اور تب دور سے دیکھنے والی دو اندھی آنکھوں والے ایک شخص کو بڑا سکون ملا"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو افسانہ 'کانٹوں کا تاج' میں یوں ڈھالا "ہمیں معلوم ہے کہ دریائے نیل کی موجوں پر ایک بند کمرہ تیرتا تھا اور نیل کے کنارے حوا کی بیٹی دیوانہ وار بھاگتی جاتی تھی۔اسے معلوم تھا کہ بند کمرے میں روشنی کا ایک مینار ہے"۔پروفیسر سید احمد شمیم نے اپنے مضمون 'ذکر اس پری وش کا' میں لکھا "منظر کاظمی نے جہاں اسلامی تاریخ وسیرت کی کتابوں سے استفادہ کیا اور سورۂ بقر، سورۂ یوسف، آل عمران، اعراف، بنی اسرائیل، کہف، طہٰ، قصص، الم نشرح، مزمل، اور سورۃ الفیل وغیرہ کی نورانی تجلیوں سے اپنے اسلوب کو چمکایا وہیں عہد نامہ جدید وقدیم، رامائن اور گیتا سے بھی کچھ رنگ اخذ کیے"۔

مشہور ناقد وشاعر ڈاکٹر لطف الرحمٰن نے لکھا "منظر کاظمی نے تلمیحات واستعارات اور بے حد خوبصورت علامتوں کے ذریعے عہد حاضر کی ان حسیات وکیفیات کو اپنے دلکش اور رگ جاں کو چھو جانے والے اسلوب میں اس طرح پیش کیا کہ قاری ان کے جمالیاتی تجربات ومشاہدات کا محض شاہد ہی نہیں رہ جاتا بلکہ خود فنکار کی طرح ان دکھوں کا نوحہ گر بن جاتا ہے"۔

منظر کاظمی کی کہانیوں میں معنی کی تہہ داری کے ساتھ مختلف سطحوں پر ترسیل وابلاغ کی حسین موجیں ساحل بہ کنار نظر آتی ہیں۔زبان کا استعمال انھوں نے جس تخلیقی اور جمالیاتی سطح پر کیا ہے ساتھ ہی واقعات پر اتنی مضبوط گرفت کہ اس حسین امتزاج سے ایک طلسم خانہ آباد نظر آتا ہے۔اسلامی حقائق پر مبنی واقعات کو تخلیقی عمل سے گزار کر افسانے کے قالب میں ڈھالنا۔اس ہنر کے وہ مشاق فنکار تھے۔اسلوب کی جاذب نظری' بیان میں روانی اور تحریر کی سحر آفرینی ایسی کہ قاری کو باندھ لینے کی خوبی ان کے ہاں بدرجۂ اتم نظر آتی ہے۔اپنے فن کو عبادت سمجھتے اور جب افسانوی الہام ہوتا تو ایسے ایسے تلمیحی وتمثیلی جملے، اسلامی تاریخی واقعات، صفحات پر بکھیرتے جو آج بھی محققین کو دعوت فکر دیتے ہیں۔

معروف افسانہ نگار جوگندر پال نے لکھا۔"منزلیں انجانی ہوں تو مسافر کو خود آپ ہی اپنا راستہ کھوجنا پڑتا ہے۔منظر کاظمی بڑی ثابت قدموں سے اپنی انجانی منزلوں کی ٹوہ میں ہے اور کٹی پھٹی راہیں ہموار کرنے میں جٹا رہتا ہے ایسے ہی فنکار بھٹک بھٹک کر فن کے اچھوتے مقام کو جا لیتے ہیں اور جہاں جہاں وہ بھٹکتے ہیں وہیں کل نئی شاہراہوں کو اہتمام انجام پاتا ہے"۔

اردو کے معروف محقق وناقد ڈاکٹر وہاب اشرفی رقمطراز ہیں "منظر کاظمی کے افسانوں کی قماش ان کے فکری میلان سے مرتب ہوتی ہے۔حیات وکائنات کے پیچیدہ مسائل ان کی تخلیقی حیثیت کو مسلسل مہمیز کرتے رہتے ہیں نتیجے میں جو افسانہ سامنے آتا ہے وہ مسائل سے پابستہ تو ہوتا ہی ہے 'فن کی بنیادی قدروں سے آراستہ وپیراستہ بھی ہوتا ہے"۔

فکشن نگاری میں مصنف کے پاس واقعات کے جوڑ توڑ کی آزادی ہوتی ہے۔کہانی کو افسانہ بنانے کے فن میں اس کا ذوق اور تخیل کارفرما ہوتا ہے لیکن مذہبی حقائق اور تاریخی واقعات کو افسانے کے قالب میں ڈھالتے وقت افسانہ نگار کوئی کرتب نہیں دکھا سکتا یہ حساس اور نازک معاملہ ہے۔جہاں نوک قلم کی ہی نہیں جذبے اور مطالعہ کی بھی آزمائش ہوتی ہے۔ساتھ ہی گردن ایمان تلوار کی دھار پر رکھی ہوتی ہے اور ذرا سی لغزش اسے غازی سے غدار بنا سکتی ہے۔افسانہ 'ایک کجلائی ہوئی شام' سے ایک عبارت دیکھیے۔"وہ خیمہ سے باہر سر بلند کیے سامنے کھلے میدان میں اپنی اولاد کو نیزوں پر لٹکا ہوا دیکھتا ہے اور اطمینان وسکون کے ساتھ اس کی نگاہیں کبھی اپنے پہلو سے بہنے والی ندی پر پڑتی ہیں جو اس کی ماں کا حق تھا اور کبھی دور آسمان کی وسعتوں میں کہ جس کے نیچے حد درجہ روشنی بخشنے والی ایک شے سیاہ غلاف میں ڈھکی ہوئی ہے۔"

منظر کاظمی کو اپنے افسانوں میں اسلامی حقائق کو برتنے کی انفرادیت حاصل ہے لیکن انھوں نے رامائن اور مہابھارت کے اشلوک وواقعات کو بھی اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔سیرت مبارکہ پر 'سیاہ غلاف اور کالے جرنیل' جیسے افسانے لکھے تو ہندو میتھالوجی کو ورشا تا سب سے اہم واقعہ رامائن کے پس منظر میں 'لکشمن ریکھا' جیسا بہترین افسانہ بھی لکھا۔"یہ پرم پرا نہیں یہ بندھی ہوئی بھیک ہے۔اندر سے بھیک دینا رشی کا اپمان ہے آپ کو ایشور سے لگاؤ ہے تو گھیرے سے نکل کر بھیک دیجیے"۔(لکشمن ریکھا)

"اس سفر کے لیے جب چلے تھے تو اپنے سفر پر کسی جٹائیو کی پرواز بھی محسوس نہیں ہوئی تھی اور اس سفر سے ہم واپس آئے ہیں تو اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین بھی سخت ہوگئی ہے"۔(لکشمن ریکھا)

منظر کاظمی نے تلمیحی، تمثیلی اور اسلامی تاریخی حوالوں سے تحریر کردہ اپنے افسانوں کے علاوہ ان موضوعات کو بھی اپنے افسانوں میں بڑی خوبصورتی سے برتا ہے جو آج کے سماجی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں وہ چاہے فرقہ وارانہ فسادات ہوں یا عالمی جنگیں۔

"ایسا ہوگیا ہے کہ کوئی بھی جسم کسی بلوائی کی زد میں آکر موت کے گہوارے میں جھولنے لگتا ہے تو یہ آنکھیں اس کے جسم سے چمٹ جاتی ہیں۔یہ آنکھیں پچھلی نصف صدی سے اس طرح تمام بے جان اور جھولتے ہوئے بدنوں کو ایک ایسے مقام پر یکجا کر رہی ہیں جہاں ایک عدالت کو قائم ہونا ہے"۔(تماشہ جاری ہے)

"لیکن وہ الجھا رہا اور دوسری جنگ عظیم کے واقعات کو ایک نئے سرے سے ترتیب دینے لگا۔اس سے پہلے وہ مہابھارت، پانی پت اور پلاسی کی لڑائیوں کا تجزیہ کر چکا تھا۔اس کے سامنے ہٹلر کا چہرہ گھوم گیا اور اسے فوراً تسلی سی آگئی"۔(سائرن)

....."بچہ خون میں نہایا بہت آرام، بہت مطمئن لیٹا ہوا تھا۔اس کا دایاں ہاتھ نہیں تھا۔میری آنکھوں میں ذرا دیر کے لیے نمی پیدا ہوئی اور پھر ویسے ہی خشک ہوگئی۔میری اٹوٹ توجہ کو بھانپ کر عورت نے جلدی سے ساڑی کے پلو سے لپٹا ہوا اپنے بچے کا دایاں ہاتھ نکال کر میری آنکھوں کے سامنے کر دیا۔"بابو جی یہ ہاتھ جڑ جائے گا۔"(جب دل کا درد بڑھا)

منظر کاظمی نہ تو بسیار نویس تھے اور نہ ہی شہرت کے طلب گار۔کم کم لکھنے کے قائل تھے اور اسی پر عامل رہے۔بظاہر وجہ یہ ہے کہ وہ تکملیت پسند تھے۔انھوں نے وہ لکھا جسے خود اپنی روح میں ایک شدید اضطراب کی صورت محسوس کیا۔اسی وصف اعتدال نے انھیں ایسی معیاری کہانیوں کا خالق بنایا۔افسوس کہ انھوں نے جو کچھ سپرد قلم کیا وہ متعدد رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں اور وہ سب کسی مجموعے کا حصہ نہ بن سکے۔سگریٹ کی لمبی لمبی کش کے درمیان جب قلم ہاتھ میں ہوتا تو درمیان کا وقفہ اور سمٹ جاتا، آنکھیں متفکر اور کچھ ڈھونڈتی ہوئی محسوس ہوتیں۔اپنا سارا رنگ سخن اور اپنی جرات اظہار کے درمیان وہ خود شناسی اور خود آگہی کا مظہر ہوتے۔چونکہ قصہ گوئی ان کے فن میں مضمر اور سرشت میں رواں دواں تھی اسی کا اثر تھا کہ علمی، ادبی اور دیگر قابل فکر موضوعات پر وہ دلچسپ اور خیال آفریں گفتگو کرتے۔ان کی باتوں میں بہت سی باتیں تھیں۔انداز گفتگو کا اپنا سحر تھا اس پر

رائے، دلیلیں اور حوالے تھے وہ بھی مدلل اور ٹھہر ٹھہر کر ایسی گفتگو کرتے کہ درمیان کا وقفہ سامع کو بے چین کر دیتا۔ ایک سماں بندھ جاتا۔ پھر اس حصار کو توڑنے کی جرأت کسی میں نہ ہوتی، وہ خود ہی موضوع بدل دیتے۔

وہ ایک ذہین افسانہ نگار، شفیق استاد، باشعور نقاد، تعلیمی ،سماجی اداروں کے سرگرم رکن اور انجمن ساز شخصیت کے مالک تھے۔ 24 ستمبر 1940 کو وہ اس عالم رنگ بو میں آئے اور 12 اگست 2000 کو اس عالم فانی سے کوچ کر گئے۔ گاؤں کی کھلی فضا، بل کھاتے راستوں، کھیت کھلیانوں، اپنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کا لمس اور نرم نرم دھول کی رفاقت کو اپنے رگ جان سے بھی قریب تر محسوس کرتے۔ کولتار کی سڑکوں سے کیا لپٹے کہ ان کی اپنی ذات خود ایک کہانی بن گئی۔ جمشید پور کو اپنا مسکن ثانی بنایا اور یہیں کی خاک اوڑھ کر مٹی میں رچ بس گئے۔ انھوں نے قصہ ہماری تحریر کا میں کچھ یوں لکھا ''یاد نہیں وہ کون سی گھڑی تھی کہ قصہ سنتے سنتے قصہ سنانے کی ایک بات سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ ہزاروں کوششوں کے باوجود ندی ، تالاب، پنگھٹ، چاندنی، چوپال کی یادوں کے سائے ذہن کی دہلیز سے نہیں اترتے۔''

اردو زبان وادب کے قدر دانوں اور عزیزوں کے درمیان اپنی یادیں اور کتابیں چھوڑیں۔ سو سے زائد کہانیاں، ڈرامے اور مضامین لکھے۔ 'اردو غزل کے اسلوب' پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری رانچی یونیورسٹی سے تفویض کی گئی۔ ساری زندگی دوستوں، عزیزوں اور طلبا کے ہجوم میں رہے اپنی ذات میں ایک انجمن اور بھیڑ میں بھی تنہا۔ ان کی پہچان جدید افسانوں کی شناخت اور بحیثیت استاد ہی نہیں ایک اچھے انسان اور غمخوار دوست کی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اپنی جھولی میں دوسروں کے غم سمیٹے رہنا اوروں کے راز کی حفاظت کرنا، ایسی بھی انفرادیت ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ وقت کے غبار میں وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگئے لیکن ہماری یادوں میں ہی نہیں، ہمارے دلوں میں بھی وہ زندہ ہیں۔ ان یادوں سے واپس آنا آج تک ممکن نہیں ہو سکا۔ نہ جانے انھیں منزل مقصود پر پہنچنے کی اتنی جلدی کیوں تھی؟ ابھی تو حیات بے اعتبار کی راہیں منور بھی تھیں اور گلپوش بھی۔

انھوں نے اپنی سفید پوشی آخر دم تک قائم رکھی جو ان کے گرد ایک حفاظتی دیوار کی طرح حائل رہی کہ یہ بھی ایک بڑا وصف تھا۔ اپنی ذمہ داریوں سے بڑھ کر جدوجہد اور بے پناہ ذہانت جیسی خصوصیات انھیں یونیورسٹی میں ٹاپ پوسٹ تک جانے کا راستہ ہموار کر چکی تھی لیکن ان

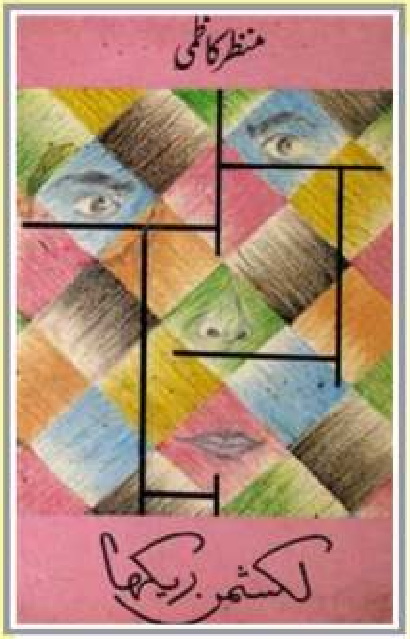

عہدوں کی کشش انھیں کبھی مرعوب نہ کر سکی۔ ان کی پوری توجہ کریم سٹی کالج کی ترقی اور بقا پر مرکوز تھی۔ کالج کے تنظیمی ڈھانچے کو مضبوط اور معیار تعلیم کو اس مقام تک لے جانے کی کوششوں میں وہ لگے رہے جہاں وہ ملک کے بڑے بڑے کالج کے مقابلے میں کھڑا ہو سکے۔ بحمد للہ اس نیک مقصد میں وہ کامیاب ہوئے اور کریم سٹی کالج کو برگ وبار ہی عطا نہیں کیا، ثمر آور بھی بنا گئے۔ اس تگ ودو اور مصروفیت نے انھیں اپنے افسانوی مجموعے کی اشاعت کے تعلق سے سوچنے تک کی مہلت نہ دی۔ بار بار کے اصرار کے بعد بالآخر اپنے چھوٹے بھائی اختر کاظمی کو اس کی اجازت دی کہ وہ اس کام کو انجام دیں۔ اب مسئلہ کہانیوں کو مختلف رسائل سے ڈھونڈ نکالنے کا تھا۔ گھر میں پڑی ردی فائلوں، لائبریری سے حاصل رسالوں اور الماری کی درازوں میں تلاش شروع ہوئی۔ کوئی بھی کہانی نہ طریقے سے رکھی ملی اور نہ سلیقے کی جگہ پر تھی۔ ہر صفحہ اپنے فنکار کی عجلت کا شکار تھا۔ تلاش بسیار سے لے کر طباعت تک کے مراحل کی ساری ذمہ داری اختر کاظمی نے بخوبی نبھائی۔ جاذب نظر و پرکشش سرورق ان کے شاگرد عزیز جاوید اختر نے ڈیزائن کیا۔ اس طرح 17 افسانوں پر مشتمل مجموعہ 'لکشمن ریکھا' عالم وجود میں آیا۔ حالیہ دنوں میں مزید چھ افسانوں کے اضافے کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ جس کی ترتیب ثانی کی ذمہ داری ڈاکٹر افسر کاظمی نے نبھائی۔

بیانیہ افسانہ ادب کا ایک قابل قدر سرمایہ کہلاتا ہے۔ کیونکہ بیانیہ کہانیاں جب تخلیقی عمل سے گزرتی ہیں تو اپنے زرتار آنچل میں تمثیل، تشبیہ واستعارے کے گل بوٹے سجائے دوسروں کی آنکھوں کو بھی خیرہ کرتی ہیں اور تحریر پر ایک معنی خیز تہہ چڑھ جاتی ہے لیکن فنکار اسے برتنے کی خوبی سے کما حقہ واقف ہو افسانے کے بطن سے لے کر اس کے خدوخال کی زیبائش کر سکے، پیراہن بھی دھلا اور نیا ہو اور ساتھ ہی کہانی کی تکمیل اور سمت ورفتار کے لگام کو اپنی بصیرت سے وہ تھامے رکھے۔ منظر کاظمی نے علامت نگاری کو اپنے افسانوں میں جس خوبی سے برتا وہ اردو افسانوں میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جھیل، جھرنے، نیند، روٹی، کھیت، کھلیان، سورج، دھوپ، آنکھیں اور چاند جیسے لفظوں کا استعمال، اشاریہ کے طور پر کیا ہے لیکن چاند کو مختلف معنی اور مفہوم کی ادائیگی کے لیے کئی مقام پر استعمال کیا یا یہ کہا جائے کہ اپنے افسانوں کے سر پر ایک ٹھنڈے روشن چاند کا سائبان قائم رکھا تو بجا ہوگا۔

''یہ سچ ہے کہ بہت دنوں پہلے ایک شہر میں بہت بڑا بازار لگا تھا کہ اس دن سورج کی تپتی دھوپ میں زمین کا ایک چاند فروخت ہو رہا تھا۔'' (آسمان سے گرتی ہوئی روٹیاں)

''واقعہ یہ ہے کہ پشت پر اگر چاند چمکتا ہو تو لوگ چہرہ دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ اس کو گھر لوٹ جانا چاہیے''۔

''پوری دنیا آسمان سے زمین تک اندھیرے کے غلاف میں ڈھک گئی ہے لیکن یہ جو گل لالہ ہے اس پر نہ جانے کہاں سے چاند کی ایک کرن آ کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔'' (کانٹوں کا تاج)

ہمارے ایک بزرگ نے کہا ''لکھنے کا ہنر اور قلم خدا سب کو عطا نہیں کرتا۔ قلم ہاتھ میں ہو تو اپنی ذات اجالنے اور اشتہار بنانے سے پرہیز کرنا چاہیے لیکن ہمیں یہاں لکھنا ہی پڑا کہ منظر کاظمی کو چاند، چاندنی اور چاندنی راتیں بہت لبھاتی تھیں۔ ایک دفعہ کسی موقع پر خاندان کے تمام لوگ گاؤں کے پشتینی گھر میں اکٹھا تھے۔ رات کا وقت تھا سبھی فارغ تھے جسے جہاں جگہ ملی بیٹھے گفتگو میں شامل تھے۔ انہوں نے آسمان کی جانب رخ کر کے ہمیں متوجہ کیا۔ کہا '' دیکھتی ہو کتنی جگمگاتی روشن چاندنی رات ہے۔ فضا میں کیسا سکوت طاری ہے تم نے کبھی چاند تاروں کی چھاؤں میں کھلے آسمان تلے سو کر دیکھا ہے۔'' ہمیں بے ساختہ ان کی کہانیوں کے چاند یاد آ گئے۔ پھر انھوں نے اپنی والدہ (یعنی میری خوش دامن) کو مخاطب کر کے کہا آج ان کی چارپائی آنگن میں بچھوایئے۔

■

Shama Akhtar Kazmi
12/14, Sai Nagar
Bhiwandi - 421302 (MS)
Mob.:9284690949

محمد عارف

بلراج کومل
منفرد لفظیات کا شاعر

بلراج کومل 25 ستمبر 1928 کو ضلع فیروز پور پنجاب موجودہ پاکستان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شری حکومت رائے اور والدہ کا نام کنتی دیوی تھا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک پرائیوٹ اسکول سے حاصل کی۔ پانچ بھائی بہنوں میں کومل دوسرے نمبر پر تھے۔ بچپن ہی سے آزاد خیال اور پڑھائی لکھائی سے دور رہتے تھے مگر والد کی ڈانٹ ڈپٹ سے کسی طرح ہائی اسکول اور انٹر پاس کرلیا۔ مزاج چونکہ شاعرانہ تھا اسی لیے اکثر دوستوں کے ساتھ ایسی محفلوں میں شریک ہوتے جہاں ادب وشاعری کی باتیں ہوتی۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور چلے گئے وہاں انھوں نے انگریزی ادب میں بی اے کیا۔ یہاں ان کی ملاقات انگریزی، اردو، ہندی اور پنجابی کے ادیبوں سے ہوئی۔ ان فنکاروں کی صحبت میں رہ کر کومل کا تخلیقی دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تخلیقی ادب میں ان کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ادبی رسائل وجرائد کا پابندی سے مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ بی اے کے بعد کومل نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ انگریزی کے علاوہ کومل نے دیگر زبانوں کے ادب کا بھی مطالعہ کیا خصوصاً اردو، جاپانی اور فرانسیسی ادب کا چونکہ ان کا ادبی ذوق اردو کے خمیر سے تیار ہوا تھا اس لیے اردو ادب کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ابھی کومل نے اردو ادب میں قدم ہی رکھا تھا کہ تقسیم ہند کا سانحہ پیش آگیا۔ اس افراتفری میں ہجرت کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ تقسیم ہند کے تحت رونما ہونے والے حالات کے زیر اثر کومل نے اپنے جذبات کا اظہار اس انداز سے کیا ہے۔ خصوصاً ہجرت کے وقت جن مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جو کچھ بھی محسوس کیا اسے لکھ دیا:

''فیروز پور پہنچ کر میں ریاضیات میں الجھ گیا میری شامیں اور راتیں پہلے سے زیادہ آزاد ہوگئیں۔ ہر شب ایک لشکر میرے شہر دل پر یلغار کرتا۔ میرے سامنے مردوں، عورتوں اور بچوں کو بے رحمی سے قتل کرتا اور درماندہ ومحروم چھوڑ کر آگے نکل جاتا۔ میرے سامنے روز وشب ایک خوف زدہ برہنہ پا مجروح ایک سایہ چلتا۔ ایک لڑکی کا سایہ ہر لمحہ التجا کرتا ہوا سایہ، میرے چلتے ہوئے قدموں سے التجا کرتا ہوا سایہ۔'' (شعر وحکمت بلراج کومل)

اجنبی! اپنے قدموں کو روکو ذرا/ جانتی ہوں تمہارے لیے غیر ہوں
پھر بھی ٹھہرو ذرا/ سنتے جاؤ یہ اشکوں بھری داستاں
ساتھ لیتے چلو یہ مجسم فغاں/ آج دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں
میری امی نہیں، میرے ابا نہیں، میری آپا نہیں
میرے ننھے سے معصوم بھیا نہیں/ میری عصمت کی مغرور کرنیں نہیں
وہ گھروندا نہیں جس کے سائے تلے/ لوریوں کے ترنم کو سنتی رہی
پھول چنتی رہی، گیت گاتی رہی، مسکراتی رہی
آج کچھ بھی نہیں آج کچھ بھی نہیں/ میری نظروں کے سہمے ہوئے آئینے
میری امی کے، ابا کے آپا کے اور میرے ننھے سے معصوم بھیا کے خوں سے ہیں دہشت زدہ
آج میری نگاہوں کی ویرانیاں چند مجروح یادوں سے آباد ہیں
آج میری امنگوں کے سوکھے کنول، میرے اشکوں کے پانی سے شاداب ہیں
آج میری تڑپتی ہوئی سسکیاں ایک ساز شکستہ کی فریاد ہیں
اور کچھ بھی نہیں، بھوک مٹتی نہیں، تن پہ کپڑا نہیں، آس معدوم ہے
آج دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں آج دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں
میرے کچھ تو بنو، میرے کچھ تو بنو، میرے کچھ تو بنو۔

(لمبی بارش منتخب کلام: بلراج کومل، ص 22، ساہتیہ اکادمی، دہلی 2002)

بلراج کومل نے یوں تو افسانہ، تنقیدی مضامین، تراجم، تبصرے، مباحثے، خاکے اور مضامین وغیرہ سب میں زور آزمایا ہے مگر ان کی بنیادی حیثیت ایک شاعر کی ہے۔ شاعری میں غزل اور نظم دونوں موجود ہیں ان کے نو مجموعے ہیں جن میں نظمیں زیادہ اور غزلیں کم ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، جاپانی، بنگلہ، پنجابی اور ہندی سے بہت سی نظموں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ مثلاً نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم، ہائیکو، سن

رائی یو، امایو، ٹینکا اور سڈوکا، وغیرہ کو اسی کی ہیئت میں بیان کیا ہے۔ یہ جدید شاعری کے وہ تجربے ہیں جو اس زمانے میں رائج تھے۔

کومل نے پاکستان سے ہجرت کر کے دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کی ملاقات پرکاش پنڈت، ساحرلدھیانوی، مجازلکھنوی، وامق جونپوری اور کرشن ادیب سے ہوئی ان ادیبوں کے ساتھ شعر وادب کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں لیکن سب سے اہم مسئلہ معاش کا تھا چنانچہ تلاش معاش کا سلسلہ جاری رہا کبھی جالندھر کے اخباروں، ریڈیو کی خاک چھانی اور کبھی دہلی میں درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ بلراج کومل نے اپنے تخلیقی سفر کا پہلا موڑ بچپن کے اس گھر کو قرار دیا ہے جہاں وہ پیدا ہوئے پلے بڑھے جوان ہوئے۔ زندگی کے حسین لمحے گزارنے کے بعد وہاں سے فرار ہونے کا خواب دیکھنے لگے۔ ہجرت کا سانحہ اسی خواب کی تعبیر ثابت ہوئی۔ اور لمحۂ موجود میں آکر بس گئی۔

میں مسکنِ تیرگی سے دبکی ہوئی فضاؤں میں آگیا ہوں
یہاں تسلسل ہے دھم دھما دھم کا، ان گنت پاؤں ایک دھن سے لپک رہے ہیں
یہاں صداؤں کی تیز گامی سے ساری دھرتی لرز رہی ہے
لبوں پہ نغمہ ہے قہقہوں کا، نگاہ میں چشمہ ہے زندگی کا
یہ کارواں وادیٔ مسرت کی آرزو میں رواں دواں ہے

بلراج کومل نے اپنے تخلیقی سفر کا دوسرا موڑ اپنی بیوی گارگی اور بچے مینوں اور بیٹی انیتا کو قرار دیا ہے کومل اپنی زندگی کے اس سرمائے کو کبھی کھونا نہیں چاہتے تھے یہ سرمایہ ان کے لیے کسی لمحہ موجود سے کم نہ تھا۔ وطن سے دوری کے بعد یہی ایک سہارا تھا جس کے لیے کومل نے اپنی تمام خواہشوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ ان کی شاعری میں رشتوں کا انہدام بھی ہے مگر ان کا اپنا خاندان ان کی زندگی کا مرکز رہا۔ اس کا عکس ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

آج سے کئی برس پہلے بڑے بیٹے مینو نے مجھے کاغذ کی معنویت سے روشناس کرایا تھا۔ اس رات بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ صبح میں بیدار ہوا تو میرے

سامنے کھل اٹھے چاروں طرف، بچوں کے رنگین قہقہوں اور تالیوں کے شوخ پھول
رات بھر کی تیز بارش کی بنائی جھیل میں
ڈگمگائی ڈولتی
چل رہی تھیں چھوٹی کشتیاں
میں نے دیکھا، ان میں ننھے کی بھی تھی پیاری سی ناؤ
نظم کا نقشِ گریزاں، جانا پہچانا سا کاغذ جانے پہنچانے حروف
ننھا بولا! آج جو تالی نہ پیٹے بے وقوف

کومل نے آنے والی نسلوں کے لیے اپنے آپ کو زندہ رکھا زندگی میں ایسے بھی مراحل آئے جب کومل زندگی سے ناامید ہو چکے تھے ایسے وقت میں ان کی بیوی گارگی نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور جہاں کہیں بھی وہ جاتے ان کے ساتھ رہتیں وہ ایک تھی ہزار صورتیں اختیار کرتی گئی سولہ برس سے چونسٹھ برس کی عمر تک وہ ہر لحہ ان کی زندگی کا مرکز بنی رہیں۔

''ایک تھی ہزار صورتوں میں میرے سامنے
طلوع جب ہوئی/ تو میرا آسمان بن گئی
نئی عظیم لذتوں کے درمیان
میں اپنے مشتعل مقام سے/ افق کی سمت پھیلتا چلا گیا
حصار مرگ و زندگی روندتا چلا گیا''

(ایک عورت)

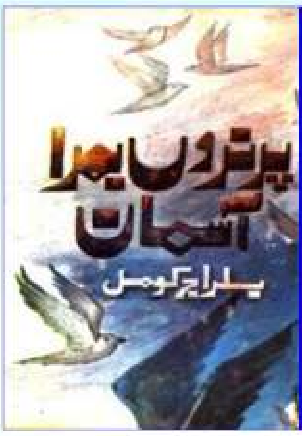

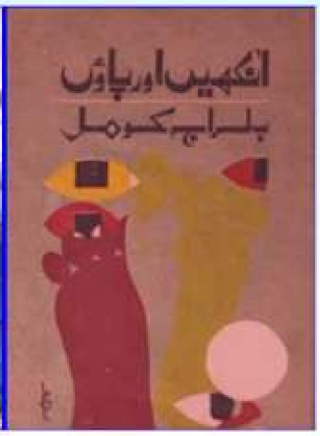

اس طرح کومل نے اپنا تخلیقی سفر شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ادب کے افق پر ایک روشن ستارہ بن کر ابھرے۔ اردو شاعری میں جدید نظم نگاروں کے زمرے میں شامل ہو کر اپنی الگ شناخت قائم کی خصوصاً نظموں میں جدید رنگ و آہنگ اور منفرد لہجے میں نظمیں کہی ہیں۔ اس زمانے میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ اور نظموں کا چلن عام تھا۔ اس تحریک سے وابستہ شعرا اجتماعی طور پر سماجی مسائل کو حل کرنے کا طریقہ دریافت کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اشتراکیت کے سماجی تصور پر یقین رکھنے والوں میں اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی اور پرویز شاہدی وغیرہ تھے۔ اسی کے متوازی حلقۂ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والوں کا ایک گروہ بھی تیار ہو گیا تھا جس نے نظموں کو ہی اپنا وطیرہ بنایا ان شعرا نے زندگی کو نئے زاویے اور جمالیاتی پیرائے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے جدید شاعری کی روایت قائم کی قدیم اثاثے کو تسلیم کرتے ہوئے انھوں نے نئی علامتیں، نئے استعارے، جدید موضوعات، ہیئت واسلوب کو نت نئے طریقے سے پیش کیا۔ ہیئت کے اعتبار سے انھوں نے نظموں میں بہت سے تجربات کیے مثلاً پابند نظم، نظم معریٰ، آزاد نظم اور نثری نظم وغیرہ۔ اس کے متعلق یونس جاوید لکھتے ہیں:

''حلقے والے اپنے آپ کو پچھلی روایات سے منسلک کیے ہوئے تھے۔ مگر گزشتہ روایات اور ادب کے اثاثے کو تسلیم کرتے ہوئے انھوں نے اپنے لیے نئی علامتوں، نئے تلازمات اور نئے موضوعات کو منتخب کیا کہ اگر انھیں رومانی حقیقت پسند کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔''

(ص: 43-42 حلقۂ ارباب ذوق: یونس جاوید، مجلس ترقی ادب لاہور کلب روڈ 1984)

حلقۂ ارباب ذوق والوں نے فن برائے فن کی بنیاد پر نظموں کا ایک مجموعہ تیار کیا اس میں ان نظم نگار شعرا کی نظمیں شامل تھیں جن کی شاعری حلقۂ ارباب ذوق کے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں کارگر ثابت ہوتی تھیں۔ اس میں بلراج کومل کی نظم ''اکیلی'' بھی شامل تھی۔ اس کے بعد ہر برس نظموں کا انتخاب شائع ہونے لگا اس میں کومل کی نظمیں بھی شامل ہوتیں۔ یہ سلسلہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ چلتا رہا کہ 1955 اور 60 کے درمیان جدیدیت کا رجحان فروغ پانے لگا جسے بعض لوگ ترقی پسند تحریک کا ردعمل یا توسیع کہتے ہیں۔ جدیدیت کے علمبرداروں میں منیر نیازی، خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، عزیز قیسی، بلراج کومل، شمس الرحمٰن فاروقی، وحید اختر اور عمیق حنفی وغیرہ شامل تھے۔ ان شعرا نے تخلیقی خود آگہی کو اہمیت دی، اجتماعیت سے انحراف کی صورت اختیار کی اور انفرادی مسائل کو اپنا مقصد بنایا۔ ایسے وقت میں شعرا نے 'جدیدیت' کا سہارا لیا اور وجود کی بقا و تحفظ کی خاطر زندگی کے باطنی کرب کو بیان کرنا شروع کیا، اس کے لیے

علامت اور استعارے کا طریقہ اختیار کیا۔ کومل نے بھی اسی استعارے اور علامت کے سہارے نئی لفظیات کی بنیاد پر اپنی انفرادیت قائم کی۔ کومل کی ایک نظم 'ایمبولنس' ہے یہ استعارہ معاشرے کی بیماری کو ظاہر کرتا ہے۔ ہر انسان جو جدید زمانے سے نبرد آزما ہے وہ غنودگی کی حالت میں بے کراں مہیب دھند میں بھٹک رہا ہے۔ بظاہر تو وہ گاڑیوں، بسوں اور کاروں پر سوار نظر آتا ہے مگر اندر سے وہ بیمار ہے۔ سائنسی ترقی اور تکنیکی جدید کاری کے سبب ہم سب الم نصیب ہیں جو بے اماں مکان میں مقیم ہوگئے ہیں۔ ان کی ایک مشہور نظم 'کاغذی پھول' بھی اسی عہد کی عکاسی کر رہی ہے:

تمھارے گلشن میں اس برس اک عجیب دھج ہے
ہر ایک ڈالی پہ جھوم اٹھے ہیں بموں کے خوشے
چمک رہے ہیں گل تر پہ آج تازہ لہو کے قطرے
فضائے مضطر میں سرخ آہیں/ جہاز اور چاند کے شکاری
گرج، دھمک، شور، آہ وزاری
روش روش پر کٹے پھٹے جسم، ہڈیاں اور سرد لاشیں
دلوں کی قاشیں/ یہ موسم گل/ کتاب فطرت کا اک نیا باب لکھ رہا ہے
یہ کاغذی پھول خوبصورت ہیں/ دھوپ سے ان کو دور رکھو

بہار کے بعد ان کو اپنے اجاڑ گلشن کی مردہ شاخوں پہ ٹانک لینا
سفوفِ تہذیب پھانک لینا/ کھنڈر کی مٹی سے ننھی چڑیا کا بت بنا کر
کچھ اپنی کہنا/ کچھ اس کی سننا

اس نظم کا ایک ایک مصرع علامتی پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ اس کی لفظیات جدیدیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے مثلاً: ہر ایک ڈالی پہ جھوم اٹھے ہیں بموں کے خوشے، گل تر پر تازہ لہو کے قطرے دکھائی دے رہے ہیں، دلوں کی قاشیں، سفوفِ تہذیب پھانک لینا، کھنڈر کی مٹی سے ننھی چڑیا کا بت بنانا وغیرہ۔ پوری نظم ڈرامائی پیکر کی صورت میں جدید عہد کی عکاسی کر رہی ہے انسانی ترقی کے منفی پہلوؤں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ کومل نے ماضی کی فرسودہ روایات کے ذریعہ پیدا ہونے والے نتائج کو اپنی نظموں میں بھرپور انداز سے بیان کیا ہے۔ ایک نظم ''نوادر کی دکان!'' میں دکان اس کائنات کا استعارہ بن گیا ہے کہ یہ دنیا ایک بازار کی مانند ہوگئی ہے جہاں ہر چیز اپنی قیمت پر فروخت ہو رہی ہے۔ کومل نے اس جذبے کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

بتِ سلامت کا ایک پیسہ بتِ شکستہ پہ گاہکوں کا
ہجوم ہم نے نہ دیکھا ایسا قبائے زریں
قبائے زریں پہ گوٹ سے اور گوٹ کی پر بہار قوسیں
مجھے نہ کیوں کھلبلی دلوں میں
یہ ترک شہزادیوں کے لہنگے۔ یہ آریاؤں کے سوم رس کے
گھڑے ہیں مہنگے، یہ شیو کی مورت، گنیش کی ہولناک صورت
یہ قائم زاویہ بناتی۔ خدا کی ٹانگیں
یہ راجپوتوں کے (مونچھ) کے بال چار سو ہیں
نہ کھا سکوں گا اور قسمیں
یہ سلطنت کے رموز لے لو۔ یہ کرم خوردہ کتاب لے لو
ہزار میں؟ دو ہزار میں؟ دس ہزار دے دو
یہ سنگ مرمر کا پھول لے لو۔ یہ ایک آنے میں، ایک آنے میں دو ٹکے میں

وہ ان سب کو بیچ کر ایک نئی سلطنت قائم کرنا چاہتا ہے جس میں انسانیت کے علمبردار رہتے ہوں جہاں امن وسکون کا بازار لگتا ہو۔ وہ اپنا مذہب، اپنی تہذیب، اپنا ماضی، سب کچھ قیمتاً فروخت کرنا چاہتا ہے۔ یہ سب بے معنی اور فرسودہ ہیں۔ کومل نے انسان کے وجودی کردار کے کرب واذیت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

کومل کی نظموں میں اجنبی پن کا احساس، زندگی کے تلخ تجربات، جنسی استحصال، رشتوں کا انہدام، جسم وروح کی کشمکش اور وجود کی تلاش استعارے کے پیرائے میں بیان ہوئے ہیں ان کے مجموعے: سفر مدام سفر، نژادِ سنگ، پرندوں بھرا آسمان، شہر میں ایک تحریر اور رشتۂ دل وغیرہ کی نظمیں سنہ 60 کے بعد کی شاعری میں اہم مقام رکھتی ہیں ان کی مشہور نظمیں جو اپنی انفرادیت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں ان میں۔ کاغذی پھول، عالمِ کل، نوادر کی دکان، سرکس کا گھوڑا، سائے کے ناخن، ایمبولنس، جزیرے، آخری شہر جل چکا، دھوپ کی قاشیں، موت سے ماورا صرف انسان، روزن، درختوں کا سلسلہ، الفاظ، حرف شیریں، گرتے ستاروں کے دریا، چیچی، نیم شگفتہ روشن، دھوپ برہنہ ہوگئی، آسمان میں آگ، پابستہ، ایک لڑکی، چاپ، آوازوں کا جنگل، ایک بے عنوان تصویر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

کومل کی نثری نظم میں قدروں کا زوال، عہدِ حاضر کا تعفن، گھٹن، خواب، اندھیرا پن، موت، بے راہ روی اور رشتوں کے انہدام کا احساس شدید طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ نثری نظموں میں تاریک سمندروں کی صدائیں، آنکھیں، اگلے برس کا موسم، سوگندھی اور تم نے ایک روز وغیرہ اچھی نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ کومل کا آخری مجموعہ 'اگلا ورق' 1996 میں آیا اس مجموعے کی زیادہ تر نظمیں علامتی پیرائے میں بیان ہوئی ہیں۔ اس میں خوف، عدم تحفظ کا احساس، رشتوں کی بے معنویت، تقدیر اور قسمت کا دھوکہ، موت کا جشن، ماضی کی حسین داستان، جدید معاشرے کی تصویر اور احساسِ جرم وغیرہ کا بیان کیا گیا ہے۔

کومل کی انفرادیت ان کی لفظیات، تراکیب اور اندازِ بیان ہے کومل نے روایتی تراکیب اور لفظیات کو جدید پیرائے میں بیان کیا ہے۔ بعض علامتیں ابہام اور ماورائی کیفیت اختیار کر لیتی ہیں، اس کے علاوہ ان کے یہاں غیر مرئی اشیا، ٹھوس اشیا اور اساطیر کا استعمال بھی موجود ہے۔ کومل نے فن سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا خواہ موضوع کی سطح پر ہو یا اسلوب کی سطح پر وہ ماضی سے بیزار، حال سے ہم آہنگ اور روشن مستقبل کی امید پر اپنے فن کو فروغ دیا ہے۔

■

Mohd Arif
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

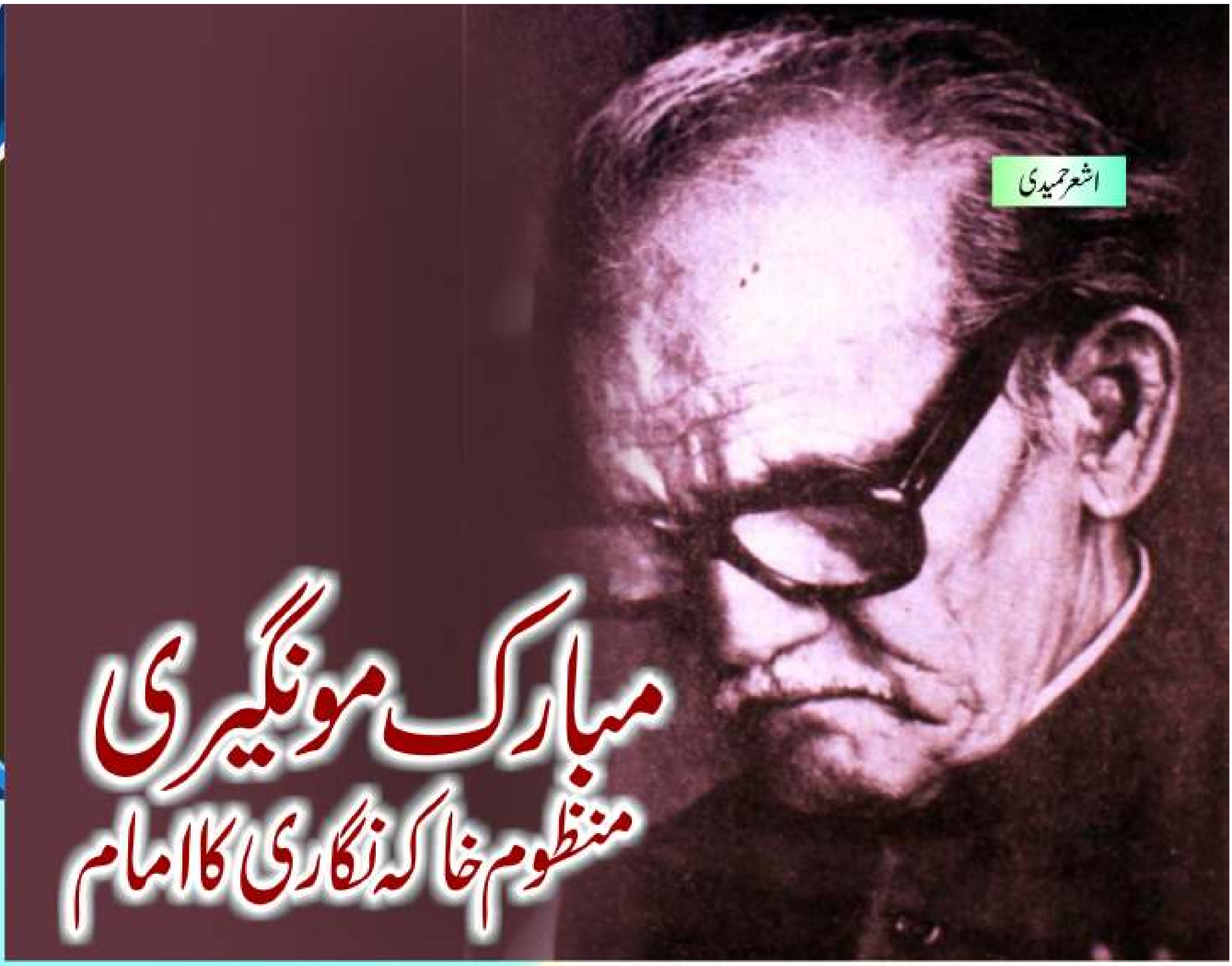

مبارک مونگیری
منظوم خاکہ نگاری کا امام

اشعر حمیدی

مبارک مونگیری ایک چھوٹے سے گاؤں حسینہ میں پیدا ہوئے۔ یہ دہقانوں کا گاؤں تھا جس پر دریائے گنگا کی طغیانی کی وجہ سے ہجرتوں کا سلسلہ لگا رہتا۔ آخرکار پوری آبادی منتقل ہوکر لکھمنیاں سے تقریباً 2 میل کے فاصلے پر اس کے شمال مغربی حصے میں بس گئی۔ اس انتقالِ مکانی کے اچھے اثرات مرتب ہوئے اور وہاں سے بھی وکلا، اطبا، اور تجار کی کھیپ نکلی۔ گو شعر و سخن کا چرچہ تب بھی نہ تھا اور اب بھی نہیں ہے۔ گویا مبارک وہاں کے لیے ایک منفرد باب کی مانند ہیں۔ ابتدائی عمر ہی سے اپنے میلانِ طبع کی بنا پر شعرا کی صحبت اختیار کرتے۔ مونگیر شہر اور لکھمنیاں کے ادبی ماحول سے لگاؤ نے ان کی جولانِ طبع کو مہمیز لگایا اور یہ ان دونوں مقامات کی شعری مجالس میں شریک ہونے لگے جس سے رفتہ رفتہ ان کی شناخت قائم ہوگئی۔ انھیں یہ احساس تھا کہ محض دو میل کی دوری پر ایک گہوارۂ علم و ادب لکھمنیاں ہے جہاں کی تہذیب و تمدن قابلِ تقلید بھی ہے اور جس کا اعتراف سب کرتے۔ لیکن حسینہ پر اس کے اثرات کم ہی محسوس کیے جاتے تھے۔ لہٰذا مبارک مونگیری نے حسینہ میں علمی و شعری فضا قائم کرنے کی مخلصانہ کوشش شروع کی۔ وہ صاحبانِ علم و فن کو اپنے گھر پر مدعو کرتے اور محفلِ شعر و سخن سجاتے، اپنا کلام سناتے اور دوسروں کا کلام سنتے جس سے وقتی طور پر ہی سہی ادبی ماحول بن جاتا۔

ان کی شاعری کو چار چاند تب لگا جب وہ تلاشِ معاش میں ڈھاکہ گئے اور پھر وہیں کے ہوکر رہ گئے۔ نئے لوگ اور قدرے آسان سی زمین پر ان کا اعتماد بڑھتا چلا گیا اور جلد ہی ایک استاد شاعر کی حیثیت سے مخصوص حلقہ سے جانے جانے لگے۔ گو انھیں احساس تھا کہ

رہِ وفا میں مبارک یہ بے بسی میری
میں کارواں سے بچھڑ کر ہوں نقشِ پا کی طرح

مبارک مونگیری کا عہد صنفِ غزل کے لوٹنے سے معنون ہے۔ گو اب بھی نظم نگاری کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور اس میں نت نئے تجربات ہوتے رہتے تھے۔ مبارک نے کئی عمدہ نظمیں لکھیں، لیکن شاید وہ اس پر مطمئن نہ ہوئے اور خود ایک تجربہ کر ڈالا۔ یہ تجربہ منظوم خاکوں کی شکل میں سامنے آیا۔ اردو میں خاکہ نگاری کی روایت نثر ہی میں رہی ہے۔ صرف استاد شاعر مرزا رفیع سودا کے کلام میں اس حوالے سے کچھ مواد مل جاتا ہے اور اگر کسی اور نے اس سلسلے میں کوشش کی تو اس میں تسلسل نہیں پایا جاتا۔ اس کو ایک منفرد صنفِ شاعری کی طرح اختیار کرنے کا سہرا مبارک مونگیری کے سر جاتا ہے۔ گو یہ کام انھوں نے اپنی زندگی کے آخری پڑاؤ اور دوسری ہجرت کے بعد یعنی قیامِ کراچی کے دور میں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اخبار 'جسارت' میں ایک مستقل عنوان 'بوجھیں تو جانیں' شروع کیا گیا جس میں ابوناصر کے قلمی نام سے ہر جمعہ کے روز ایک شخصی خاکہ نظم کیا ہوا شائع ہوتا۔ اس سلسلے میں علی حیدر ملک کی روایت کردہ بات دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''مبارک مونگیری صاحب شاعری کی ہر صنف، ہر ہیئت اور ہر اسلوب پر کامل دسترس رکھتے تھے، اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک دن میں نے ان سے کہا کہ آپ مختلف شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں نظموں کا سلسلہ شروع کیجیے۔ التزام اس میں یہ ہو کہ ہر لکھنے والے کی شخصی، ادبی خصوصیات کی طرف واضح اشارے موجود ہوں مگر براہِ راست نام نہ لیا جائے۔ مبارک صاحب کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی... شاعری حیثیت سے اس

میں مبارک مونگیری کے بجائے ابوناصر کا نام چھپتا تھا۔ کچھ لوگ ان نظموں پر چیں بہ جبیں ہوئے مگر ادیبوں کی بڑی تعداد اور قارئین کے وسیع حلقے نے اس سلسلے کو پسند کیا۔ ہر جمعہ کو ایک نظم پابندی سے شائع ہوتی اور ادبی حلقوں میں موضوعِ گفتگو بن جاتی۔ اکثر لوگ نظم کی تعریف کرنے کے بعد شاعر کا نام دریافت کرتے لیکن آخر وقت تک صرف دو چار اشخاص ہی کو معلوم ہو سکا کہ ابوناصر کے پردۂ زنگاری میں کون ہے۔

مبارک نے خود کہا ہے۔

گمنام آدمی کا دنیا میں کارنامہ
منسوب ہو رہا ہے مشہور آدمی سے

منظوم خاکے مبارک نے ادیبوں، شاعروں، ایڈیٹروں، پبلشروں کے لکھے جن میں زبان و بیان پر بلا کی قدرت کا احساس ہوتا ہے۔ مختصر الفاظ میں جیتا جاگتا پیکر تراش کر رکھ دیتے۔ وہ اس طرح خاکے بناتے کہ ممدوح زیرِ لب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا اور جس کا خاکہ اڑایا گیا ہوتا وہ بھی اصلاح کے پہلو کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے کچھ خاکے ملاحظہ کریں اور تب شاعر کی قادرالکلامی کا اندازہ کریں۔ مجنوں گورکھپوری کے خاکہ کے چند اشعار

دیوانۂ ادب ہیں لیلائے شاعری ہیں
دُبلے نحیف جیسے خود قیس عامری ہیں
نقاد کیا سراپا نقد و نظر سمجھیے
استاد کیا انھیں تو استاد گر سمجھیے
ناقد ادیب شاعر کیا کیا بتاؤں کیا ہیں
مغرب کے فکر و فن کے اردو میں ترجمہ ہیں

شہرت محیط ان کی ماضی سے حال تک ہے
عظمت ملی ہے جتنی حدِ کمال تک ہے

مجنوں گورکھپوری کی شخصیت اور فن پر کیسا بلیغ تبصرہ بھی ہے اور سراپا نگاری کا کمال بھی۔

مبارک مونگیری اپنے بیشتر خاکوں میں ممدوح کا نام تو نہیں لیتے لیکن اشاروں، کنایوں میں ان کے فن پاروں کے نام لے کر، ڈیل ڈول کا ذکر، ان کے مخصوص انداز و اطوار کے بیان سے ایسا نقشہ کھینچ دیتے ہیں کہ لوگ بہ آسانی سمجھ لیں کہ کس کا خاکہ زیرِ مطالعہ ہے۔ ہاں ایک خاکہ علی حیدر ملک کا ان کے نام کی صراحت کے ساتھ شائع کیا جو غالباً اپنی روایت سے وابستگی کے اظہار کے لیے تھا۔

ان کا ہر عنوان افسانہ ہے اک دنیائے راز
حضرت حیدر ملک اک بے بدل اہلِ قلم
انشا پرداز و ادیب و نکتہ سنج و نکتہ داں
اک نئی دنیا بنائی اس خلائی دور میں
استعارے کی زباں میں 'بے زمیں ہے آسماں'
اک تغیر فکر میں ہے ذہن میں ہے انقلاب

مبارک مونگیری نے شاعر کا دل اور حساس طبیعت پائی تھی۔ لہٰذا انھوں نے کچھ لوگوں کے خاکے بھی اڑائے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید کا قول پہلے ملاحظہ فرمائیں۔

''مبارک مونگیری نے مجنوں گورکھپوری، مشفق خواجہ، وزیر آغا، نعیم صدیقی، جمیل جالبی، ادا جعفری اور متعدد دوسرے ادیبوں کے خاکے پھول کے قلم سے لکھے لیکن جب محسن بھوپالی، سحر انصاری، امید فاضلی اور صبا لکھنوی جیسے پیارے لوگوں کی طرف آتے ہیں تو پھول کی پتیوں کو بادِ حوادث اڑا لے جاتی ہے اور مونگیری کے ہاتھ میں صرف کا نَارہ جاتا ہے۔''

گویا مبارک نے شاعری کے بنیادی وصف ذاتی پسند و ناپسند اور انسانی وصف محبت کے ساتھ فطرت کو، اپنے خاکوں میں ملحوظ رکھا جس سے شخصیت کے منفی پہلو بھی ابھر آئے۔ مثلاً

وہ جثہ منحنی لمبوترا چپٹا سا سر جن کا
عجیب الخلقت و مضحک سراپا مختصر جن کا
وہ مقصد زرپرستی ہو ادب خاک معیاری
کہ چھپنا اس کے پرچے میں ہے مشروط خریداری
مروت سے ہے عاری کسبِ زر سے کام رکھتا ہے
یہ وہ ہے جو رزالت کا شرافت نام رکھتا ہے
ادیبوں شاعروں کو یہ کبھی اجرت نہیں دیتا
فقط وعدے پر ٹرخاتا ہے یہ قیمت نہیں دیتا

مبارک کے خاکوں میں وہ باتیں بھی سامنے آجاتی ہیں جو عام طور پر مخفی تھیں۔ اس حوالے سے ایک اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں۔ حیدر ملک لکھتے ہیں:

''جب مشفق خواجہ کا خاکہ شائع ہوا تو وہ ہندوستان کے دورے پر گئے ہوئے تھے وہاں سے واپسی پر انھوں نے اپنا خاکہ دیکھا، جب میں ان سے ملنے گیا تو اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے۔

''میرے غائبانہ میں آپ نے شاعری شروع کردی ہے!
نہیں تو لیکن آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟
اس لیے کہ 'جسارت' میں میرا جو خاکہ شائع ہوا ہے اس میں بعض ایسی باتوں کا ذکر ہے جن کا علم صرف چند افراد کو ہی ہے اور ان چند افراد میں آپ بھی شامل ہیں۔''

مبارک مونگیری ایک تجسس پیدا کر دیتے تھے۔ یہ خاکے اس شان کے ہوتے کہ بڑے بڑے قدردانِ فن ان کی طرف متوجہ ہونے کے بعد استفسار ضرور کرتے

بات جو کہنی تھی آخر کہہ دیا کس شان سے
کچھ کنائے کچھ اشارے کچھ علامت کے نشاں

مبارک مونگیری خاکوں میں جہاں موقع ملا مضحک پہلو بھی ابھارنے سے نہیں چوکے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ مبارک مونگیری کی شناخت محض منظوم شخصی خاکوں ہی کی وجہ سے قائم ہوئی۔ انھوں نے نعتِ رسولِ مقبولؐ میں بھی اپنے فن، اپنی زبان دانی، جوش و جذبے کا اظہار خوبصورتی سے کیا ہے۔ ان کی نعت، منقبت اور سلام سب میں پاسِ ادب اور مقام و مرتبہ کا صحیح لیکن فنکارانہ اظہار ملتا ہے۔

مبارک نے نعت گوئی کو محض ذوقِ شعری کی تکمیل کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اپنی اخروی نجات کا ذریعہ بھی سمجھا۔ وہ ایک صالح فکر انسان تھے۔ نبی معظم کی سیرت و شخصیت سے والہانہ پیار کرتے تھے۔ صالح جذبات اور صحیح فکر نے ان کی نعتوں کا سلسلہ دراز بھی رکھا جس سے ایک معتد بہ ذخیرہ اکٹھا ہو گیا۔ نعتوں کا مجموعہ 'ذکرِ ارفع' کے نام سے شائع ہوا۔

مبارک مونگیری ایک فطری شاعر تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کی تمام مروجہ اصناف پر طبع آزمائی کی۔ یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ ان کا دور نظم نگاری کے عروج سے معنون ہے۔ غزل کے حوالے سے متضاد خیالات پیش کیے جا رہے تھے۔ اس کے باوجود غزل کو اردو شاعری کی آبرو قرار دینے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی جا چکی ہے کہ مبارک مونگیری کا میلانِ طبع بیشتر نظم نگاری ہی کی طرف تھا اور ان کی نظم

نگاری کے طفیل اردو کو چند بے حد کارآمد نظمیں ملیں۔ ان کی ایک نظم 'سیل خون' انسانی قدروں کی پامالی کا چشم دید بیانیہ ہے جس سے ایک تاریخی واقعہ شاعری کے پیرایہ میں اس طرح زندہ ہوگیا جس کی کرب ناکی کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

اس قبیل کی دوسری نظم 'مقدس لہو' ہے۔ اس نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے جس طرح دوسروں ہی کی طرح ہجرت کرتے وقت سنہرے خواب دیکھے تھے وہ کیسے بھیانک انجام سے دوچار ہوئے۔ اس کا جو اثر ایک حساس انسان پر ہوسکتا تھا اس کا شاعرانہ اظہار اس نظم میں ملتا ہے۔ اس نظم میں شاعرانہ تعمق اور فن پر مکمل گرفت کا احساس ہوتا ہے۔

مبارک مونگیری نے اور بھی کئی نظمیں کہیں جن میں 'موضوع سخن'، 'نئی بھکارن'، 'اقبال ڈے'، 'خدا کے لیے ہم سے اردو نہ چھینیں' جیسی نظمیں دے گئے تو 'فراق جاناں'، 'صبح کا بھولا' جیسی رومانی نظمیں کہہ گئے۔ ان کی ایک نظم 'چارۂ کار' ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں سوچ رہا ہوں کہ مرے حال زبوں پر
اب دہر میں تکلیف کرم کون کرے گا
وہ وقت تہجد مری صحت کی دعائیں
اٹھ اٹھ کے مجھے راتوں کو دم کون کرے گا
ہونٹوں پہ لیے جلوۂ تقدیس تبسم
تسکین دل شکستہ صنم کون کرے گا
وہ مشورۂ ترک سخن فکر پہ قدغن
احسان بہ انداز ستم کون کرے گا

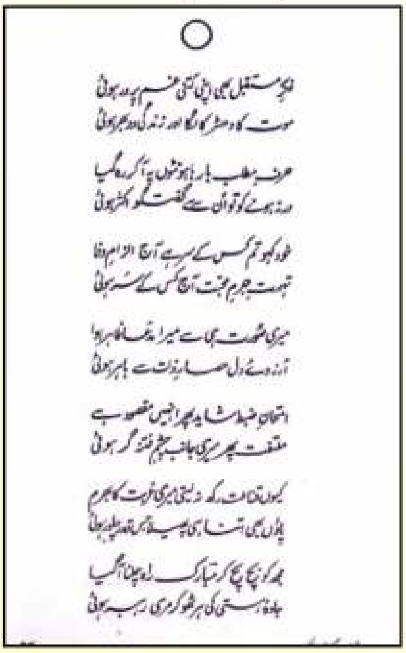

مبارک مونگیری کو تسلسل بیان پر قدرت حاصل تھی۔ محاکات نگاری میں ملکہ تھا جس کی ایک مثال اور دیکھ لیں تب آگے بڑھیں۔ نظم 'مشاعرہ چاٹگام' کے چند اشعار:

وحشت ڈے چٹگام کا نقشہ — کھینچوں آج اک کام کا نقشہ
شاعر کے انجام کا نقشہ — یعنی انکل سام کا نقشہ
آنکھوں دیکھا حال سناؤں — سب بے قیل وقال سناؤں
ہونگ کے احوال سناؤں — سرگم کے سر تال سناؤں

گویا مبارک سنجیدہ، المیہ، حزنیہ، طنزیہ، مزاحیہ ہر طرح کی نظم نگاری پر قدرت رکھتے تھے۔ وہ ایک بے باک شاعر تھے، لگی لپٹی کہنے کی خو ان میں نہ تھی۔ برسر دار بھی حق گوئی کے وہ قائل تھے۔ اس حوالے سے ان کی نظمیں 'سرکاری میلاد' کو دیکھا جاسکتا ہے جس سے شاعر کی شخصیت اور اس کا نظریۂ حیات واضح ہوتا ہے۔ مبارک نے کارگہ حیات سے ہر وہ موضوع منتخب کیا جو لائق اعتنا تھا۔ لہٰذا انھوں نے غزل گوئی میں روایت کو قائم رکھتے ہوئے نئے تجربات کرنے کی کوشش کی۔ اس حوالے سے ابتدائی عمر میں بہتر تربیت ان کے کام آئی۔ زبان و بیان کے ساتھ اوزان و بحور پر انھیں جو قدرت حاصل ہے اس کا اظہار غزل کے اشعار میں ہوتا رہا۔ مبارک جانتے تھے کہ غزل کے بغیر اردو دنیا میں قابل اعتبار بننا مشکل ہے اس لیے انھوں نے غزل کے ایسے اشعار بھی کہے جو مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت بنتے ہیں مثلاً:

یہ بہار جلوۂ گل یہ نوائے شور بلبل
ترے حسن کا سراپا مرے عشق کا قصیدہ
ہوا کے رخ پہ ذرا رکھ کے آزما تو سہی
مری طرح کبھی شمع وفا جلا تو سہی
الم کی دھوپ میں احباب کام آیا نہیں کرتے
یہ وہ اڑتے ہوئے بادل ہیں جو سایہ نہیں کرتے
کل تک تو تم فدا تھے مبارک کے نام پر
حیرت ہے آج اتنا بڑا ہوگیا وہ شخص
چمن پرست ہوں مجھ کو چمن سے الفت ہے
بلا سے اس میں بہار آئے یا خزاں گزرے
ترتیب دے رہا ہوں روداد زندگانی
کچھ اپنی بات لے کر کچھ ان کی بات لے کر
اب سوچتا ہوں عمر دو روزہ سے کیا ملا
دنیا کو کیا دیا مجھے دنیا سے کیا ملا
خود اپنی شکل اپنی نظر میں تھی اجنبی
پہلے پہل جو آئینہ دیکھا تو ڈر گیا
کہاں ہیں جذبۂ اخلاص کامل دیکھنے والے
وہ پہلے اپنا دل دیکھیں مرا دل دیکھنے والے

مبارک سنجیدہ، المیہ، حزنیہ، طنزیہ، مزاحیہ ہر طرح کی نظم نگاری پر قدرت رکھتے تھے۔ وہ ایک بے باک شاعر تھے، لگی لپٹی کہنے کی خو ان میں نہ تھی۔ برسر دار بھی حق گوئی کے وہ قائل تھے۔ اس حوالے سے ان کی نظمیں 'سرکاری میلاد' کو دیکھا جاسکتا ہے جس سے شاعر کی شخصیت اور اس کا نظریۂ حیات واضح ہوتا ہے۔ مبارک نے کارگہ حیات سے ہر وہ موضوع منتخب کیا جو لائق اعتنا تھا۔ لہٰذا انھوں نے غزل گوئی میں روایت کو قائم رکھتے ہوئے نئے تجربات کرنے کی کوشش کی۔

قدموں سے تھی جو گردش دوراں لگی ہوئی
میں جب ٹھہر گیا تو زمانہ ٹھہر گیا

اس لب ولہجہ اور اس تیور کا شاعر مبارک مونگیری اس آب وگل سے اٹھا تھا جہاں خودداری، عزم وحوصلہ کی کوئی کمی نہ تھی۔ انھوں نے سیکڑوں مصیبتیں سہیں، جواں مرگ بیٹے کے کا غم اس طرح زندہ رکھا کہ اس کے نام ناصر احمد کو اپنے منظوم خاکوں کے ساتھ زندہ و تابندہ کردیا۔ آبائی وطن کی زبان، بولی اور لہجہ کو جہاں چاہا برت دیا۔ وہ بھی اس طرح کہ یہ الفاظ بھی ٹکسالی معلوم ہونے لگتے۔

مبارک مونگیری کے ذوق سخن کو توانا بنانے میں لکھمنیاں، جو ان دنوں ضلع مونگیر کا ایک حصہ تھا، نے اہم کردار ادا کیا۔ یہاں کی ادبی فضا تربیت کے لیے موزوں بھی تھی اور جو اس سے گزر جاتا کامل ہوجاتا۔ مبارک کے علاوہ فریاد باروی، ریاض بلیاوی وغیرہ جیسے شعرا یہاں سے کسب فیض کرتے رہے اور لکھمنیاں جس کو ایک مکمل اسکول تو نہ کہیے لیکن شعر وادب کا ایک چھوٹا سا مکتب ضرور تھا۔ قریب و دور میں اپنا نام روشن کیے ہوئے ہے۔ یہاں سے اٹھنے والوں کی ایک مختصر سی فہرست سامنے رکھتا ہوں۔ معین الدین درد، شاہ اسرار الرحمٰن آتش، قاضی زبیر بیخود، منظر حمید غم، قمر حمید قمر، ڈاکٹر نصر حمید خلش مرحومین اور زندہ لوگوں میں عبدالصمد تپش، ظفر حبیب، شمیم بیتاب، ولی مدنی، کامل حمید، شاہ غلام سلطان اختر اور جواں سال شاعر طارق متین ہیں تو وطن سے دور رہ کر بھی گیسوئے ادب سنوارنے والوں میں نورالہدیٰ، جعفر سنی، قیصر اقبال، پروفیسر شبیر حسن، ارشد کمال، م م افتخار، پروفیسر سرورالہدیٰ ہیں۔

■

Ashar Hameedi
Dept of Urdu, RCSS College Beehat
Begusarai - (Bihar)

فانی گورکھپوری: شخصیت اور شاعری

(فارسی شاعری کے تناظر میں)

فیضان حیدر

فانی گورکھپوری کا پورا نام شاہد علی اور تخلص فانی ہے۔ وہ بیسویں صدی عیسوی کے بلند پایہ شاعروں میں سے ہیں جن کی شاعری کا کینوس خاصا وسیع ہے۔ دلکش ترکیبوں، چھوٹی چھوٹی بحروں، خوش آہنگ قافیوں اور منفرد ردیفوں کے انتخاب نے ان کی شاعری میں وہ موسیقیت، غنائیت اور ترنم پیدا کردیا ہے جس کی مثال کم شاعروں کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان خوبیوں کے باوجود نہ جانے کیوں اب تک ان کی شاعری پر توجہ نہیں دی جارہی ہے۔ اس مضمون میں ان کی شخصیت اور فارسی شاعری سے متعلق چند نکات آپ کے اذہانِ عالیہ تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔

چونکہ وہ خانقاہوں سے وابستہ تھے اس لیے سیر و سلوک کے اسرار و رموز اور اس کے مدارج سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے تھے، چنانچہ مریدین اور مسترشدین مسلسل ان کے علم و فضل سے فیضیاب ہوتے رہے۔ انھوں نے ریاضت اور مجاہدۂ نفس میں ایک مدت صرف کی اور مختلف پریشانیوں اور الجھنوں کے باوجود کسی بھی وقت اس سے دستبردار نہیں ہوئے۔ وہ ایک لمبے عرصے تک خانقاہ رشیدیہ جونپور کے متولی اور سجادہ نشین بھی رہے۔ انھوں نے اپنی تواضع، انکساری اور مروت کی وجہ سے مشرقی اترپردیش میں بہت سے لوگوں کو اپنا مرید بنالیا۔ سیکڑوں مرد اور عورتوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور تاحین حیات ان سے مستفید ہوتے رہے۔

ان کا نسب انتیس واسطوں سے حضرت علی تک پہنچتا ہے۔ کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خاندان اپنی علمی وراثت اور عظمت و بزرگی میں اجداد کی مانند تھا۔ لوگ ان کی شخصیت اور حسن اخلاق سے اس قدر متاثر تھے کہ تمام دینی و دنیوی مسائل میں مشورہ کرتے اور اس پر حتیٰ الامکان عمل پیرا ہونے کی سعی و کوشش کرتے۔

خود ان کے پیر و مرشد نے ان کی معنوی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے انھیں رشید الدین اور شہود الحق کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا۔

ان کی ولادت سے تین مہینے تین دن قبل ان کے والدعین جوانی کے عالم میں دار فانی سے رخصت ہوگئے اور ان کی پرورش و پرداخت ان کے چچیرے دادا ہدایت علی کے ذمے آگئی لیکن وہ بھی ان کی کم سنی میں ہی دنیا سے چلے گئے۔ اس طرح انھیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے بچپن میں ان کی خاطر خواہ پرورش و پرداخت نہیں ہوسکی، پھر بھی مروجہ علوم حاصل کیے اور عصری تعلیم کے ساتھ عربی اور فارسی بھی پڑھی۔ اگرچہ شروع شروع میں ان کی طبیعت تعلیم کی طرف مائل نہ تھی لیکن بعد میں ذوق و شوق پیدا ہوگیا اور کتب بینی کے ذریعے عربی اور فارسی زبان و ادب میں استعداد پیدا کرلی، مشہور ہے کہ وہ ہر روز تقریباً اٹھارہ گھنٹے مطالعے میں صرف کرتے تھے۔

ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ کسی مجلس یا وعظ میں جاتے تھے تو بغور سنتے اور بعد میں دوستوں اور عزیزوں کے اصرار پر اسے حرف بحرف سنا دیا کرتے تھے۔ ان کے وعظ و نصیحت اور تقریر کا انداز عالمانہ تھا۔ وہ کسی بھی دعوے کو بغیر دلیل کے نہیں بیان کرتے تھے بلکہ بعض اوقات وہ اپنے دعوے کو حاضرین کے سامنے اس طرح پیش کرتے کہ ان میں دلیلیں بھی پوشیدہ ہوتیں جنھیں معمولی غور و خوض کے بعد حاضرین سمجھ جاتے تھے۔

بعد کو ان کی طبیعت تصوف کی طرف مائل ہوگئی اور انھوں نے تصوف کے اسرار و رموز اور حقائق و معارف کے سمجھنے اور سمجھانے میں اپنی پوری زندگی صرف کردی۔ انھیں اولیاء اللہ کے ملفوظات، ان کے ارشادات و واقعات سننے اور سنانے میں خاصی دلچسپی پیدا ہوگئی اور یہ دلچسپی ایک جنون کی حد تک پہنچ گئی۔ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے بہت سے اقوال اور واقعات ان کے نوک زبان پر رہتے تھے اور وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ان کے اقوال اور ارشادات سے بڑی حد تک استفادہ بھی کرتے تھے۔

ان کی مجلس صرف خشک زاہدوں کی مجلس نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ جن افراد کے ساتھ بیٹھتے بہت جلد ان سے بے تکلف ہوجاتے اور بات میں بات پیدا کرنے کے ہنر سے بھی واقف تھے۔ ہاں کہیں بھی مبالغہ آرائی اور بذلہ سنجی سے کام نہیں لیتے تھے جس سے مجلس کا احترام اور وقار برقرار رہتا اور ان کے ذریعے بیان کی گئی باتیں سامعین پر اثر انداز ہوتیں۔

انھیں کتابوں سے حد درجہ عشق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ڈھیرے ڈھیرے عربی اور فارسی کے ساتھ اردو کی کتابوں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ جمع کرلیا۔ ان کے اس ذخیرے میں قلمی نسخے بھی تھے۔ وہ اپنے بیشتر اوقات کتب بینی اور کتابوں کی مرمت پر صرف کرتے تھے۔ وہ مخطوطہ خوانی کے رسیا تھے اور مخطوطوں سے ان کو خاص دلچسپی تھی جن کا مطالعہ وہ بڑی دلجمعی، لگن اور افادی نقطۂ نظر سے کرتے تھے۔ بعض کتابوں پر مطالعے کے وقت اپنی رائے یا ان پر ایراد و اعتراض وغیرہ کو خود اپنے قلم سے درج کردیا کرتے تھے جس سے ان کی تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اگر ان کے ذریعے لکھے گئے کتابوں پر حواشی کو جمع کیا جائے تو وہ خود ایک خاصے کی چیز ہوگی جو تنقیدی ذہن رکھنے والوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی۔

وفات کے بعد ان کی اکثر کتابیں دوست احباب کے ہاتھوں لگ گئیں جو انھیں کی ہوگئیں اور جو کچھ باقی رہ گیا اس میں ان کے کچھ نوٹ اور کتابوں پر حواشی ہیں۔

اب چونکہ صاحبانِ فضل و کمال کا قحط ہے اس لیے جوان کے باقیات ہیں ان کے پڑھنے اور سمجھنے والے کم رہ گئے ہیں۔ تاہم ان باقیات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فانی کو لغات اور محاورات پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی بلکہ بعض محاورات تو ان کی ایجاد معلوم ہوتے ہیں۔

فانی نے صغرسنی سے ہی شاعری شروع کردی تھی۔ شروع شروع میں صرف دلی جذبات اور والہانہ کیفیات کو ہی اپنی شاعری میں جگہ دیتے رہے، لیکن جیسے جیسے مشقِ سخن کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا ان کے اشعار میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی گئی جو ان کے بالیدہ شعور اور خلاقانہ ذہن کی غمازی کرتی ہیں۔ انھوں نے اردو کے ساتھ فارسی میں بھی اشعار کہے جو فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے مطالعے سے ایک نئی فضا، نئی کیفیت اور نئی معنویت کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے فارسی ادب کے اساطین کا گہرا مطالعہ کیا اور اکثر اشعار میں ان کی پیروی کرنے کی سعی و کوشش کی ہے۔ بعض جگہوں پر انھوں نے سعدی، حافظ اور امیر خسرو کے کلام پر تضمینیں بھی لگائی ہیں۔

امیر خسرو کی ایک بہت مشہور غزل ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زُنار نیست

(میں اپنے عشق کا غلام ہوں مجھے مسلمان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری ہر رگ جنیو ہوگئی ہے مجھے جنیو کی احتیاج نہیں ہے۔)

فانی نے بھی اسی زمین میں ایک غزل کہی، جس کا مطلع یہ ہے:

عاشقِ یارم مرا باہر دو عالم کار نیست
کار من در ہر دو عالم جز خیالِ یار نیست

(میں اپنے محبوب کا عاشق ہوں مجھے دنیا و آخرت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میرا کام دونوں جہان میں معشوق کے خیال میں کھوئے رہنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔)

اسی طرح حافظ کی ایک مشہور غزل جس کا مطلع یہ ہے:

ساقی بنور بادہ بر افروز جامِ ما
مطرب بگو کہ کار جہاں شد بہ کامِ ما

(اے ساقی! شراب کے نور سے ہمارے پیمانے کو منور کردے اور اے مطرب! کہہ دے کہ دنیا ہمارے مقصد کے مطابق ہوگئی۔)

اس پر بھی تضمین لگائی اور پوری غزل کہہ دی، جس سے چند اشعار بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں:

در قصرِ دل مقیم شد آن خوش خرامِ ما
بالا تر است از فلک امروز بامِ ما
عشقش چنان نبرد کہ باشیم باخودی
ناصح برو کہ کار برفت از زمامِ ما
خونِ جگر زدیدہ تراوش ہمی کند
پُر باشد از می غمِ ہجرِ تو جامِ ما
چون شمع خانۂ دلِ ما گشتہ ای ز لطف
بر صبح حشر خندہ زند کیفِ شامِ ما
فانی بہ کوی رحمت و امید شو مقیم
از اختیارِ ما نشود اختتامِ ما

1۔ اس خوش رفتار معشوق نے ہمارے دل میں گھر کرلیا ہے اس لیے آج ہمارے بام کا مرتبہ آسمان سے بھی بلند ہے۔

2۔ اس کے عشق نے ہمارے دل کی بازی اس طرح جیت لی ہے کہ ہم بے خود ہوگئے۔ اے ناصح تو میری راہ میں حائل نہ ہو کیونکہ اب خود پر میرا اختیار نہ رہا۔

3۔ میری آنکھوں سے خون کے آنسو جاری ہیں کیونکہ ہمارا جام تیرے غم جدائی سے چھلک رہا ہے۔

4۔ تم نے از راہ لطف و کرم ہمارے دل کے گھروندے کو شمع کی طرح روشن کردیا ہے اس لیے ہماری شام کا کیف و سرور صبح حشر کی ہنسی اڑا رہا ہے۔

5۔ اے فانی! اللہ رب العزت کی بارگاہ رحمت و امید سے لو لگائے رہ اور انجام کی پرواہ نہ کر کیونکہ ہمارا خاتمہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔)

یہ پوری غزل بہت پُر زور ہے۔ مذکورہ اشعار کے مطالعے سے ان کے نکھرے ہوئے جمالیاتی ذوق اور شعری احساس کا پتا چلتا ہے۔ ان اشعار میں ان کے سچے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ بعض مقامات پر ان کے یہاں تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی برابر محل ملتا ہے، جس سے ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ مل گیا جو عام روش سے قدرے مختلف ہے۔

ان کے فارسی کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہجر کے شاعر ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ ہجر کے وقت عاشق پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے۔ وہ ان کیفیات کی بڑی کامیاب تصویر پیش کرتے ہیں جس میں جذبات کی صداقت، والہانہ پن، بندش کی چستی اور سوز و گداز بھی پایا جاتا ہے۔ ان کی پوری فارسی شاعری حکایت درد و غم ہے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون سی خصوصیات ہیں جنھوں نے ان کی شاعری کو لافانی بنادیا ہے۔ یہ جاننے کے لیے ہمیں ان کی شاعری کو ان کے عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی ماحول میں اور ان کے زمانے میں پیدا ہونے والے حالات و اسباب کی روشنی میں دیکھنا اور سمجھنا ہوگا۔

وہ عشق کی کیفیات اور محبت کی واردات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں ان کیفیات اور آلام و مصائب سے گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنے فارسی کلام میں اخلاق و تصوف کے مسائل بھی بیان کیے ہیں، لیکن ان کی اصل شاعری کا جوہر وہاں کھلتا ہے جہاں عشق کے ساتھ سانحات زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔ عشق نے ان کی شاعری میں خستگی اور گداختگی پیدا کردی ہے جس کی وجہ سے شاعری میں ان کا انفرادی رنگ تغزل جابہ جا محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

خودی زندانِ ہستی شد مرا دردیست پنہانی
ندارم طاقتِ گفتن تو آن را خوب می دانی

(وجود ہستی کے لیے قفس ہے اور تو اچھی طرح واقف ہے کہ مجھے ایسی روحانی تکلیف ہے جسے بیان کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔)

ان کی حساس طبیعت نے انھیں زندگی کے آلام و مصائب اور رنج و محن سے نبرد آزما ہونے کی قوت بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے احساسات میں ندرت و لطافت پائی جاتی ہے جس سے اشعار کی شعریت اور معنویت دوبالا ہوگئی ہے۔ ساتھ ہی ان کی شاعری کی فضا بسیط اور ماحول حقیقت پسندانہ ہے جس کی وجہ سے ان کی غزلوں میں داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج پیدا ہوگیا ہے۔

وہ اپنی اکثر غزلوں میں اساطین ادب سعدی، حافظ، عطار، سنائی اور امیر خسرو سے متاثر نظر آتے ہیں۔ بعض مقامات پر انھوں نے ان سے صوفیانہ اور عارفانہ ترکیبیں بھی مستعار لی ہیں، اس کے باوجود ان کی شاعری میں ایک منفرد جذبے اور والہانہ پن کی کارفرمائی نظر آتی ہے جس سے مطالعے کے وقت قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خود اس کے احساس اور جذبے سے بہت قریب ہیں۔ زبان و بیان بھی بڑی سادہ اور دلکش استعمال کی ہے جس سے ان غزلوں میں ایک تاثیر اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ز چشمِ مستِ خود دیوانہ کردی　　مرا از خویشتن بیگانہ کردی
ز بی مہری تو جان برلب آمد　　نکردی یک نگہ بر ما نکردی
چو تابِ سوزِ ما ای جان نداری　　چرا بر شمعِ رخ پروانہ کردی

(1۔ اپنی مخمور آنکھوں سے مجھے اپنا دیوانہ بنالیا اور مجھ کو خود سے بے گانہ کردیا۔

2۔ تیری بے وفائی سے میری جان جانے والی ہے اور تم نے مجھ پر ایک نظر عنایت بھی نہیں کی۔

3۔ اے معشوق! جب تو ہمارے درد والم کی تاب نہیں

لاسکتا تو کیوں ہمیں اپنے خوبصورت چہرے کا اسیر بنایا۔)

دو شعر اور ملاحظہ ہوں:

ای مظہرِ حسن، ناز تا کی — وز بندۂ تو نیاز تا کی
جان از الم تو زار تا چند — در عشق تو دل گداز تا کی

(1۔ اے مظہر حسن تو کب تک ناز و ادا دکھاتا رہے گا، اور تمہارا بندہ کب تک منت والتجا کرتا رہے گا۔
2۔ تمھارے غم میں میری جان کب تک رنج والم میں مبتلا رہے گی اور تیرے عشق میں میرا دل کب تک جلتا رہے گا۔)

دراصل ان کی طبیعت رومانیت پسند واقع ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی شاعری میں ہجر کی تلخی، امنگوں اور آرزوؤں کے خون کی وجہ سے نشاطیہ رنگ و آہنگ کے ساتھ جا بہ جا حزن و ملال کا عنصر دکھائی دیتا ہے۔ وہ معشوق کے وصل کے خواہاں ہیں لیکن دنیا کے تلخ تجربات اور نامساعد حالات کی وجہ سے ہجر و فراق کی آتش میں جل رہے ہیں۔ اگر ہم تھوڑا سا بھی غور و فکر کریں تو ہمیں بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے یہ اشعار بظاہر عشق مجازی کے پیچ و خم اور اس کی کیفیات بیان کرتے ہیں لیکن درحقیقت عشق مجازی کے پردے میں عشق حقیقی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ انسان حامل روح الٰہی ہے جو کسی وجہ سے اپنے اصل نقطے اور مرکز سے جدا ہو گیا ہے اور ہر وقت، ہر لمحہ اس کا وصال چاہتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں لطافت، معنیٰ خیزی اور سوز و گداز پیدا ہو گیا ہے جو ان کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں کافی مددگار ہے۔

انھوں نے اپنے اشعار میں عارفانہ مضامین کے دریا بہائے ہیں، ان کا ماننا ہے کہ جس شخص نے معشوق حقیقی تک رسائی پیدا کر لی اسے دنیا جہان کی تمام خوش بختیاں حاصل ہو گئیں اور جسے اپنا مقصود حقیقی حاصل ہو جائے اس پر خودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، پھر وہ انسان خودی کے اسرار و رموز اور اس کے حقائق و معارف میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دیتا ہے ساتھ ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے جسے ہم شاعری کی اصطلاح میں فنا فی المعشوق کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

سرِ من زیرِ پای تو باشد — دل و جانم فدای تو باشد
باشد از ہر دو کون بیگانہ — ہر کسی کاشنای تو باشد

(1۔ میرا سر تیرے قدموں میں ہو اور میں تم پر دل جان سے قربان جاؤں۔
2۔ جس شخص کو تیری ذات کی معرفت حاصل ہو جائے وہ دونوں جہان سے غافل ہو جائے گا۔)

ان کی غزلیں معرفت و عرفان سے مملو ہیں اس لیے ان کی شخصیت کی توصیف اور قدر شناسی اسی وقت ممکن ہے جب انسان عرفانیات کے اسرار و رموز سے بخوبی واقفیت رکھتا ہو، ساتھ ہی مزاج شناس بھی ہو۔ ان کی شاعری میں بھی دورِ قدیم کی عرفانی شاعری کا عکس نمایاں ہے جو ان کے تخلیقی ذہن اور اپج کا نتیجہ ہے۔ ساتھ ہی ان کی شاعری میں اخلاق کی تعلیم اور عجز و انکساری واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

غزل تمام اصناف سخن میں اپنے جن امتیازات کی وجہ سے جانی اور پہچانی جاتی ہے ان میں موسیقیت و غنائیت، رمزیت و اشاریت، مفاہیم میں تہ داری اور گہرائی و گیرائی ہے جو بحور و قوافی کے مناسب انتخاب اور مصرعوں میں یکسانیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر شاعر مذکورہ خوبیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے افکار و خیالات کو شعر کے قالب میں ڈھالتا ہے تو اس کی شاعری کو بقائے دوام حاصل ہو جاتی ہے۔ فانی نے بھی حتی الامکان ان قواعد و ضوابط کی پاسداری کی ہے لیکن چونکہ وہ اہل زبان نہیں تھے اور ان کے پاس فارسی کے الفاظ کا بڑا ذخیرہ نہیں تھا اس لیے بات پہنچانے میں بعض اوقات ان سے فنی اور عروضی قواعد سے روگردانی بھی ہوگئی ہے جس نے ان کی بعض غزلوں کے حسن کو مجروح کر دیا ہے، جسے ان کی شاعری کے نقائص میں شمار کیا جائے گا۔ تاہم ان کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد بھی خاصی ہے جو اپنے منفرد اور اثر انگیز انداز بیان کی وجہ سے ہمارے دل و دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔

اگرچہ انھوں نے آغاز شاعری میں فارسی میں طبع آزمائی کی تھی اور قدیم شعرا کا تتبع کیا تھا لیکن بعد میں انھوں نے اپنا سارا زور اردو شاعری پر صرف کیا۔ ان کا خیال تھا کہ فارسی شعرا کی بھیڑ میں اپنی شاعری کا لوہا منوانا اور ان کے درمیان امتیاز پیدا کرنا اس زمانے میں ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے وہ اردو شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے اور اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے رمزی اور ایمائی پیرایۂ بیان اختیار کیا۔ یہ پیرایۂ بیان ان کے مزاج سے بھی بڑی حد تک ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے۔ ان کی اردو شاعری ان کے اندرونی جوش و خروش کا سرچشمہ ہے جس میں تکلف اور تصنع کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں ہے جس کا انھیں بھی احساس تھا۔ ان کے یہاں تعلّی اور خودنمائی کا جذبہ نہیں دکھائی دیتا، بلکہ ان کے یہاں احساسات و جذبات کا بے محابا اظہار، فنی رچاؤ، بالیدگی اور شائستگی پائی جاتی ہے جو انھیں اپنے ہم عصروں کی صف میں کھڑا کرنے اور ان کے درمیان مقام دلانے کے لیے کافی ہے۔

ان کا فارسی کلام جس میں سے اکثر ان کی جوانی کے ایام کا کلام تھا حادثات زمانہ کی نذر ہو گیا، جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ ان کے دوست احباب لے کر بیٹھ گئے، اور مختلف جگہوں پر ضائع ہو رہا ہے۔ ان کی اردو شاعری سے متعلق بھی اب تک اردو زبان میں کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔ جب کہ ان کی اردو شاعری ان کے ہمعصروں کی شاعری سے کسی قدر کم نہیں ہے۔ اس لیے ارباب علم و فضل سے اس باب میں توجہ کی گزارش ہے۔ ان کا دیوان انجمن فیضان رشیدی مٹیا برج و کمرہٹی کلکتہ (کولکاتا) سے شائع ہو چکا ہے۔ اردو غزلوں کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

بہار آتے ہی جلوہ رنگ لایا روئے جاناں کا
کھلا ہے بابِ پنجم صحنِ گلشن میں گلستاں کا
دلِ شیدا بنا ہے درسگاہِ خود فراموشی
کتابِ عشق میں درس ان دنوں ہے بابِ نسیاں کا
خیالِ زلف میں میری سحر بھی شام ہی سی ہے
مرے روزِ سیہ میں رنگ ہے شبہائے ہجراں کا
حیاتِ جاوداں پاتے ہیں آبِ تیغ سے عاشق
تری تلوار سے ہے نام زندہ آبِ حیواں کا
اسی منہ پر چلا تھا ہمسری کو روئے روشن کی
ہوائی اڑ رہی ہے منہ تو دیکھو ماہِ تاباں کا
بتوں کا ہاتھ کعبے کی طرف بھی بڑھ چلا دیکھو
خدا حافظ ہے اب شیخِ حرم کے دین و ایماں کا
مری تردامنی دامانِ تر سے پانی پانی ہے
ملا ہے چشمۂ رحمت سے سوتا چشمِ گریاں کا

دوسری غزل سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حسن کے کوچے میں کیا اب کوئی اس قابل نہیں
سر بکف پھرتے ہیں ہم لیکن کوئی قاتل نہیں
قتل ہونا عاشقوں کو ہے وصالِ جاوداں
جادۂ ملکِ بقا ہے خنجرِ قاتل نہیں
نزع میں مشکل کشا کا نام ہو وردِ زباں
جو نہ ہو آسان ایسی کوئی تو مشکل نہیں
اپنی ہستی کو مٹانا ہی وصالِ یار ہے
جز فنا فانی مگر کچھ عشق کا حاصل نہیں

■

Faizan Haider
Purana Pura, Kurthijafar Pur,
Mau-275305 (U.P)
Mob. 7388886628
E-Mail: faizanhaider40@gmail.com

میرے رشکِ قمر... کا شاعر
فنا بلند شہری

محمد فاروق خان

فنا بلند شہری کا اصل نام حنیف محمد تھا۔ ان کی پیدائش یوپی کے ضلع بلند شہر میں ہوئی۔ کچھ سالوں بعد ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے۔ فنا کو شعروسخن کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اصلاحِ سخن استاد قمر جلالوی سے لی۔ فنا کو اپنے استاد سے بڑی عقیدت ومحبت تھی جس کا اظہار اپنے شعر میں اس طرح کیا ہے۔

میں ہوں فنا قمر کی تجلی سے فیضیاب
دنیا میں ہے چراغِ ادب مری شاعری

فنا طریقت وسلوک میں محمد شریف میاں قادری نقشبندی پپلی بھیت سے منسلک تھے۔ پیرِ تصوف سے عقیدت نے فنا کے کلام کو تصوف ومعرفت کی معراج عطا کردی۔ ان کے کلام میں عشق مجازی وحقیقی دونوں موضوعات کو بڑی خوبصورتی وفنکاری سے پیش کیا گیا ہے۔ فنا کے کلام کی تعداد بہت ہے۔ فنا کو خواجہ فقیر صوفی محمد نقیب اللہ شاہ آستانہ عالیہ نقیب آباد شریف ضلع قصور سے جذباتی وروحانی عقیدت ومحبت تھی۔ فنا کی عقیدت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنا تمام کلام نقیب اللہ شاہ کے مرید خاص امان اللہ نظامی نقیبی درباری قوال آستانہ عالیہ گارڈن ویسٹ کراچی کو دے دیا تھا، اور وصیت کی تھی کہ میرے کلام کو چھپوانے کے جملہ حقوق محمد نقیب اللہ شاہ کو ہوں گے۔ فنا کا بیشتر کلام صوفی محمد نقیب اللہ شاہ کی محفل سماع میں پڑھا جاچکا ہے۔ ان کے کلام سامعین ومریدین میں بے حد مقبول ہوئے۔ فنا کا کلام محمد نقیب اللہ کے آستانہ عالیہ کے درباری قوال صوفی محمد طفیل وہم نوا قصوری محفل سماع میں پڑھتے تھے اور سامعین انھیں داد وتحسین سے نوازتے تھے۔

فنا بلند شہری نے اپنی پوری زندگی فقیری ودرویشی میں بسر کی۔ زندگی کا بیشتر حصہ انھوں نے صوفیائے کرام کی صحبت میں گزارا اور ان کی صحبتوں سے مستفیض ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ فنا نے اپنے آخری ایام پنجاب کے گوجرانوالہ میں موضع ڈاک خانہ آروپ شریف میں قوال اختر شریف صابر حسین کے ساتھ گزارے۔ داتا گنج بخش کے سالانہ عرس میں شرکت کی غرض سے اختر شریف اور صابر حسین کے ساتھ لاہور گئے تھے، وہیں ان کو دل کا دورہ پڑا اور وہ اس دنیا سے فنا ہوگئے۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کا جنازہ آروپ شریف گوجرانوالہ لایا گیا اور یہیں ان کی تدفین ہوئی۔ فنا بلند شہری اس دنیا سے جاچکے ہیں لیکن ان کا کلام ہر محفل سماع اور ادبی دنیا میں زندہ جاوید ہے۔ فنا کے کلام کا پہلا ایڈیشن 'دیوان فنا' کے نام سے محمد نقیب اللہ شاہ کے مرید خاص مرزا مظفر بیگ کی کاوش سے 1992 میں مظفر آرٹ پرنٹرز جامع الفردوس۔ بالمقابل جے مارکیٹ کورنگی۔ کراچی سے شائع ہوا۔ 'دیوان فنا' کے آخر میں محمد نقیب اللہ شاہ کی محفل سماع میں پڑھے گئے دوسرے شعرا کے کلام کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

فنا بلند شہری اردو کے معتبر ومنفرد صوفی شاعر ہیں۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، اور اس میدان میں انھوں نے فکروفن کا اعلی نمونہ پیش کیا ہے۔ اشاریت، اختصار وجامعیت، موضوعات کی وسعت، علامتی انداز بیان، سادگی، لطافت وغیرہ ان کی غزلوں کی اہم خصوصیات ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے، ان کی شاعری واردات قلبی کی ترجمان ہے۔ فنا کو اپنے پیرومرشدین سے بے پناہ محبت تھی، ان کا زیادہ تر وقت صوفیائے کرام کی صحبت میں گزرتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بہت غالب نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں عشق حقیقی ومجازی دونوں کیفیتوں کا ذکر پرکیف وپرتاثیر انداز میں ہوا ہے۔ انھوں نے معرفت وسلوک کے مضامین کو بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔ فنا نے اپنے کلام میں زندگی کے تجربات، حقائق ومعرفت، دلی جذبات وواردات کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ ان کے یہاں خیالات کی پاکیزگی، فکر کی گہرائی، تصوف کی چاشنی، زبان کی سادگی بڑی فن کاری سے کی گئی ہے۔

فنا کی غزلوں میں سوز وگداز، جذبات واحساسات، عشق ومحبت اور واردات قلبی، محبوب کی بے نیازی، ناز آفرینی، عاشق کی نیاز مندی اور خاکساری، فراق کی اذیتیں، جذبات کی حدت، احساسات کی شدت، جوش وحرارت وغیرہ کا اظہار بڑی خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔ ان کی غزلوں میں ترنم، نغمگی اور روانی ہے۔ سہل ممتنع اور پرکاری وسادگی بھی فنا کی غزلوں کی شناخت ہے، ترنم کی چاشنی تو ان کی بعض غزلوں میں اس قدر ہے کہ عوام وخواص دونوں طبقے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی بعض غزلوں میں عشق مجازی کا رنگ پورے طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔ مثال کے لیے ان کا مشہور کلام ملاحظہ ہو

میرے رشک قمر، تو نے پہلی نظر، جب نظر سے ملائی مزا آگیا
برق سی گر گئی، کام ہی کر گئی، آگ ایسی لگائی مزا آگیا
جام میں گھول کر حسن کی مستیاں چاندنی مسکرائی مزا آگیا
چاند کے سائے میں اے مرے ساقیا تو نے ایسی پلائی مزا آگیا
نشہ شیشے میں انگڑائی لینے لگا بزم رنداں میں ساغر کھنکنے لگا
میکدے پہ برسنے لگیں مستیاں جب گھٹا گھر کے آئی مزا آگیا
بے حجابانہ وہ سامنے آگئے اور جوانی جوانی سے ٹکرا گئی
آنکھ ان کی لڑی یوں میری آنکھ سے، دیکھ کر یہ لڑائی مزا آگیا
آنکھ میں تھی حیا ہر ملاقات پر سرخ عارض ہوئے وصل کی بات پر
اس نے شرما کے میرے سوالات پہ ایسے گردن جھکائی مزا آگیا
شیخ صاحب کا ایمان بک ہی گیا دیکھ کر حسن ساقی پگھل ہی گیا
آج سے پہلے یہ کتنے مغرور تھے لٹ گئی پارسائی مزا آگیا
اے فنا شکر ہے آج بعد فنا، اس نے رکھ لی میرے پیار کی آبرو
اپنے ہاتھوں سے اس نے مری قبر پہ چادرِ گل چڑھائی مزا آگیا

تم ہو شریک غم تو مجھے کوئی غم نہیں
دنیا بھی میرے واسطے جنت سے کم نہیں
چاہا ہے تجھ کو تجھ پہ لٹائی ہے زندگی
تیرے علاوہ کچھ مرا دین ودھرم نہیں
حسن بتاں کا عشق میری جان ہوگیا
یہ کفر اب تو حاصل ایمان ہوگیا
وہ بن سنور کے پھر مری محفل میں آگئے
بیٹھے بٹھائے حشر کا سامان ہوگیا
دیکھا جو اس صنم کو تو محسوس یہ ہوا
جلوہ خدا کا صورت انسان ہوگیا
پوجا کریں گے اس کی فنا ہم تمام عمر
وہ بت ہمارے واسطے بھگوان ہوگیا

فنا عشق مجازی کے رنگا رنگ پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے عشق حقیقی کی وادیوں میں پہنچتے ہیں تو تصوف ومعرفت کے اسرار ورموز کے پردوں کو کھولتے ہوئے عشق حقیقی میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ کائنات کی ایک ایک شے میں انھیں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے تصور کو بھی انھوں نے اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ اسی طرح ان کے کلام میں خدا کی حکمت ووحدانیت اور فضل وکرم، فنا وبقا کے اسرار ورموز پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثال کے لیے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ آشنائے منزل عرفاں ہوا نہیں
جس کو ترے کرم کا سہارا ملا نہیں
تیرا کرم متاع دوعالم مرے لیے
تیرا کرم رہے تو دوعالم میں کیا نہیں

تکمیل بندگی نہ ہوئی مجھ سے اے فنا
جب تک در حبیب پہ سجدہ کیا نہیں

لاج رکھ میرے جذب وفا کی میرے سجدوں کو اپنا پتہ دے
مجھ کو آتا نہیں سر جھکانا بندگی کا طریقہ سکھا دے
راز اب تک سمجھ میں نہ آیا راز کی بات ہے راز ہی میں
عشق چاہے تو مٹ جائے خود ہی حسن چاہے تو مردہ جلا دے
بات اب تک سمجھ میں نہ آئی تیرے جلوؤں میں ہے کیسا جادو
جان دیدے وہ منصور بن کر تو جسے چاہے جلوہ دکھا دے

درد دل حد سے جو گزرا تو مسیحا نکلا
میری صورت میں تیرے حسن کا پردہ نکلا
دیکھ کر مجھ کو فرشتوں نے پڑھا کلمہ حق
جذبہ عشق کا انجام یہ کیسا نکلا
اے فنا اب نہ کنارا ہے نہ کشتی ہے نہ موج
میں کہاں غرق ہوا اور کہاں جا نکلا

فنا کے کلام کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ایک طرف محبوب کے حسن وجمال کو پیش کرنے میں شوخی اور رنگینی سے کام لیتے ہیں، تو دوسری طرف تصوف ومعرفت کے مضامین کو بڑے سنجیدہ اور پروقار لہجے میں بیان کرتے ہیں۔ روزمرہ، بے تکلف اور برجستہ الفاظ ومحاورات کے استعمال نے فنا کے کلام کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ وہ صاف وشستہ زبان کو فن کارانہ انداز میں برتنے کے ہنر سے بخوبی واقف تھے۔ زبان وبیان کی ندرت، سادگی، روانی، بے ساختگی، نغمگی اور موسیقیت وفن کی پختگی، اسلوب کی جدت، اچھوتی تشبیہات ونادر استعارات ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ فنا کے کلام میں صوفیانہ خیالات، عارفانہ رموز واسرار کی گرہ کشائی بڑی سادگی ودلکشی سے کی گئی ہے۔ ان کی غزلیں داخلی وخارجی

دونوں طرح کے جذبات وکیفیات کی آئینہ دار ہیں۔ زبان کی پختگی، شیرینی، سادگی وسلاست، دلکشی تشبیہات واستعارات، محاورات کا برمحل ومناسب استعمال، لطیف وشائستہ انداز بیان، سوزوگداز کی تاثیر فصاحت وبلاغت سب کچھ ان کے کلام میں موجود ہے۔

جب تک میرے ہونٹوں پہ تیرا نام رہے گا
دل بے خبر گردش ایام رہے گا
مٹ جائے گا ہر نقش خیال غم ہستی
لیکن ورق دل پہ تیرا نام رہے گا
کیوں ڈر ہے گناہوں کے سبب حشر کے دن کا
ہم جانتے ہیں ان کا کرم عام رہے گا
دامن ہے اگر تیرا میرا دست طلب میں
آغاز سے بہتر میرا انجام رہے گا
آنکھیں ہی نہیں تیری فنا دید کے قابل
تو جلوہ گہہ یار میں ناکام رہے گا

بلاشبہ فنا ایک باکمال صوفی شاعر ہیں جن کے کلام کو قوالوں اور غزل گانے والوں نے پاکستان میں بکثرت گایا ہے۔ عوامی سطح پر اور صوفیا واہل سماع کی مجالس میں فنا کے کلام کو بڑی مقبولیت وعظمت حاصل ہے مگر افسوس ان کے حیات وفن پر ہندوپاک میں کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ جناب اطہر فاروقی صاحب کی کاوشوں سے فنا کے دیوان کی ایک فوٹو کاپی مجھے مل سکی جس کی روشنی میں یہ مضمون لکھا گیا ہے۔

■

Mohd Farooque Khan
M. S. Inter College Sikandarabad
Bulandshahar- 203205 (U.P)
Mob No.9359955642

مہاشویتا دیوی ایک نظر میں

اسد رضا

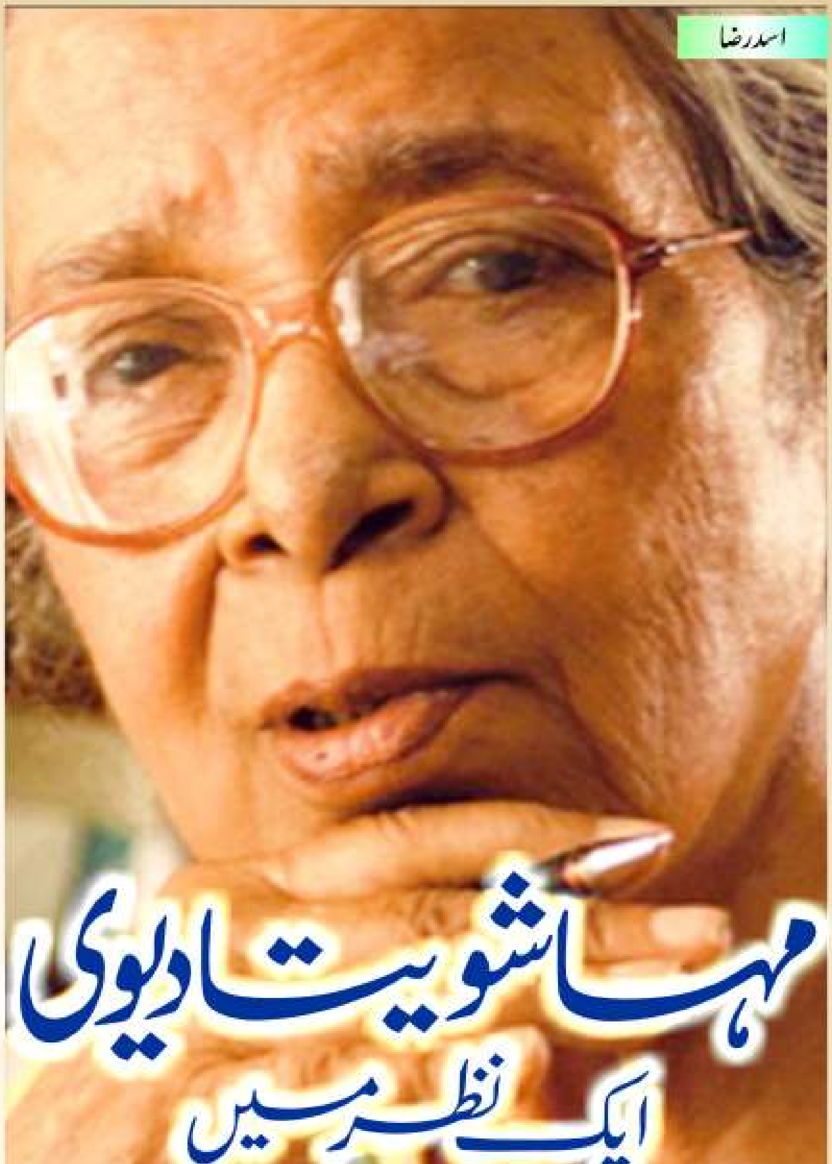

اگرچہ بنگلہ زبان کی عظیم مصنفہ مہاشویتا دیوی موت کی آغوش میں جاچکی ہیں لیکن وہ اپنی کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ مغربی بنگال، چھتیس گڑھ، مدھیہ پردیش اور جھارکھنڈ کے آدی واسیوں کی آنکھوں کو وہ اپنی محبت بھری یادوں کی شمع سے روشن کیے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی اس مایہ ناز بیٹی نے ساری علمی وادبی دنیا میں اپنے قلم اور علم وحلم کا ڈنکا بجایا اور عالمی ادب میں اپنا مقام بنایا۔ مہاشویتا دیوی 14 جنوری 1926 کو ڈھاکہ (موجودہ بنگلہ دیش کی راجدھانی) میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم رابندر ناتھ ٹیگور کی قائم کردہ تعلیم گاہ شانتی نکیتن میں ہوئی۔ مہاشویتا دیوی نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد وشو بھارتی یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔ بعد ازاں وہ 1964 میں بجوگڑھ کالج میں درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہوگئیں۔ مہاشویتا دیوی نے انڈین پیوپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (اپٹا) کے سرگرم رکن بجن بھٹاچاریہ کے ساتھ شادی کی، جس کے بعد 1948 میں ان کے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام نبارن بھٹاچاریہ رکھا گیا لیکن 1959 میں مہاشویتا دیوی نے اپنے شوہر سے علاحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح وہ مطلقہ ہوگئیں۔ ان کا بیٹا بنگلہ زبان کا ایک اہم مصنف ثابت ہوا، لیکن 2014 میں 66 سال کی عمر میں نبارن کا انتقال ہوگیا۔ مہاشویتا دیوی کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا لیکن لاکھوں قبائلیوں کو اپنی اولاد سمجھنے والی اس عظیم مصنفہ نے اس بڑے سانحہ کو بھی برداشت کیا۔ مہاشویتا دیوی نے اخبارات وجرائد کے لیے بھی لکھنا شروع کیا۔ تاہم اس سے قبل محض 13 سال کی عمر میں مہاشویتا دیوی ننھی منی کہانیاں لکھنے لگی تھیں جبکہ 30 سال کی عمر میں یعنی 1956 میں ان کا پہلا ناول 'جھانسر رانی' (جھانسی کی رانی) شائع ہوکر بنگلہ زبان کے ادبی حلقوں میں دھوم مچا چکا تھا۔ دراصل مہاشویتا جی جھانسی کی مہارانی لکشمی بائی کی دلیری اور انگریزی سامراج سے ٹکر لینے کے ان کے عزم سے بے حد متاثر تھیں۔ 1857 کی جنگ آزادی میں جہاں متعدد مجاہدین نے آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کیں وہیں جھانسی کی رانی لکشمی بائی اور اودھ کی رانی بیگم حضرت

مہاشویتا دیوی-ایک نظر میں

تاریخ پیدائش: 14 جنوری 1926

جائے پیدائش: ڈھاکہ (آج کل بنگلہ دیش کی راجدھانی)

ابتدائی تعلیم: شانتی نکیتن، کلکتہ یونیورسٹی سے گریجویشن

وشو بھارتی یونیورسٹی سے ایم اے (انگریزی ادبیات)

1964 میں بجوگڑھ کالج میں لیکچرار کے طور پر درس وتدریس

ایک صحافی اور ادیب کے طور پر لکھنا شروع کیا۔

مہاشویتا دیوی نے قبائلیوں کی فلاح کے لیے اقدام کیے۔

قبائلی لوگوں کے مسائل ومصائب پر لکھنا شروع کیا۔

13 سال کی عمر میں کہانیاں لکھنی شروع کیں۔

1956 میں پہلا ناول 'جھانسر رانی'

1974 میں دوسرا اہم ناول 'ہزار چوراشیر ما'

1978 میں افسانوں کا مجموعہ 'اگنی گربھا'

1980 میں آدی واسیوں سے متعلق ناول 'چھوٹی منڈا اور ترتیر'

1990 میں ناول 'بشال تنڈو'

1998 میں ڈرامہ 'بیلن'

ناول 'ارنیر ادھیکار' کی اشاعت۔

1996 میں چھارا قبیلے کی کالونی میں 'بدھان' تھیٹر قائم کیا۔

مغربی بنگال، چھتیس گڑھ، بہار اور جھارکھنڈ میں قبائل کی تعلیم کے لیے سرگرم رہیں۔

'ڈسٹ آن دی روڈ' صحافتی تحریروں کا مجموعہ۔

ان کے ناولوں اور کہانیوں پر فلمیں بنائی گئیں۔

اپٹا کے رکن بجن بھٹاچاریہ سے شادی لیکن 1959 میں طلاق۔

انہیں پدم شری، پدم بھوشن، ساہتیہ اکادمی، گیان پیٹھ، ریمن میگسیسے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

28 جولائی 2016 کو کولکاتہ میں انتقال۔

محل نے بھی آزادی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا تھا۔ اس ناول کے بعد 1974 میں اس بنگلہ ناول نگار کا دوسرا ناول 'ہزار چوراسی شیرما' (ہزار چوراسی کی ماں) منظر عام پر آیا۔ اس ناول کی بھی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ مصنفہ کی حقیقت نگاری سے قارئین بہت متاثر ہوئے۔

مہاشویتا دیوی کا افسانوی مجموعہ 'اگنی گربھا' 1978 میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے افسانوں میں بھی سماجی حقیقت نگاری تھی اور خواتین بالخصوص قبائلی خواتین اور بچوں کے مسائل ومصائب کا افسانوی انداز میں تذکرہ تھا۔ لہٰذا یہ کافی پسند کیا گیا۔ دوسال بعد یعنی 1980 میں ان کا تیسرا ناول 'چھوٹی منڈا اور تریتر' جلوہ افروز ہوا۔ اس ناول میں مصنفہ نے قبائلی زندگی کی، آدی واسیوں پر اعلیٰ ذات کے سرمایہ داروں، زمینداروں اور ٹھیکیداروں کے مظالم اور سماجی ومعاشی استحصال کی تصویر کشی کی۔ لہٰذا اس ناول کا بھی ادبی دنیا میں خاطر خواہ خیر مقدم کیا گیا۔ 1990 میں اس ممتاز ناول نگار کا چوتھا ناول 'بشال تنڈ' شائع ہوا جسے بنگلہ قارئین نے کافی سراہا۔ چونکہ مہاشویتا جی ایک ڈرامہ نگار بھی تھیں اور انھوں نے کئی ڈرامے تحریر کیے۔ لہٰذا ان کے ڈرامے 'بیان' کی اشاعت 1998 میں ہوئی۔ ان کے اس ڈرامے کی بھی خاصی پذیرائی ہوئی۔ ان کا پانچواں ناول 'ارنیر ادھیکار' (جنگلوں پر حق) بھی آدی واسیوں کے جنگلات پر دوسروں کے قبضے کی کہانی ہے۔ اس ناول کو بھی بنگلہ ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا۔ اس ممتاز بنگلہ مصنفہ کی صحافتی تحریروں کے ایک مجموعے 'ڈسٹ آن دی روڈ' (سڑک کی دھول) کو بھی سراہا گیا۔

مہاشویتا دیوی ڈراموں کے ذریعے بھی آدی واسیوں کو تعلیم دیتی تھیں، انھیں بیدار کرتی تھیں اور قبائلی زندگی کے مسائل ومصائب سے دنیا کو آگاہ بھی کرتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے احمد آباد میں چھارا قبیلے کی کالونی میں 'بدھان' تھیٹر قائم کیا۔ تھیٹر سے منسلک ہونے کے علاوہ مہاشویتا دیوی کے فکشن کی جانب فلم سازوں کی بھی توجہ مبذول ہوئی۔ ان کے ناولوں، کہانیوں اور ڈراموں پر فلمیں بھی بنائی گئیں۔

یہاں یہ تذکرہ بھی برمحل ہوگا کہ مہاشویتا دیوی کی چند تخلیقات کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا جس کی بدولت

ان کی شہرت سارے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ عالم ادب میں بھی ہوگئی۔ اسی لیے ان کی تخلیق کو 1979 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1996 میں ان کی ادبی کاوش کو گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا۔ انھیں عالمی شہرت یافتہ ایوارڈ ریمن میگسیسے سے بھی 1997 میں سرفراز کیا گیا۔ لیکن اتنے اہم اعزازات واکرام کے باوجود مہاشویتا دیوی میں غرور وتکبر نام کو بھی نہیں آیا اور وہ کئی کلومیٹر پیدل چل کر غریبوں کی خدمت بھی کرتی رہیں نیز انھیں ان کے حقوق کے تئیں بیدار بھی کرتی رہیں۔ حکومت ہند نے بھی اس ممتاز ومنفرد مصنفہ کے کارہائے نمایاں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے 1986 میں پدم شری اور 2006 میں پدم بھوشن سے نوازا۔

مہاشویتا دیوی آدی واسیوں کے لیے بھی ماں جیسی ہی تھیں۔ دراصل مہاشویتا دیوی نے اپنی عمر کا ایک طویل حصہ مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ، جھارکھنڈ اور مغربی بنگال کے آدی واسیوں کی خدمت میں صرف کیا۔ وہ 70 سال کی عمر میں بھی کئی کئی کلومیٹر پیدل چل کر قبائلیوں کی بستیوں میں جاتی تھیں، ان کے دکھ درد بانٹتی تھیں، انھیں تعلیم دیتی تھیں اور انھیں ان کے حقوق کے تئیں بیدار بھی کرتی تھیں۔ انھوں نے قبائلی زبان کو بھی سرکاری درجہ دلانے کے لیے آواز اٹھائی۔ جن قبائل کو انگریزوں نے جرائم پیشہ قرار دیا تھا انھیں وہ عام سماجی دھارے میں لائیں۔ مہاشویتا دیوی ڈراموں کے ذریعے بھی آدی واسیوں کو تعلیم دیتی تھیں، انھیں بیدار کرتی تھیں اور قبائلی زندگی کے مسائل ومصائب سے دنیا کو آگاہ بھی کرتی تھیں۔ اس لیے انھوں نے احمد آباد میں چھارا قبیلے کی کالونی میں 'بدھان' تھیٹر قائم کیا۔ تھیٹر سے منسلک ہونے کے علاوہ مہاشویتا دیوی کے فکشن کی جانب فلم سازوں کی بھی توجہ مبذول ہوئی۔ ان کے ناولوں، کہانیوں اور ڈراموں پر فلمیں بھی بنائی گئیں۔ مثلاً 1968 میں ان کی کہانی پر مبنی فلم سنگھرش کافی مقبول ہوئی۔ اس فلم میں دلیپ کمار اور وجینتی مالا وغیرہ جیسے عظیم اداکاروں نے کام کیے۔ اسی طرح 1993 میں آئی فلم رداولی بھی ان کی ہی کہانی پر بنائی گئی تھی۔ ان کے ناول 'ہزار چوراسی کی ماں' کو بنیاد بنا کر 1998 میں اسی نام سے فلم بنائی گئی جس میں

جولائی 2016 کو یہ عظیم بنگلہ فکشن نگار آدی واسیوں کی غمگسار، صحافی اور ڈرامہ نگار یعنی مہاشویتا دیوی نے کلکتہ کے اسپتال میں90سال کی عمر میں آخری سانس لی۔تاہم وہ اپنے ناولوں، کہانیوں اور ڈراموں کے علاوہ ان کروڑوں قبائلیوں کے دلوں میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی۔جن کی زندگی کو سنوارنے اور جنہیں انسانی حقوق دلانے کے لیے وہ قلم سے ہی نہیں بلکہ عمل سے بھی جدوجہد کرتی رہیں۔ ساری دنیا نے اس مجاہدہ اورادب کی دیوی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

جیا بچن اور انوپم کھیر نے کام کیا تھا۔ 2006 میں ان کی کہانی پر فلم 'مائی مائی' بنائی گئی جسے کافی پسند کیا گیا۔

28 جولائی 2016 کو یہ عظیم بنگلہ فکشن نگار آدی واسیوں کی غمگسار، صحافی اور ڈرامہ نگار یعنی مہاشویتا دیوی نے کلکتہ کے اسپتال میں 90 سال کی عمر میں آخری سانس لی۔ تاہم وہ اپنے ناولوں، کہانیوں اور ڈراموں کے علاوہ ان کروڑوں قبائلیوں کے دلوں میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی۔ جن کی زندگی کو سنوارنے اور جنھیں انسانی حقوق دلانے کے لیے وہ قلم سے ہی نہیں بلکہ عمل سے بھی جدوجہد کرتی رہیں۔ ساری دنیا نے اس مجاہدہ اورادب کی دیوی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

■

Asad Raza, 97F Sector7, Jasola Vihar
New Delhi-110025

شاہین بدر

سید شاہد اقبال

چاند مانگے نہ ستاروں کا مقدر مانگے
زندگی قطرہ شبنم سے سمندر مانگے
تلک دوسرے لوگوں کو سنوارا شاہین
آج وہ آئینہ اپنے لیے پتھر مانگے

شاہین بدر کا اصل نام سید محمد ابوہاشم عابدین تھا۔ ان کے والد کا نام سید محمد زین العابدین تھا۔ ان کی پیدائش 7 جولائی 1938 کو موضع بچلوت میں ہوئی تھی۔ آزادی کے بعد بہار میں ضلعوں کی انتظامی تقسیم کے بعد موضع بچلوت ضلع مدھے پورہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔

شاہین بدر کے والدین بھاگلپور منتقل ہو گئے تھے۔

شاہین بدر کے ایک بھائی ظفر امام عابدین اور دو بہنیں نور جہاں اور شمس جہاں تبسم تھیں۔ وہ لوگ شہر بھاگلپور کے محلّہ حبیب پور میں سکونت پذیر تھے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو کی مشہور شاعرہ کہکشاں تبسم، شمس جہاں تبسم کی صاحبزادی ہیں۔

شاہین بدر کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی۔ انھوں نے اپنی پہلی غزل 1952 میں پبلک لائبریری حبیب پور (بھاگلپور) کے تاریخی مشاعرے میں پڑھی تھی۔ اس وقت ان کا تخلص بدر بھاگل پوری تھا۔ ان کا کلام 55-1954 میں جمالستان دہلی میں شائع ہوا۔ 1961 سے ان کی تخلیقات مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

راقم الحروف کو شاہین بدر کی ایک عزیزہ نزہت نبیلہ (ساکن پورب سرائے مونگیر) نے بتایا کہ شاہین بدر کی شادی سرور جہاں بنت سید وحید الدین ساکن بیلن بازار مونگیر سے ہوئی تھی۔ ان سے چار لڑکیاں اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ان کے نام اس طرح ہیں: (1) آرزو (2) پیکر (3) صبوحی (4) رباب (دختران) اور (1) شاذ (2) فراز (پسران)۔

1961 میں شاہین بدر مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) چلے گئے تھے۔ وہاں 1961 سے 1971 تک جناح ہائی اسکول پاربتی پور (مشرقی پاکستان) میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن 16 دسمبر 1971 کو سقوط مشرقی پاکستان (قیام بنگلہ دیش) کے دل دوز واقعات سے دل برداشتہ ہو کر شاہین بدر اپنے آبائی وطن بھاگل پور لوٹ آئے۔ مگر افسوس 1980 میں دوبارہ پاکستان ہجرت کر گئے۔

مہاجرت کا سفر ہے جاری
نہ دیکھی مدت سے گھر کی صورت
سہارا دیتا ہے پھر بھی میکر
یہ دل ہے شاہین کھنڈر کی صورت

کراچی شہر میں ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ انھوں نے پھر سے جینا سیکھ لیا۔ وہاں عزت، شہرت، دولت، سب کچھ مل گیا۔ ان کی شاعری کو ایک خاص مقام حاصل ہوا۔ ان کا مجموعہ کلام 'زرد موسم کی ہوا' اگست 2000 میں کراچی (پاکستان) سے شائع ہوا۔ شاہین بدر ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ ان کی شاعری کو ایک مقام حاصل ہوا۔

شاہین بدر مدیر عزم نو (پاربتی پور) مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) اور مدیر سہ ماہی خیال (کراچی/ پاکستان) بھی رہ چکے ہیں۔

شاہین بدر کا انتقال یکم جون 2003 کو کراچی میں ہوا۔ ان کا مدفن قبرستان ناتھ کراچی میں ہے۔ (وفیات ناموران پاکستان ص 386)

افسوس کہ اس عظیم شاعر کو دو گز زمین بھی اپنے وطن میں نصیب نہ ہو سکی۔ بقول آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر۔

ہے کتنا بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

جناب مرتضیٰ گوہر نے اپنے مضمون 'شاہین بدر- ایک تعارف' (مطبوعہ ماہنامہ سہیل گیا/ بھاگلپور کا موجودہ ادبی ماحول نمبر میں شاہین بدر کے بارے میں لکھا ہے۔

''شاعری ان کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ شکل صورت وضع قطع اور چہرے مہرے سے یہ ایک خوش باش جوان معلوم ہوتا ہے لیکن کسی مشاعرے میں اپنی غزل پڑھتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کوئی اور شخص ہے جس کا لباس تار تار ہے اور بدن زخموں سے چور۔

ہیں میرے چاروں طرف بدر درد کے کانٹے
میرا نصیب بھی شاخ گلاب جیسا ہے

چلے تھے فصل بہاراں کالطف اٹھانے ہم
مگر نصیب میں سوکھے شجر نکل آئے
موسم مسرت میں سب ہی ساتھ رہتے تھے
جب خزاں کادور آیا رہ گیا شجر تنہا
یہ بھی اک تماشہ تھا زندہ دل نگاہوں میں
پتھروں کے میلے میں تھا جو میرا سرتنہا

لیکن یہ شاعر ہمت نہیں ہارتا کہتا ہے۔

سینہ سپر ہیں چین کی دیوار کی طرح
ہمت بھی سربلند ہے مینار کی طرح
لہراتے مسکراتے ہوئے ہم گذر گئے
آئے جو مرحلے رسن و دار کی طرح
آخر شب آلام سے گھبراتے ہیں کیوں لوگ
سورج کے نکلنے میں ذرا دیر تو ہوگی
میرا وجود کشمکش روزگار میں
تالاب میں کنول کی طرح سربلند ہے
ہم بھی سقراط ہیں کہ لے آئیں
زہر کا جام بار کر لب تک
سحر ہے دور تو کیا غم ہے بدر عزم اپنے
اندھیری رات میں جلتے ہیں شعلوں کی طرح
قدم لرز نہ سکے موجۂ حرارت سے
تھپیڑے لاکھ سہے ہم نے ساحلوں کی طرح

شاہین بدر حسن وعشق کا بھی قائل ہے خوداس نے اپنی پسند کی شادی کی اور کامیاب زندگی گذاری لیکن اس کا ماضی بہت دردناک ہے جس کی یاد اب بھی اس کی روح کولرزا دیتی ہے۔ اکثر و بیشتر روتے روتے ہنسنے لگتا ہے ایک بار اس نے کہا تقسیم وطن نے جتنے زخم دیے ہیں ان کو تو بھلایا جاسکتا ہے لیکن میں ان گلیوں کو کیسے فراموش کردوں جہاں میرا بچپن گذرا ہے۔

یہ شخص جہاں والدین کے پیار کا بھوکا ہے وہاں دوستوں سے بھی ماضی میں کافی رنج اٹھا چکا ہے۔

(ماہنامہ سہیل گیا 1969، بھاگلپور موجودہ ادبی ماحول نمبر ص 84-383)

شاہین بدر کا شعری مجموعہ بہت پہلے مرتب ہو چکا تھا اس پر دعائیہ کلمات ڈاکٹر عنوان چشتی نے جنوری 1977 میں لکھا تھا اور پروفیسر مظفر حنفی و ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاہین بدر اپنا شعری مجموعہ 1980 سے قبل ترتیب دے چکے تھے لیکن اس کی اشاعت دو دہائیوں کے بعد ممکن ہوئی۔ ان کا شعری مجموعہ 'زرد موسم کی ہوا' کے عنوان سے اگست 2000 میں کراچی سے شائع ہوا۔

پروفیسر عنوان چشتی لکھتے ہیں:

'زرد موسم کی ہوا' ایک ایسے شاعر کی شعری تحریروں کا آئینہ ہے جس کی زندگی پر چاندنی کے نہیں ویرانیوں کے سائے ہیں اور اس نے اپنے تخلیقی سفر میں احساس کے زخموں کو زاد راہ بنایا ہے۔ شاہین بدر کی شاعری شعری روایت اور نورومانیت کا ایسا دلکش آمیزہ ہے جس میں ایک طرف اس شعری زبان کے زندہ عناصر کی فراوانی ہے جو ایک صدی سے اردو غزل کا غالب وسیلہ اظہار ہیں اور دوسری طرف نئے پیکروں اور استعاروں کا رنگ و آہنگ بھی ہے۔ یہ ایسی خصوصیت ہے جو ان کی شاعری کو ایک خاص مقام عطا کرتی ہے۔'' (دہلی، 19رجنوری 1977)

ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے:

شاہین بدر کی نظموں کے یہ چند ٹکڑے ملاحظہ کریں جو اس کے صحرائی سفر اور اس کے دوران سورج کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔

دھوپ کے خیمے نصب ہیں ہرسو
اونچے درختوں پر سورج کی برف جمی ہے

(مقدس رشتہ)

میں اپنی عمر کے تاریک ریگستان کا تنہا مسافر ہوں

(اندھیری رات کا تنہا مسافر)

جل رہا ہے درد کا سورج جہنم کی طرح
سائے سائے کے لبوں پر پپڑیاں

(اندھیری رات کا تنہا مسافر)

شاہین بدر نے یہ بھی منظر دیکھا ہے۔ وہ ایک ایسے تجربے سے گزرا ہے کہ جس نے اس کی کایا پلٹ دی ہے۔ اصلاً یہ ایک مذہبی تجربہ ہے جس نے اسے اندر سے کندن بنا دیا ہے۔

دہکتی آگ میں کندن بنا بدن میرا
حرا کے غار کی پاکیزگی پکارتی ہے

(بھیک شبنم کی)

میں کہ پاکیزگی غار حرا
میں تری فکر شہکار عظیم

(دعاؤں کا شبنم)

غار حرا کا حوالہ ایک انوکھی معنویت سے برتر ہے اور اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ شاعر نے سمندر یا جنگل کو بطور کینوس کیوں استعمال نہیں کیا-؟ اس کے بجائے اس نے پیاس کے صحرائے عظیم کو کینوس کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اس پر غار حرا کا منظر ابھارا ہے جو اس کی قلب ماہیت ہی کا ایک ثبوت ہے۔

(زرد موسم کی ہوا صفحہ 11 تا 13)

پروفیسر مظفر حنفی نے لکھا ہے:

''کراچی سے دور افتادہ مقام پر کچھ لوگ باقاعدہ اپنی اپنی آواز اور لہجے کی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اچھے شعر کہہ رہے ہیں اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ بھاگلپور کے جاگیردارانہ معاشرے سے بغاوت کرنے والا شاہین بدر جس کی روایت شکنی سے اس کے والدین تک برگشتہ خاطر تھے ان اچھے اور سچے فنکاروں کی صف میں شامل ہے وہ نہ صرف یہ کہ غزل کہہ رہا ہے نئی غزل کہہ رہا ہے بلکہ پاؤں رکاب میں اور ہاتھ باگ پر رکھ کر غزل کہتا ہے۔

شہر ڈوب جاتا ہے رات کے سمندر میں
پھول شاخ مژگاں پر جگنوؤں کا کھلتا ہے
اپنی آنکھوں میں گئے دن کے مناظر لے کر
شام کی شاخ پر بیٹھا ہے پرندہ ہی

(زرد موسم کی ہوا ص 17)

کانچ کی شاخوں پر پتھر کے گلاب اگنے کو ہیں
اب کے موسم کا تماشا میرے مالک دیکھنا
آسماں کے طاق پر جلتے رہے اک اک چراغ
میں زمین کا چاند اپنے ہی خلا میں قید تھا
کوئی بھی موسم ہو، فصل اشک اگتی ہے یہاں
آنکھ کی مرطوب دھرتی کس قدر زرخیز ہے
شاہین کیا کروں گا میں خوشبو کے شہر میں
میرے جنوں کو دشت نوردی پسند ہے

(زرد موسم کی ہوا ص 19)

افسوس کہ شاہین بدر آج ہمارے درمیان نہیں وہ زندگی کی 70 بہاریں دیکھ کر اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے!! (خدا ان کی مغفرت کرے آمین)

حواشی:

(1) زرد موسم کی ہوا: شاہین بدر، احمد برادرز پرنٹرز کراچی، اگست 2000
(2) سہیل گیا۔ (بھاگل پور کا موجودہ ادبی ماحول نمبر) 1969
(3) شاعر (ماہنامہ، بمبئی) فروری 2003، ستمبر 2003
(4) ضرب قلم (مجلہ جناح ہائی اسکول پارتی پور) (1) مجلہ نمبر 23، بابت 2003، (2) مجلہ نمبر 24، بابت 2006
(5) قومی تنظیم (روزنامہ، پٹنہ)
(1) شاہین بدر کی شاعری، ایاز الدین بابت 10 مئی 2014، (2) شاہین بدر: نزہت نبیلہ، بابت 21 دسمبر 2014
(6) وفیات ناموران پاکستان مرتبہ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ ناشر اردو سائنس بورڈ لاہور، 2006، ص 386

■

Dr. S. Shahid Iqbal
At: Astana-e-Haque, Road No: 10
West Block, New Karimganj
Gaya- 823001 (Bihar)
Mob.: 09430092930
E-mail: drsshahidiqbal@gmail.com

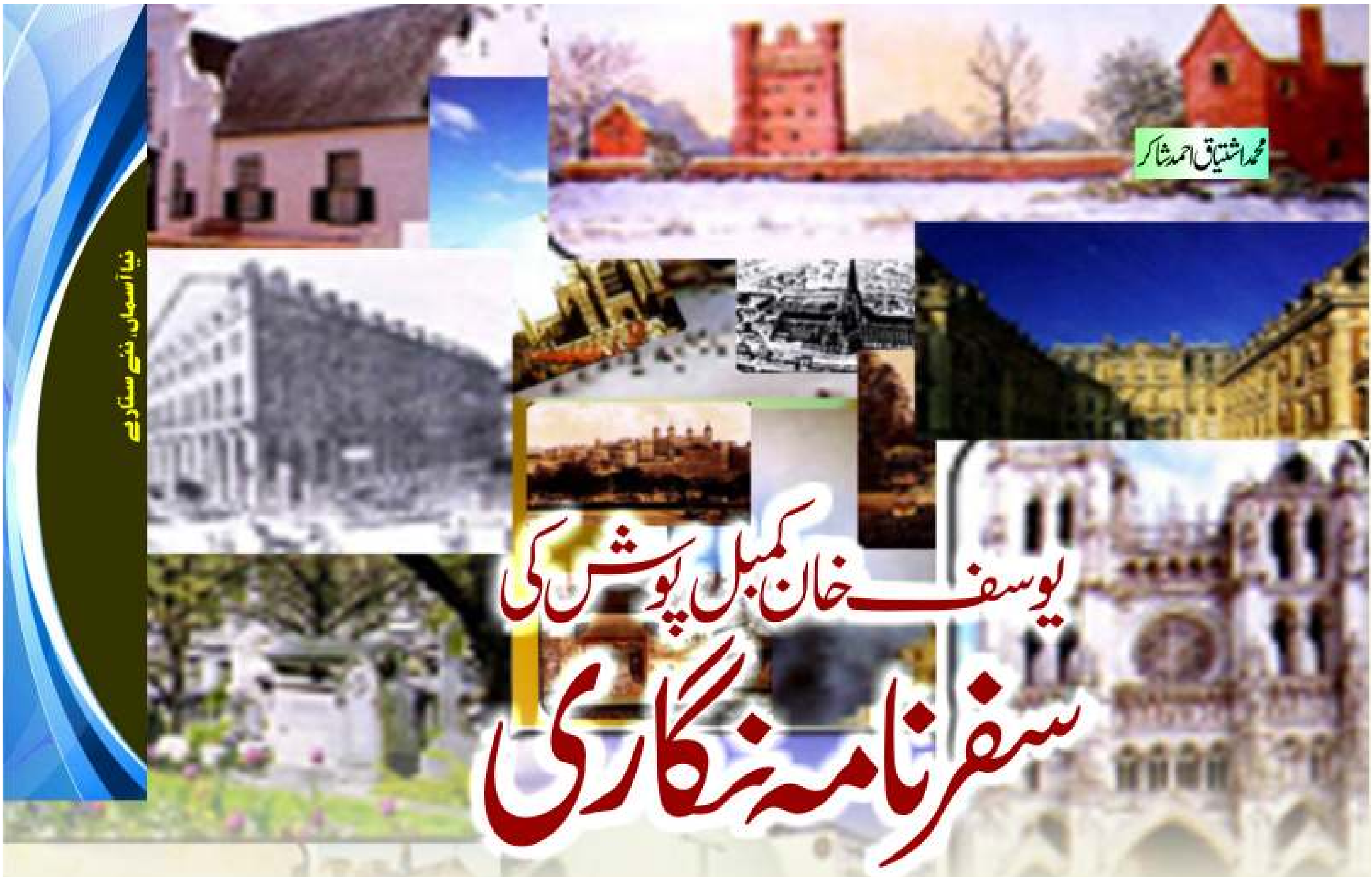

محمد اشتیاق احمد شاکر

یوسف خان کمبل پوش کی سفرنامہ نگاری

اردو ادب میں سفر نامے کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے، انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سیر وسیاحت کے لیے سفر کریں، فطرت کے دلنشیں مناظر دریا، پہاڑ، خوبصورت جھیل، حسین وادیاں، فلک بوس عمارتوں کی دید کے لیے گھر سے نکلنے پر مجبور ہوتا ہے اور قدرت کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے جب کوئی حساس اور قرطاس وقلم کا دلدادہ شخص کسی جگہ کا سفر کرتا ہے تو وہ مختلف چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور تجربات ومشاہدات سے گزرتا ہے تو وہ اپنے قاری کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے اپنے دلی جذبات واحساسات کو سفرنامے کی شکل میں پیش کرتا ہے۔

سفر نامہ اپنے عہد کا آئینہ ہوتا ہے۔ سماجی، مذہبی، سیاسی، تہذیبی، جغرافیائی، تاریخی اور اقتصادی حالات کی عکاسی کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ قوموں اور ملکوں کے حالات سے واقفیت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ نت نئی چیزوں کے دیکھنے کی خواہش سفر سے ہی پوری ہوتی ہے۔ تحقیق وتلاش کی جستجو انسان کو سفر پر آمادہ کرتی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ کولمبس اور واسکوڈی گاما سفر ہی کے ذریعہ ہندوستان اور امریکہ کی کھوج میں کامیاب ہوئے۔

سفر نامہ نہ صرف حصول معلومات کا ذریعہ ہے بلکہ قوموں اور ملکوں کے مزاج ومذاق کو سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے کسی ملک کے سماجی، تعلیمی، مذہبی، سیاسی اور تجارتی امور کا جائزہ جس طرح سفر ناموں میں کیا جاتا ہے اور اس سے دوسرے ملک کے لوگ اپنی ترقی وبلندی میں خاطر خواہ استفادہ کرتے ہیں۔ دوسرے ذرائع سے ممکن نہیں۔

سفر نامے اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتے ہیں، زبان وبیان کی شگفتگی، مناظر فطرت کی تصویر کشی، جذبات واحساسات کی وارفتگی سے قارئین لطف اندوز اور محظوظ ہوتے ہیں یہی وہ چیزیں ہیں جو سفر نامے کو زندہ وجاوید بناتی ہیں روایتی اور غیر روایتی سفر ناموں کے تعلق سے مشفق خواجہ کا یہ اقتباس اہمیت کا حامل ہے۔

''روایتی سفر نامہ ہمیں مقامات سفر سے متعارف کراتا ہے اور غیر روایتی سفر نامہ کیفیت سفر سے۔ مقامات سفر کی تفصیل لکھنے والا زمان ومکان کا اسیر ہوتا ہے۔ جب کہ کیفیات سفر قلمبند کرنے والا زمان ومکان سے ہٹ کر بھی سوچتا ہے اور یہی چیز اس کے سفرنامے کو معلومات کا گنجینہ بننے سے بچاتی ہے اور اس کا رشتہ ادب سے قائم کرتی ہے''

(مشفق خواجہ، دیباچہ موسموں کا عکس از جمیل زبیری ص 10)

انسانی زندگی میں جس طرح سفر کی بہت اہمیت ہے اسی طرح اردو ادب میں سفرنامے کی اہمیت مسلم ہے۔ سفر کے تجربات ومشاہدات سے انسان جس طرح خاطر خواہ فائدہ اٹھاتا ہے اسی طرح سفر نامے پڑھ کر نہ صرف گھر بیٹھے دنیا جہاں کی سیر کرتا ہے بلکہ سفر نامہ نگار کے دلکش اسلوب نگارش، شگفتگی وچاشنی سے معمور تحریروں سے لطف اندوزی وسرمستی حاصل کرتا ہے۔ اردو میں سفرنامے کی ایک مضبوط روایت رہی ہے۔ جو سفرنامے زیادہ مشہور ومقبول ہوئے ان میں ایک اہم سفرنامہ 'عجائبات فرنگ' ہے۔

اردو کے اولین سفر ناموں میں سب سے اہم سفر نامہ یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی کا ہے جو عجائبات فرنگ کے نام سے موسوم ہے۔ اس سفر نامہ کو تاریخ یوسفی بھی کہا جاتا ہے۔ یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی نے 1828 میں حیدرآباد کو چھوڑ کر متعدد مقامات کا سفر کیا جن میں عظیم آباد، ڈھاکہ، مچھلی بندر، مندراج، گورکھپور، نیپال، آگرہ، شاہ جہاں آباد، لکھنو، کلکتہ اور پھر انگلستان قابل ذکر ہیں۔ وہ خود یوں رقم طراز ہیں:

''یہ فقیر ہیچ 1828 مطابق 1246ھ حیدرآباد اپنے وطن خاص کو چھوڑ کر عظیم آباد، ڈھاکہ، مچھلی بندر، مندراج، گورکھپور، نیپال، اکبر آباد، شاہ جہاں آباد، وغیرہ دیکھتا ہوا

بیت السلطنت لکھنؤ میں پہنچا یہاں بہ مددگاری نصیبے اور یاوری کپتان ممتاز خان مکلینس صاحب بہادر کی ملازمت نصیرالدین حیدر بادشاہ سے عزت پانے والا ہوا۔ شاہ سلیمان نے ایسی عنایت اور خاوندی میرے حال پُر اختلال پر مبذول فرمائی کہ ہرگز نہیں تاب بیان اور یارائے گویائی۔ رسالہ خاص سلیمان میں عہدہ جماداری کا دیا بعد چندروز کے صوبے داری اسی رسالے کی دے کر درماہہ ٹھہرایا۔ بندہ چین سے زندگی بسر کرتا اور شکرانہ منعم حقیقی بجالاتا۔ ناگہاں شوق تحصیل علم انگریزی کا دامن گیر ہوا۔ بہت محنت کر کے تھوڑے دنوں میں اسے حاصل کیا بعد اس کے بیشتر کتابوں تواریخ کی سیر کرتا دیکھنے حال شہروں اور راہ و رسم ملکوں سے محظوظ ہوتا ایک بارگی سنہ اٹھارہ سو چھتیس عیسوی میں میرا دل طلبگاری سیاحی جہاں خصوصاً ملک انگلستان ہُوا۔ شاہ سلیمان جاہ سے اظہار کر کے رخصت دو برس کی مانگی۔ شاہ گردوں بارگاہ نے بصد عنایت و اکرام اجازت دی۔ عاجز تسلیمات بجالایا اور راہئی منزل مقصود ہُوا۔ تھوڑے دنوں بعد دارالامارۃ کلکتہ پہنچا۔ پانچ چھ مہینے وہاں کی سیر کرتا رہا۔ بعد ازاں جمعرات کے دن 30 مارچ کے مہینے سنہ اٹھارہ سو سینتیس عیسوی میں جہاز پر سوار ہو کر بیت السلطنت انگلستان کو چلا۔ نام جہاز کا 'ازابیلا' (Isabela) کپتان اس کا نام ڈابیڈ براں صاحب (DABID Brown) مع اپنے بی بی کے تھا۔'' (اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ صفحہ نمبر 96-95)

غرض انگریزی زبان سیکھنے کے مقصد سے جیسا کہ اس اقتباس سے واضح ہے یوسف خان کمبل پوش نے یہ سفر کیا تھا۔ کمبل پوش حیدرآبادی کے اس سفرنامہ 'عجائبات فرنگ' میں زبان و بیان کی لطافت اور چاشنی اور اسلوب کی انفرادیت واضح طور پر محسوس ہوتی ہے اس اعتبار سے اُس زمانہ کے لحاظ سے یہ ایک نہایت اہم سفرنامہ ہے جس کے مطالعے سے انگلستان کے حالات اور مشاہدات کا پتہ چلتا ہے جن کو یوسف خان کمبل پوش نے سادگی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اس سفرنامہ کی خصوصیات کو ملاحظہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یوسف خان کمبل پوش حسن و عشق کا دیوانہ اور جمال یا خوبصورتی کا متوالا تھا اس سفرنامہ میں ایسے کئی واقعات اور حالات کا اس نے ذکر کیا ہے جس میں عورتوں کے حسن و جمال کی کھل کر تعریف کی ہے اور بعض دلچسپ اور عجیب و غریب قصوں یا واقعات کو بیان کیا ہے جن کو ملاحظہ کرنے سے اس کا منچلا پن تو ظاہر ہوتا ہی ہے۔ یہ بھی لگتا ہے کہ اس کے اندر ابھی تک ایک رندی و سرمستی یا بچہ کی طرح بے قرار طبیعت ہے اور پھر کہیں وہ مرعوب و متاثر دکھائی دیتا ہے اور کہیں اگر کوئی نامناسب بات ہوتی ہے تو ایک حساس انسان کی طرح وہ تڑپ اٹھتا ہے اور اپنے گہرے درد و رنج کا اظہار کرتا ہے جیسے شاہِ وقت نے مصر کے سات سو بہادروں کو دھوکہ دہی کے ذریعہ بلوا کر قتل کرا دیتا ہے تو یوسف خان کمبل پوش نے اس قبیح اور مذموم عمل کو دیانت اور امانت کے خلاف اور بہادری و مہربانی سے بہت دور بتایا ہے اور بہت غم کا اظہار کرتے ہوئے دونوں جہاں میں اس کے منہ کو کالا قرار دیا ہے۔

یوسف خان کمبل پوش جس وقت لندن میں قیام فرما تھے اس وقت انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی اور اس کے جلوس کے منظر کو دیکھا اور اس کے حالات، مشاہدات اور تاثرات کو انھوں نے بیان کیا ہے جس میں ایک للچاتے بچے کی طرح ان کی حالت ظاہر ہوتی ہے جو کھانے پینے اور مٹھائیوں پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بے چین و بے تاب ہو جاتا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی کی رسم کی منظر کشی یوسف خان کمبل پوش کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''ملکہ مہر سیما کوئن وکٹوریہ مع اپنی والدہ ماجدہ کے

اس پر سوار تھیں، چاند صورت، سورج طلعت دکھائی دیتیں۔ تخمیناً عمر میں اٹھارہ برس کی۔ مجمع شرم و جمال عفت بے شمار تھیں۔ میں نے صورت دیکھتے ہی دل میں دُعا کی یا اللہ گاڑی ملکہ کی میرے پاس پہنچ کر ایک لحظہ ٹھہرے۔ خدا نے سُن لی جب گاڑی میرے سامنے آئی ایک ساعت رکی۔ چہرہ نورانی ملکہ کا میں نے بغور دیکھا، نمونہ قدرت ایزدی کا پایا۔ آداب تسلیمات بجالایا۔ نگاہِ عنایت سے میری طرف دیکھ کر تبسم فرمایا۔ ان کی ماں نے بھی دیکھا۔ میں خوشی سے پھولے نہ سمایا اور دل میں دعائیں دیتا رہا کہ یا اللہ اس سلطنت کو کبھی زوال نہ ہووے ہمیشہ زیادتی اور کمال ہوتا رہے غرض قدم میمنت لزوم کلڈ ہال رشک گلزار ہوا اور وہ میدان کثرتِ فوج و سپاہ وردی پوش سے رشک لالہ زار ایک رسالہ سواروں مشکی گھوڑوں کا زرہ اور خود پہنے نظر آیا۔ ہر ایک کی مونچھیں کھڑی کمال ہیبت اور شان سے ٹولیاں باندھے قدم باقدم برابر جاتا۔ تماشائیوں کو ان سے ہرگز صدمہ نہ پہنچتا۔ سواروں کے بہت توزک سے اور موج مسلح تھی دیکھنے سے اس کے بہت ہیبت آتی۔ القصہ فوج بادشاہی اور تماشائیوں کا ایسا اژدہام کہ بیان میں نہیں سماتا، سننے میں آیا کہ اس جلوس میں میمنت مانوس میں ڈیڑھ کروڑ روپیہ صرف ہُوا۔ ہر طرح کی چیزیں اور اسباب عجیب و غریب وہاں تھے نہیں معلوم بایں افراط کہاں سے ہاتھ آئے ہر پری زاد فرنگ کے خوشی سے راہ میں آتے جاتے ہر ادا سے اعجاز مسیحائی دکھاتے، مرد، رنڈیاں پہلو بہ پہلو جیسے جنت میں حور و غلماں نمودار، دوکان نانبائیوں کی نعمتوں سے بھری، فریفتہ ہُوا جس کی نظر اس پر پڑی۔ لوگوں کی بول چال و دیدار حسن و جمال مجھ کو خواب خیال معلوم ہوتا ورنہ بیداری میں ایسی کیفیت دیکھنا محال تھی۔ فی الواقعی جو دیکھا خیال ہی تھا کہ اب اس کا دیکھنا میسر نہیں آتا بلکہ جس سے وہ حال کہتا ہوں اعتبار نہیں کرتا اگر اپنی آنکھوں سے دیکھے تو مانے''۔ (عجائبات فرنگ صفحہ نمبر 40-139 بحوالہ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ ص 99)

انگلستان کے حسن پر کمبل پوش کچھ زیادہ ہی فریفتہ تھے اور اسی لیے حسن و جمال سے متعلق اور جسم فروشی یا ان کی خریداری کے بارے میں مختلف باتیں لکھی ہیں مگر اس کے ساتھ ہی کمبل پوش کے دل دردمند کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں کہ کاش اگر میں قدرت رکھتا تو ان ساری لڑکیوں کو رہا کر دیتا اور خرید کر آزاد کر دیتا لیکن اس سب کے باوجود وہ اس قدر حسن و جمال میں محو ہو گئے تھے کہ پردے کہ بارے میں بھی ان کے خیالات کچھ ٹھیک نہیں تھے اور وہ حجاب کو نامناسب خیال کرتے اور ساتھ ہی ساتھ انگریزوں کی جنسی بے راہ روی پر بھی افسوس کا اظہار کیا ہے تاہم یوسف خان کمبل پوش کی علمیت، ادبیت اور مشاہدے کی گہرائی و گیرائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک اردو کے پہلے سفرنامہ کا تعلق ہے اس بارے میں بیشتر محققین کی رائے یہی ہے کہ یوسف خان کمبل پوش کا سفرنامہ عجائبات فرنگ یا تاریخ یوسفی ہی ہے۔ یوسف خان کمبل پوش نے 1828 میں یہ سفر ضرور کیا

عجائبات فرنگ 'کی صرف یہی ایک خوبی نہیں کہ وہ اردو کا پہلا سفر نامہ ہے۔پہلا سفر نامہ ہونا تو اس کی تاریخی خصوصیت ہے ورنہ اگر اسے پہلا سفر نامہ ہونے کا شرف حاصل نہ ہوتا اور یہ کسی اور نمبر پر رہتا تو زبان و بیان کی بے باکی، بے ساختگی، وارفتگی اور حقیقت نگاری کی وجہ سے اس کی شہرت اور اہمیت میں کوئی فرق نہ آتا۔بلا شبہ اس کی شہرت اتنی ہی ہوتی جتنی آج ہے۔

ہے مگر یہ 1847 میں پنڈت دھرم نرائن کے زیر اہتمام دہلی کالج کے مطبع العلوم سے شائع ہُوا ہے۔اس کے صفحات 297 ہیں 1873 میں مطبع منشی نول کشور نے اسے عجائباتِ فرنگ کے نام سے شائع کیا تھا پھر اسی مطبع نے 1898 میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع کیا ہے۔

مرزا حامد بیگ کا خیال ہے کہ اُردو کا پہلا سفر نامہ یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی کا 'عجائبات فرنگ' نہیں ہے بلکہ سید فدا حسین کا سفر نامہ 'تاریخ افغانستان' ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے دونوں کے زمانۂ تصنیف وطباعت سے بحث کرتے ہوئے دلیل فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں سعید احمد نے دوٹوک انداز میں یوں لکھا ہے:

''مرزا حامد بیگ نے سید فدا حسین کا سفر نامہ 'تاریخ افغانستان' کو اردو کا اولین سفر نامہ مانا ہے حالانکہ اب تک جتنی تحقیق اردو سفر نامے کے حوالے سے ہوئی ہے ان میں اکثر محققوں نے یوسف خان کمبل پوش کو اُردو کا اولین سفر نامہ نگار تسلیم کیا ہے۔یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی کا سفر نامہ تاریخ یوسفی کے نام سے بھی 1847 شائع ہوا فنی اعتبار سے ایک اچھا سفر نامہ ہے۔فدا حسین کا سفر نامہ 'تاریخ افغانستان' میں سفر نامے کے فنی لوازم موجود نہیں ہیں۔انھوں نے اس سفر نامے میں ایک جنگی داستان کو قلم بند کیا ہے۔یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامے کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔''

(آزادی کے بعد اردو سفر نامہ ص 51)

اسی طرح خالد محمود نے 'عجائبات فرنگ' کے سلسلہ میں بجا طور پر یوں کہا ہے:

''عجائبات فرنگ' کی صرف یہی ایک خوبی نہیں کہ وہ اردو کا پہلا سفر نامہ ہے۔پہلا سفر نامہ ہونا تو اس کی تاریخی خصوصیت ہے ورنہ اگر اسے پہلا سفر نامہ ہونے کا شرف حاصل نہ ہوتا اور یہ کسی اور نمبر پر رہتا تو زبان و بیان کی بے باکی، بے ساختگی، وارفتگی اور حقیقت نگاری کی وجہ سے اس کی شہرت اور اہمیت میں کوئی فرق نہ آتا۔ بلا شبہ اس کی شہرت اتنی ہی ہوتی جتنی آج ہے۔''

(اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ ص 95)

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی کے سفر نامہ 'عجائبات فرنگ' میں جو تحریری اسلوبی اور زبان و بیان کی خوبیاں ہیں وہ اضافی ہیں جبکہ تاریخی اعتبار سے بھی اسی کو تقدم حاصل ہے اسی لیے بلا شبہ اُردو کا پہلا سفر نامہ یہی ہے مگر ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے اپنی کتاب 'اردو سفر نامے انیسویں صدی میں' میں نادر کی مثنوی نادر کو اردو کا پہلا سفر نامہ قرار دیا ہے جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

''مثنوی نادر اردو سفر ناموں میں دو اعتبار سے بے حد اہم ہے اول یہ کہ یہ اردو کا پہلا سفر نامہ ہے اب تک جتنے سفر نامے دستیاب ہوئے ہیں ان میں تاریخی اعتبار سے قدیم ترین بھی ہے۔اس کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ یہ منظوم سفر نامہ ہے۔عام طور پر جتنے سفر نامے لکھے گئے ہیں وہ نثر میں ہیں لیکن یہ سفر نامہ مثنوی کی شکل میں لکھا گیا ہے اور مثنوی نادر کے نام سے مشہور ہے یہ سفر نامہ اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی کی کتاب 'تین مسافر' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر نامہ ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد کے کتب خانہ میں موجود تھا۔کتب خانہ کو یہ نسخہ ڈاکٹر نصیرالدین ہاشمی نے عطیہ کے طور پر دیا تھا مخطوطہ کے پہلے صفحہ پر ہاشمی صاحب کے دستخط کے ساتھ تحفہ بہ کتب خانہ ادارۂ ادبیہ تحریر ہے (آگے ہے) لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ نسخہ اب وہاں نہیں ہے ادارہ سے معلومات حاصل کرنے پر جواب ملا کہ یہ نسخہ اب وہاں نہیں ہے۔''

(اردو سفر نامے انیسویں صدی میں ص 259)

ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے جس مثنوئی نادر کو اردو کا پہلا سفر نامہ قرار دینے کی بات کی ہے وہ شاعر نادر کی ہے جس نے 1257ھ اس مثنوی کا مرتب کیا۔ دراصل نواب اعظم جاہ والیِ ارکاٹ کا سفر نامہ ہے جسے نادر نے مثنوی کے انداز میں منظوم کیا ہے۔نواب اعظم جاہ نے مدراس سے ناگور شریف کا سفر درگاہ قادر ولی کی زیارت کے لیے کیا تھا جو حضرت عبدالقادر گنج سواتی (المتوفی 972ھ) کی درگاہ ہے اس سفر کو اور اس کے حالات وتاثرات کو نادر شاعر نے منظوم کیا اور یہ سفر 1228ھ میں کیا گیا تھا اور اسی سال 1823 میں نادر نے یہ مثنوی مکمل کی ہے۔ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے اس مثنوی کے اشعار کے حوالے سے اپنی کتاب 'اردو سفرنامے۔انیسویں صدی میں' میں کافی معلومات بہم پہنچائی ہیں اور اس پر عمدہ طریقے سے لکھا ہے اور نتیجہ خیز انداز میں ایک جگہ یوں لکھا ہے:

''یہ مثنوی نادر کا وہ کارنامہ ہے جس کا شمار انیسویں صدی کے اہم سفر ناموں میں کیا جاسکتا ہے نہ صرف اہم بلکہ اسے انیسویں صدی کے اولین سفر نامے کا شرف بھی دیا جاسکتا ہے کیوں کہ یہ سفر نامہ 1823 کا ہے اور اس سے قبل ہمیں نہ تو نظم میں ہی انیسویں صدی کا کوئی سفر نامہ ملتا ہے اور نہ ہی نثر میں اس طرح نظم کی حیثیت سے بھی اس سفر نامہ کی بڑی اہمیت ہے۔''

(اردو سفر نامے۔انیسویں صدی میں ص 268)

اس اقتباس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر قدسیہ قریشی کی وضاحت کے مطابق اُسے 1823 کا سفر نامہ ہونے کی وجہ سے اولین سفر نامہ کا درجہ دیا جانا چاہیے یہ بات حقائق کی روشنی میں بالکل درست ہے مگر دونوں میں تطبیق یوں دی جاسکتی ہے کہ یوسف خان کمبل پوش کا سفر

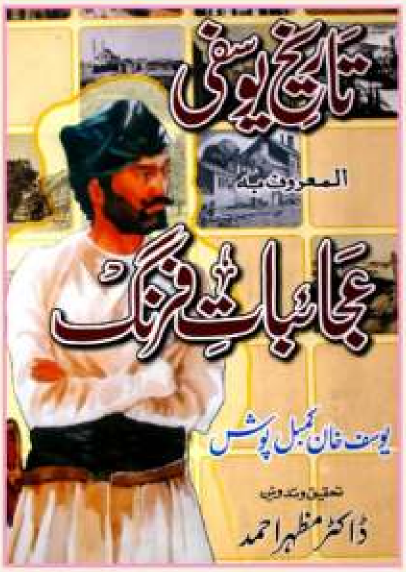

نامہ عجائبات فرنگ نثری ہونے کے اعتبار سے اولیت کا درجہ رکھتا ہے جو 1828 کے سفر کی یادگار ہے اور یہ مثنوی نادر منظوم سفر نامہ ہونے میں اولیت کا استحقاق رکھتی ہے جو 1823 میں مکمل کی گئی ہے۔اس طرح تقدم اور منظوم ہونا دونوں اس کی خصوصیتیں ٹھہریں جبکہ نثر میں سفر نامہ ہونے کا اعجاز اولیت کے اعتبار سے بہر صورت یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی کے سفر نامہ 'عجائبات فرنگ' ہی کو حاصل ہے۔

■

Md. Ishtiyaque Ahmed Shakir
Vill-Lachhanpur, P.o-Bochgoan, Kasba
Distt-Purnea-854330 (Bihar)
Mob-9182165095

اردو شاعری میں رام

محمد ذاکر حسین

زبان کو مذہب کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مذہب کے فروغ میں زبان کی حیثیت میل کے اس پتھر کی ہوتی ہے جس کے بغیر میل کا تصور عبث ہے۔ ''اردو ہندوستان کی سب سے سکیولر زبان ہے'' یعنی یہ کسی خاص مذہب، دھرم، مسلک، فرقہ، طبقہ، جماعت، ٹولی، پارٹی یا گروہ کی زبان نہیں۔ وسیع النظری، کشادہ دلی، رواداری، انسان دوستی، جذباتی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور پاس جذبات وغیرہ جیسے محاسن عالیہ اس زبان کی گھٹی میں پڑی ہیں۔ اس کی نشو ونما میں جتنا مسلمانوں نے حصہ لیا اتنا ہی ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں نے۔

اس زبان نے جہاں مذہب اسلام کے فروغ میں حصہ لیا وہیں ہندو، سکھ، عیسائی، بودھ اور جین مذہب کو بھی سیرابی عطا کی۔ ڈاکٹر محمد عزیر کی تصنیف 'اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ' نیز ڈاکٹر اَجے مالویہ کی تصانیف 'اردو میں ہندو دھرم' اور 'ویدک ادب میں اردو' اس پر دال ہیں۔ اس زبان نے جہاں پیروں، فقیروں، شہیدوں، پیغمبروں اور خدائے تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا وہیں گرونانک، کرشن جی، رام جی، مہادیو جی، درگا جی اور حضرت مسیح کی مدح سرائی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

بات اگر رامائن کی کریں تو اردو زبان میں رامائن کے کل 131 نسخے دستیاب ہوئے ہیں جن میں 46 منظوم، 6 باتصویر، 2 ناول کی طرز میں اور 5 ڈرامے کی طرز میں ہیں۔[1] ان میں سے بعض نسخے دس-دس جلدوں پر مشتمل ہیں اور کسی کسی کا ساتواں ایڈیشن دستیاب ہوا ہے۔ رامائن کے 131 نسخوں میں سے 97 نسخے صرف خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر محمد عزیر نے 'خطبات گارساں دتاسی' صفحہ: 513 کے حوالے سے لکھا ہے کہ رامائن کا پہلا اردو ترجمہ 1866 میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔[2] لیکن یہ نسخہ مفقود ہے۔ 1034 صفحات پر مشتمل مکمل 'رامائن بالمیکی' کا پہلا اردو ترجمہ 1921 میں کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس، لاہور سے شائع ہوا تھا، جس پر مترجم کے طور پر ڈوارکا پرشاد افق لکھنوی کا نام درج ہے۔ اسی طرح بھگوت گیتا کے 128 نسخے دریافت کیے گئے جن میں 53 نسخے؛ صرف خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہیں۔ بہر حال مجھے یہاں مذاہب اور مذہبی کتابوں کے فروغ میں اردو کی خدمات کا جائزہ نہیں لینا ہے بلکہ اردو شاعری میں رام کے تصور پر غور کرنا ہے۔ آیئے ہم اس سمت بڑھتے ہیں۔

بھگتی تحریک کے سب سے بڑے شاعر کبیر (متوفی 1518) کے نزدیک مختلف دھرم، مذہب، ذات پات کے درمیان نفرت کے بیج بونا گناہ عظیم ہے۔ وہ ایک خدا کے ماننے والے تھے۔ ان کے نزدیک خدائے تعالیٰ کی کوئی شکل وصورت نہیں، محبت، پیار اور اخلاص کے ذریعے خدائے تعالیٰ کا عرفان حاصل کیا جاسکتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی، اخلاق کی تبلیغ، رواداری کی تلقین کبیر کی شاعری کے غالب موضوعات ہیں۔ کبیر کی شاعری میں بھی رام کا تذکرہ ملتا ہے لیکن رام سے ان کی مراد ایودھیا کا راجہ، سیتا کا شوہر اور راجہ دشرتھ کا بیٹا نہیں بلکہ رحیم یا خدائے تعالیٰ کا ہندوی نام ہے۔ وہ اسی کی پرستش کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ جب سب کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے تو اتنے سارے معبود کیسے ہو سکتے ہیں؟[3] اس لیے رام اور رحیم دونوں ایک ہی ہیں، دنیا میں لوگ اپنے پالن ہار کو اپنی اپنی زبان میں پکارتے ہیں کوئی اسے رحیم کہتا ہے؛ کوئی ہری، کوئی کریم کہتا ہے؛ کوئی کیشو، کوئی اللہ کہتا ہے تو کوئی رام۔ گویا ہندو اور مسلمانوں کی راہ ایک ہی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہندو ترک کی ایک راہ، ہے ست گرو اہے بتائی
کہی ہے کبیر سنو ہو سنتو، رام نہ کہے اور کھدائی
دوئی جگدیش کہاں تے آئے، کہو کون بھرمایا
اللہ رام کریم کیشو، ہری حضرت نام دھرایا
ست نام کڑوا لگے، میٹھا لاگے دام
دُبدھا میں دونوں گئے، مایا ملی نہ رام

تیسرے شعر میں کہتے ہیں کہ سچ کڑوا ہوتا ہے لیکن دام؛ بمعنی فریب میٹھا لگتا ہے۔ لیکن اسی تردّد میں رہ گئے تو نہ مایا مل سکتی ہے اور نہ رام۔ یہاں کبیر نے رام کو منزل مقصود قرار دیا ہے اور یہ منزل مقصود کبیر کے نزدیک صرف خدائے تعالیٰ کی ذات ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ کبیر کے یہاں رام؛ خدائے تعالیٰ کا ہندوی نام ہے۔

نظیر اکبر آبادی (1735- 16 اگست 1830) نے اپنی شاعری میں ہندوستان کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو، یہاں کے پھولوں کی بھینی بھینی مہک، میلوں ٹھیلوں کی گرم بازاری، بازار کی ہما ہمی، یہاں کے موسم، عقائد، توہمات، ہندو اساطیر کے ذخیرہ کرنے والے رسم ورواج اور صنمیات کو خوب خوب برتا ہے۔ ان کی شاعری میں اگر صرف ہندو دیویوں کی بات کریں تو پاروتی، درگا، کالی، دیوکی، جسودا اور رادھا وغیرہ؛ دیوتاؤں میں اندر، برہما، بلدیو، شیو، مہادیو، شیوشنکر، کال بھیرو، گنیش، کرشن، گردھاری، مراری، مرلی دھر، سنکھ جوڑ، شیام، نارائن، نارد منی، نرسنگھ، نرسی مہتا، بسدیو، بشن، اورنند وغیرہ؛ اساطیر سے مثبت کرداروں میں ارجن، سکھ دیو اور ہنومان وغیرہ؛ منفی کرداروں میں بکا سر، بھوما سر، راون اور کنس وغیرہ کا تذکرہ اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ نظیر کی شاعری میں ہندو اساطیر اس کثرت کے ساتھ برتے گئے ہیں کہ جس کی مثال شاید ہندی شاعری میں بھی کم ملتی ہے۔ اس لحاظ سے نظیر ایک بے نظیر شاعر ہیں۔ نظیر کے محبوب صنمیات مہادیو، کرشن اور بلدیو جی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں رام سے متعلق اشعار نسبتاً کم ملتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ نظیر کے یہاں رام کا تذکرہ ضمناً ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو

ہے کہیں رام کہیں لچھمن
کہیں کچھ مچھ ہے اور کہیں راون[4]

چکبست لکھنوی (19 جنوری 1882 - 12 فروری 1926) کی 22 بندوں پر مشتمل نظم 'رامائن کا ایک سین' (مسدس) ہے۔ جو رام چندر جی کا اپنی ماں کوشلیہ سے الوداعی ملاقات کے بیان پر مشتمل ہے۔ رام بن باس کے لیے وداع ہو رہے ہیں، وہ اپنے والد کو سلام رخصت تو کر لیتے ہیں لیکن اپنی ماں کے الوداعی دیدار سے پہلے یہ سوچ کر جھجک جاتے ہیں کہ

دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

اور ذرا ٹھہر کر دامن سے اپنے آنسو پوچھتے ہوئے چہرے سے افسردگی اور بے کسی کو دور کرتے ہیں۔ یہاں چکبست نے انسانی نفسیات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ بیٹا جو تخت وتاج

> کبیر کی شاعری میں بھی رام کا تذکرہ ملتا ہے لیکن رام سے ان کی مراد ایودھیا کا راجہ، سیتا کا شوہر اور راجہ دشرتھ کا بیٹا نہیں بلکہ رحیم یا خدائے تعالیٰ کا ہندوی نام ہے۔ وہ اسی کی پرستش کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ جب سب کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے تو اتنے سارے معبود کیسے ہو سکتے ہیں؟[3] اس لیے رام اور رحیم دونوں ایک ہی ہیں۔ دنیا میں لوگ اپنے پالن ہار کو اپنی اپنی زبان میں پکارتے ہیں کوئی اسے رحیم کہتا ہے؛ کوئی ہری، کوئی کریم کہتا ہے؛ کوئی کیشو، کوئی اللہ کہتا ہے تو کوئی رام۔ گویا ہندو اور مسلمانوں کی راہ ایک ہی ہے۔

کو چھوڑ کر جنگل کی خاک چھاننے جا رہا ہے اس کے دل میں کتنا درد اور کسک ہوگا لیکن یہ درد و کسک ایک ماں کے درد و کسک کے آگے کیا حیثیت رکھتی ہے؟ جس کا بڑا بیٹا اس سے جدا ہو رہا ہے۔ جسے راج سنگھاسن پر بیٹھنا تھا وہ آج بر سر بن باس ہے۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہ وفا کی منزل اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا اہتمام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی[5]

علامہ اقبال (9 نومبر 1877- 21 اپریل 1938) کو اگرچہ اختر حسین رائے پوری نے فاشسٹ شاعر لکھا ہے لیکن جب آپ 'کلیات اقبال' کا مطالعہ کریں گے تو آپ رائے پوری صاحب کی رائے کو پوری طرح قبول کرنے سے محترز ہو جائیں گے۔ 'کلیات اقبال' میں جہاں طلوع اسلام، مسجد قرطبہ، اے روح محمدؐ، جبریل و ابلیس، شکوہ، جواب شکوہ، ذوق وشوق، آدم اور اذان وغیرہ جیسی خالص اسلامی رنگ کی نظمیں ملتی ہیں؛ وہیں گرو نانک، رام اور سوامی رام تیرتھ جیسی نظمیں بھی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ ان کے کلیات میں 'گائیتری منتر' کا منظوم ترجمہ 'آفتاب' بھی ہے۔ علامہ اقبال نے رام جی کی شجاعت، بہادری، تلوار بازی کی مہارت، رعایا سے محبت، جنگی جوش اور نفس کی پاکیزگی کا

اعتراف کرتے ہوئے ان کی بارگاہ میں عقیدت کا خراج یوں پیش کیا ہے۔

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند[6]

نفیس خلیلی نے 21 بند یعنی 126 اشعار پر مشتمل نظم 'سویمبر' میں رام چندر جی کے رسم سوئم ور کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ جس میں سیتا کی خوبصورتی، ان کی دید سے رام کے دلی جذبات کی اتھل پتھل، راجہ جنک کا شیو جی کی کمان کو توڑنے کا چیلنج دینا اور بدلے میں سیتا سے شادی کا وعدہ کرنا، راجہ جنک کے اعلان کے بعد مختلف حکمرانوں کا کمان توڑنے کی کوشش کرنا اور پسپا ہونا، حتی کہ راون کا بھی نامراد لوٹنا اور سارے حکمرانوں کی ناکامی کے بعد راجہ جنک کا یہ کہنا کہ:

تم میں کوئی رانا نہیں | تم میں کوئی راجہ نہیں
تم مرد یا نا مرد ہو | تم کارواں کے گرد ہو
سب راج کل کے ننگ ہو | ان آئینوں کے زنگ ہو[7]

راجہ جنک کی للکار سن؛ شری رام چندر کا مرتعش ہونا، اہل محفل پر ایک نظر ڈال کر؛ تیر و کماں کو ہاتھ میں لینا اور ایک ہی جھٹکے میں اس کے پرخچے اڑا دینا۔

دس بیس ٹکڑے ہو گئے | کچھ اُڑ گئے کچھ کھو گئے
بے حد خوشی دل کو ہوئی | سب بول اٹھے جے رام کی[7]

اتنے میں پرشو رام کا آدھمکنا اور شیو جی کی کمان کے ٹکڑے دیکھ کر لال پیلے ہو جانا اور اپنی کمان توڑنے کا چیلنج دینا بعدہٗ بذریعہ رام اس کی کمان بھی ایک جھٹکے میں ٹوٹنا۔ راجہ جنک کا یہ ماجرا دیکھ کر سیتا کی رام سے، اُرملا کی لکشمن سے، مانڈوی کی بھرت سے اور لیرلی کی شتروگھن سے شادی کر دینا وغیرہ تمام واقعے کو بڑی تفصیل اور خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ نفیس خلیلی نے ایک ایک جزئیات کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کیا۔ اس نظم میں بھی مرثیے کی چھاپ دکھائی دیتی ہے اور بحر بھی وہی استعمال کی گئی ہے جو مرثیہ کے لیے مختص ہے یعنی بحر رجز جس کا رکن ہے مستفعلن۔

برج موہن دتاتریا کیفی (13 دسمبر 1866- 1 نومبر 1955) نے رام اور رام بھگتی سے متعلق 6 اپریل 1913 کو 27 بندوں پر مشتمل نظم 'رام بھگتی کی مہما' لکھی جو مسدس کی شکل میں ہے۔ رام، لکشمن اور سیتا جنگلی رہائش کے لیے نکلے ہیں۔ گرمی کا موسم ہے، دور دور تک پانی نہیں ہے اور سورج کی تپش اس سے سوا۔ سیتا غش کھا کر گر جاتی ہیں، لکشمن پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر دوڑتے ہیں۔ ادھر رام کی نظر بے ہوش سیوری (سبری) پر پڑتی ہے۔

پھر رام اسے اور سیتا کو اپنے زانوں پر رکھ لیتے ہیں اور رام کے آنسو دونوں (سیوری اور سیتا) کے رخسار پر گرتے ہیں اور دونوں بھلی چنگی ہو جاتی ہیں۔ جب لکشمن آتے ہیں تو رام ان سے کہتے ہیں۔

کون و مکاں کا گرچہ شہنشاہ رام ہے
سچے بھگت کا اپنے وہ لیکن غلام ہے[8]

اس نظم کو آپ کربلائی مرثیہ کے بہت قریب پائیں گے۔ پورا منظر گویا کربلا کی تپتی ریت کو مدنظر رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ ایک منظر ملاحظہ کریں ۔

پانی کا دور دور نہیں تھا وہاں نشاں
گرمی کی اور تپش کی وہ شدّت کہ الاماں
بھٹی کی طرح تپتے زمیں اور آسماں
پر طائر نگاہ کے بھی جلتے تھے وہاں
ہر ذرّے میں تپش تھی وہاں آفتاب کی
فوارے تھے بگولوں کے، نہریں سراب کی

آگے کے دو مصرعے دیکھیں۔

گرمی سے اس کی آتش نمرود سرد تھی
لُو کی بھبک سے بادِ جہنم بھی گرد تھی[9]

دبستان داغ کا توانا شاعر، منشی سکھ دیو پرشاد سنہا المعروف بہ بسمل الہ آبادی (11 نومبر 1899 - 23 نومبر 1975) نے اپنی نظم 'دیش بھارت میں، پھر آجائے زمانہ رام کا' میں ان لوگوں کی قسمت پر رشک کیا ہے جنہوں نے رام چندر کو اپنے چشم شوق سے دیکھا ہے۔ محض 14 مصرعوں میں بسمل نے وی بھیشن اور رام کی دوستی اور فتح یابی کے بعد اسے لنکا سونپنا اور دیگر اہم واقعات بلکہ رامائن کا پورا پلاٹ سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہو۔

وہ گھڑی وہ دن وہ ساعت وہ زمانہ رام کا
چار لفظوں میں کہیں کیونکر فسانہ رام کا
ہو جو بزدل خلق میں لازم ہے لیں اس سے سبق
درسِ غیرت ہے زمانے کو فسانہ رام کا[10]

مذکورہ نظم غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ لہٰذا غزل کے 'دریا کو کوزے میں سمونے' والی خصوصیت اس نظم میں بھی در آئی ہے۔ ان سات اشعار میں بسمل نے پند و نصیحت اور دعا سے بھی کام لیا ہے۔

شاعر انقلاب شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی (5 دسمبر 1898 - 22 فروری 1982) نظم 'پیمانِ محکم' میں جہاں غازیانِ جنگ کے کر وفر، بابِ خیبر شکن کے قوت و بل، اہل کربلا کی پیاس، شہداء کی جاں نثاری، نورِ رسالت کی چمک، ازجُن کی چٹکی سے چلنے والے تیروں کی سنسناہٹ، زمزموں پر فوج کی رخصت، تیر و کمان کی

کبیر کے یہاں رام خدائے تعالیٰ کا ہندوی نام ہے تو نظیر کے یہاں ضمنی کردار۔ چکبست نے رام کے رخصتِ بن باس کا نقشہ کھینچا ہے تو علامہ اقبال نے ان کی شجاعت، پاکیزگی نفس اور رعایا سے ان کی محبت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں امام ہند کہا۔ نفیس خلیلی نے ان کے سوئمبر کو موضوع بنایا تو پنڈت کیفی نے انہیں کون و مکاں کا شہنشاہ قرار دیا۔ بسمل الہ آبادی نے رام کی غیرت و حمیت کی تعریف کی ہے تو جوش نے ان کی قوت بازو کی قسم کھائی۔ میلا رام وفا نے ان کے محبین کے قدموں کو چومنے کی چاہت کا اظہار کیا ہے۔ الغرض اردو شاعری میں رام ایک متنوع کردار کی حیثیت سے برتے گئے ہیں۔

کڑک، توپوں کی گھن گرج اور زرہوں کی کھڑکھڑاہٹ وغیرہ کی قسم کھائی ہے وہیں شری رام چندر کی اس قوت کا بھی حلف اٹھایا ہے جس کے ذریعے انھوں نے راون کی لنکا کو خاکستر کر، فتح یابی حاصل کی تھی۔ شعر ملاحظہ کریں:

قسم ان قوتوں کی جو ملیں تھی رام و چھمن کو
قسم اس آگ کی، جو کھا گئی تھی ملکِ راون کو[11]

ماہر عروض، شاعر اور ناول نویس پنڈت میلا رام وفا (30 جنوری 1895 - 19 ستمبر 1990)؛ شری رام چندر کی محبت میں گویا غرقاب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان اپنی قسمت پر جتنا چاہے فخر کرے کہ اس کی دھرتی پر رام پیدا ہوئے۔ تاریخ میں یہ سعادت کسی اور دھرتی کو نصیب نہ ہوئی۔ یہی نہیں؛ وہ ان لوگوں کے قدموں کو بھی فرطِ محبت میں چوم لینا چاہتے ہیں جن کے دلوں میں رام کی محبت ہے۔ وہ رام کو خدائی صفات کے حامل قرار دے کر، تمام نوع بشر پر رام کی عبادت لازم قرار دیتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

زیبا ہے جتنا فخر کرے سر زمینِ ہند
حصہ فقط اسی کا ولادت ہے رام کی
جی چاہتا ہے ان کے قدم چوم لیجیے
جن کے دلوں پہ نقش ارادت ہے رام کی[12]

المختصر اردو شاعری میں ہندو اساطیر اور دیومالا کا استعمال شروع سے ہوتا رہا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اردو شاعری میں ہندوؤں کی مذہبی کتابیں ہوں یا مذہبی پیشوا سب پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ بلکہ بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اردو شاعری کی محبوب شعری علامت کا درجہ حاصل کر لیا ہے، جن میں کرشن جی کا نام سرفہرست ہے۔ محولہ بالا تمام اشعار کے مطالعے سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اردو شاعری میں رام کے خطوط کتنے واضح ہیں۔ یہ صرف چند نمونے ہیں۔ اس پر اگر پوری سنجیدگی سے توجہ دی جائے تو کئی دفاتر تیار ہو سکتے ہیں۔

الحاصل کبیر کے یہاں رام خدائے تعالیٰ کا ہندوی نام ہے تو نظیر کے یہاں ضمنی کردار۔ چکبست نے رام کے رخصتِ بن باس کا نقشہ کھینچا ہے تو علامہ اقبال نے ان کی شجاعت، پاکیزگی نفس اور رعایا سے ان کی محبت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں امام ہند کہا۔ نفیس خلیلی نے ان کے سوئمبر کو موضوع بنایا تو پنڈت کیفی نے انہیں کون و مکاں کا شہنشاہ قرار دیا۔ بسمل الہ آبادی نے رام کی غیرت و حمیت کی تعریف کی ہے تو جوش نے ان کی قوتِ بازو کی قسم کھائی۔ میلا رام وفا نے ان کے محبین کے قدموں کو چومنے کی چاہت کا اظہار کیا ہے۔ الغرض اردو شاعری میں رام ایک متنوع کردار کی حیثیت سے برتے گئے ہیں۔

حوالہ جات

1. 'عالمی اردو ادب'، دہلی کا 'دھارمک نمبر' مئی 2012، ص 75-173
2. 'اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ': ڈاکٹر محمد عزیر، ص 95، انجمن ترقی اردو علی گڑھ 1955
3. 'تاریخ ادب اردو': جمیل جالبی، جلد اول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 2015
4. 'کلیات نظیر اکبر آبادی' نظم: 'بلدیو جی کا میلا'، ص 434، کتابی دنیا، دہلی، 2003
5. 'صبح وطن' از: چکبست لکھنوی، ص: 123-118، نامی پریس، لکھنؤ، دسمبر 1985
6. 'کلیات اقبال' ص 146، فرید بک ڈپو، دہلی 2012
7. 'عالمی اردو ادب'، دہلی کا 'دھارمک نمبر' مئی 2012، ص 233
8. 'واردات' از: پنڈت کیفی، ص: 243، میسرز رام لال سوری اینڈ سنز، لاہور، 1941
9. ایضاً، ص 240
10. 'عالمی اردو ادب'، دہلی کا 'دھارمک نمبر' مئی 2012، ص 228
11. 'کلیات جوش' نظم 'پیمان محکم' ص 479، قومی کونسل، دہلی، 2013
12. ماہنامہ 'نیرنگ خیال' لاہور، کا 'رامائن نمبر'، اکتوبر-نومبر 1928 بحوالہ: دھارمک نمبر
13. 'کیفیات' (کلیات کیفی اعظمی)، ص 421، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2004

■

MD. ZAKIR HUSSAIN
Razvi Store, Qabristan Road, Khirgaon
Hazaribagh-825301(Jharkhand)
Email: zrazvi@rediffmail[dot]com
Mob No: 09955171661

رابعہ خاتون

شفق کا تخلیقی جہان

بہار میں اردو افسانے کی ایک عظیم روایت ہے۔ ناول ہو یا افسانہ، یہاں کے فکشن نگاروں نے ہر عہد اور بدلتے ہوئے حالات کے تحت کئی شاہکار تخلیقات اردو ادب کو دی ہیں۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی، علمی و ادبی تحریکات، ملک کی آزادی، تقسیم وطن، فرقہ وارانہ فسادات اور ان تمام معاملات و موضوعات کو قلم بند کیا ہے جو اس عہد کے مطالبات میں شامل تھے۔ یہ کہنا کسی طور غلط نہیں ہوگا کہ اردو کی افسانوی روایت میں صوبۂ بہار کا کردار نہ صرف قابل ذکر ہے بلکہ ایک خاص اہمیت کا حامل بھی ہے۔ بہار کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اردو کی خواتین ناول نگاروں کی تاریخ میں 'اصلاح النساء' کو اولیت کا مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ بقول سید احمد قادری:

''بہار میں اردو افسانے کی شاندار روایت رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علی محمود کا افسانہ 'چھاؤں' (مطبوعہ مخزن جنوری 1904) اگر صرف ایک ماہ قبل شائع ہو جاتا تو اس وقت بہار کو اردو افسانے کا دوسرا نہیں بلکہ پہلا موجد قرار دیا جاتا۔ اس لیے کہ راشد الخیری اپنے افسانہ 'نصیر اور خدیجہ' کے مخزن، دسمبر 1903 کی اشاعت سے اردو افسانے کے امام تسلیم کیے گئے۔''

یہ ایک علمی، ادبی اور تاریخی صداقت ہے کہ بہار ابتداء ہی سے اردو فکشن کا ایک اہم مرکز و محور رہا ہے یہ اور بات ہے کہ اس جانب تحقیقی و تنقیدی کام ذرا تاخیر سے ہوا۔ بہر کیف اس میں کسی شک و شبہ کی کہیں کوئی گنجائش نہیں کہ صوبۂ بہار ہر اعتبار سے ہر عہد میں علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔

جدید اردو افسانے کی تاریخ میں شفق کی خدمات نہ صرف قابل ذکر ہیں بلکہ ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کا شمار اردو کے اہم فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شفق کے یہاں زندگی اور زمانے کے دکھ درد، انسانی قدروں کی پامالی، حق تلفی و ناانصافی ڈوبتے ابھرتے، ہنستے بولتے انسانوں کی ترجمانی ہم آسانی سے ان کے افسانوں میں تلاش کر سکتے ہیں۔ ان کے یہاں افسانوی زبان و بیان اور برتنے اور سنوارنے کا ہنر بدرجہ اتم موجود ہے۔ انہوں نے افسانوں کے ذریعے سماجی و معاشرتی زندگی کی بھرپور عکاسی کچھ اس طرح سے کی ہے کہ یہ ہمارے اردگرد کی زندگی سے وابستہ و پیوستہ معلوم ہوتے ہیں۔ سماج اور سماجی زندگی سے وابستہ ان کے کردار اکثر و بیشتر افسانوں کے کردار بنتے ہیں۔ کہانی اور قصہ گوئی کے ہنر سے نہ صرف وہ واقف ہیں بلکہ اسے برتنے کا ہنر بھی بخوبی جانتے ہیں۔ پلاٹ و کردار میں استعاراتی و علامتی ماحول کو نہایت ہی خوبصورتی اور چابکدستی کے ساتھ استعمال کچھ اس انداز سے شفق کے یہاں جابہ جا آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے جیسے وہ ہمارے اسی ماحول و معاشرے کے زندہ کردار ہوں۔ افسانے کے لیے جس باریک بینی اور ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے وہ بخوبی اس فن سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ افسانے کس طرح زندگی سے ہمکنار ہوتے ہیں اس کا بھی انہیں بخوبی مشاہدہ ہے۔ میرے خیال میں شفق جدید اردو افسانہ نگاروں کی فہرست میں اپنا ایک الگ ہی مخصوص و منفرد مقام و مرتبہ بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ بقول نامور فکشن نگار حسین الحق:

''مختصر یہ کہ شفق کا فن مسلسل مائل بہ ارتقا رہا اور وسیع تر انسانی صورت حال سے ہم آہنگ بھی۔ ظاہر ہے جس فنکار کا فن مسلسل بہ ارتقا ہو اور اس کی فکر وسیع تر انسانی صورت حال سے ہم آہنگ ہو اس کے فنی بلوغ اور وسیع تر موضوعاتی افق کو تسلیم نہ کرنا ادبی بے ایمانی کے مترادف ہوگا۔''

سچ یہ ہے کہ غیاث گدی، سریندر پرکاش، بلراج مین را، انور سجاد، خالدہ اصغر، احمد یوسف، کلام حیدری وغیرہ کے بعد اور آس پاس سامنے آنے والے افسانہ نگاروں میں شفق بہت اہمیت اور اعتبار کے حامل تھے اور رہیں گے۔

یوں تو شفق کا افسانوی سفر 1970 سے قبل شروع ہو چکا تھا اور کئی افسانے بھی منظر عام پر آچکے تھے مگر 1970 کے بعد ان کے افسانوں نے ایک نئی کروٹ لی۔ ان کے یہاں اب پورے آب و تاب کے ساتھ افسانہ پوری شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ زبان و بیان پر بے پناہ قدرت اور انسانی نفسیاتی پیچ وخم کو بالکل ہی ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کا انداز سامنے آتا ہے۔ سیاسی و سماجی اور معاشرے کے بدلتے ہوئے رنگ روپ کے پس منظر میں ان کا افسانہ 'دوسرا کفن' سامنے آتا ہے۔ پریم چند نے اپنے شاہکار افسانہ 'کفن' کو جس موڑ و منزل کو پہنچایا وہاں سے شفق کے 'دوسرا کفن' کی شروعات ہوتی ہے۔ گاؤں والوں سے حاصل کفن کے پیسہ کو گھیسو اور مادھو موج مستی اور عیش و مسرت میں کٹا کر بے سدھ پڑ جاتے ہیں اور جب خواب سے بیدار ہوتے ہیں تو بدھیا کی چتا پر کفن اور گاؤں والوں کی لعنت ملامت کا خوف ان دونوں کو ستانے لگتا ہے اور گھر جاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں:

''گاؤں سے کچھ پہلے ایک سوکھا ہوا پیڑ دیکھ کر گھیسو نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا، ہم بھی کتنے مورکھ ہیں کفن کفن کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑی چیز آگ ہے، ہمیں چتا کی کوئی فکر نہیں آخر لکڑی چاہیے کہ نہیں۔''

مادھو نے باپ کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ بڑوں کی بدھی بڑی ہوتی ہے۔ کفن نہیں تو ہم چتا کی لکڑی لے کر گاؤں جائیں گے۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا اچھا رہے گا۔

شفق نے اپنے اس افسانے کے ذریعہ جمہوریت

میں انصاف کے ساتھ ترقی وخوشحالی کا منظر نامہ بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ شفق کے تمام افسانوی مجموعے 'سمٹی ہوئی زمین'، 'سب گزیدہ'، 'شناخت' اور 'وراثت' کے تمام افسانے نہایت خوبصورتی اور دلکش انداز میں لکھے گئے ہیں۔ جدید اسلوب کے ساتھ ساتھ استعارہ، تلمیح اور علامت پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد نور نبی انصاری:

شفق کی خوبی یہ رہی ہے کہ انھوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ فکشن کی تکنیک، اس کے موضوعات اور اسلوب کو برتنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب ہوئے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے نہ صرف یہ کہ قارئین کو بلکہ ناقدین ادب کو بھی متوجہ کرتے ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری، ان کا سماجی سروکار، تہذیب ومعاشرت کا المیہ ان کے خاص موضوعات ہیں۔ اس سلسلے میں خصوصی طور پر ان کا افسانہ 'وراثت'، 'خدا حافظ'، 'بچھڑے بھر زمین' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

ایک ناول نگار کی حیثیت سے بھی شفق کا نام وکام جدید اردو ناول نگاری کی تاریخ میں نہ صرف قابل ذکر ہے بلکہ ایک خاص اہمیت وعظمت کا حامل ہے۔

جدید اردو ناول نگاری میں شفق ایک ایسا نام ابھر کر ہمارے سامنے آیا ہے جسے ہم کسی طور پر فراموش نہیں کر سکتے۔ شفق کے اب تک تین ناول کتابی شکل میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا پہلا ناول 'کانچ کا بازی گر' 1982 میں نکھار پبلی کیشن، مئو ناتھ بھنجن یوپی سے پہلی مرتبہ اور اس کی دوسری اشاعت ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی سے 2010 ہوئی۔ دوسرا ناول 'بادل' کے نام سے کراؤن آفسیٹ پریس، سبزی باغ، پٹنہ سے 2002 میں منظر عام پر آیا اور پھر تیسرا ناول بعنوان 'کابوس' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی سے 2003 میں شائع ہوا۔

شفق کے پہلے ناول 'کانچ کا بازی گر' نے اردو فکشن کی تاریخ میں فتوحات کے نئے جھنڈے گاڑ دیے۔ اس ناول 'کانچ کا بازی گر' نے اردو کے مشہور ومعروف ناقدوں کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ ایک بالکل ہی نیا تجربہ تھا جس نے شفق کو اردو ناول نگاری میں ایک نیا وقار واعتبار بخشا۔ بقول رضوان احمد:

'کانچ کا بازی گر' بندھے ٹکے اصولوں کے تحت نہیں لکھا گیا ہے اس لیے آپ اس کے زمان ومکان کردار اور محل وقوع کا تعین نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے یہ ناول زمان ومکان سے ماورا ہے۔ اسے ماوراء عصر کہا جاسکتا ہے مگر آپ پڑھتے ہیں تو آپ بھی اس کے کردار بن جاتے ہیں۔ سب کو یہی احساس ہوتا ہے کہ یہ اس کی اپنی کہانی ہے .... یہ ہمارے عہد کی المناک داستان ہی نہیں بلکہ ایک قیمتی دستاویز بھی ہے جسے شفق نے ناول کا روپ دے دیا ہے۔ آنے والا مورخ داستان ضرور لکھے گا لیکن شفق کے انداز میں نہیں لکھ سکتا۔ اس میں ہماری راہوں میں آنے والی دشواریوں کا ذکر ہے۔ ہمارے ذہنی کرب اور داخلی مشکلات کا بیان ہے۔ حالانکہ ساری باتیں علامتی انداز میں لکھی گئی ہیں مگر انہیں بھی سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔ ان کی تحریر ترسیل کے المیہ کا شکار نہیں ہوتی بلکہ اسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے یہی بات تو ہم بھی کہنا چاہتے تھے۔''

اس ادبی صداقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ شفق نے اپنے اس ناول 'کانچ کا بازی گر' میں زبان وبیان اسلوب، تکنیک اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کو جس طرح اس میں دکھایا وہ نہ صرف اردو ناول کی جدید تاریخ میں قابل ذکر بلکہ ایک خاص عظمت واہمیت کا حامل بھی ہے۔ ناول کے دونوں مرکزی کردار منا اور بیوی کے علاوہ راجیش وغیرہ معاون کردار کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ڈوبتے اور اُبھرتے ہوئے ان کرداروں کے ذریعہ شفق نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا ہے جو ہمارے معاشرے کے ارد گرد رقص کرتے ہیں۔ بقول مہدی جعفر:

'کانچ کا بازی گر' میں کم سے کم دو تہیں، ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی آسانی سے پہچانی جاسکتی ہیں۔ ایک درونی تہہ جس میں مثلاً منا اور بیوی کی آوازیں بار بار ڈوبتی ابھرتی ہیں اور ایک عوام الناس کی خارجی تہہ جس کے درمیان تنظیم اور سیاست کا رقص آہنی جاری ہے۔ درونی تہہ میں جذباتی رشتوں کی المناک داستان صاف پہچانی جاسکتی ہے۔''

شفق کا دوسرا ناول 'بادل' ہے جسے انھوں نے امن کے نام 'معنون' کیا ہے۔ اس ناول کو بھی ناول نگار نے اس کے اصلی ولغوی اور معنوی کے برعکس علامتی واستعاری انداز میں قلم بند کیا ہے۔ یہ وہ 'بادل' نہیں جو قدرت کے حکم سے برستے اور گرجتے ہیں۔ یہ وہ بادل ہے جو زمین کے خداؤں یعنی سپر پاور کے ظلم وزیادتی، کرب وقہر دکھاتے اور کمزور، مظلوم پر بموں کی برسات کر کے زمین کو لہولہان کر دیتے ہیں۔ ناول کا اصل موضوع 9/11 کے ورلڈ ٹریڈ ٹاور اور پنٹاگن پر کئی جہازوں کے ٹکرانے اور موت کی آغوش میں جاتے ہوئے اور بھاگتے دوڑتے انسانوں کے ارد گرد گھومتا ہے۔ حالانکہ ناول نگار نے مغرب کی عیاری ومکاری اور شاطرانہ چال کو بھرپور سامنے لانے کی کوشش کی ہے مگر بقول حسین الحق:

''اس پورے قصے میں افغانستان فٹ ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ یہ خالد کا کوئی نفسیاتی معاملہ ہو سکتا ہے مگر نعیم، سلمیٰ، رشمی اس پچڑے میں پڑتے دکھائی نہیں دیتے۔''

میرے خیال میں یہ ناول اپنی تمام تر کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود ایک کامیاب ناول ہے۔ اکیسویں صدی کے اس عظیم سانحہ پر اردو میں یہ پہلی کامیاب کاوش ہے۔ میری نگاہ میں شفق کا یہ ناول 'بادل' پڑھنے والوں کا دیر اور دور تک ساتھ دے گا۔ ناول نگار نے اپنے عہد کے ایک نہایت ہی سلگتے ہوئے موضوع کو صفحۂ قرطاس پر اتارنے کی پہلی مرتبہ کوشش کی اور اس کی افادیت واہمیت تاریخی دستاویز کی ہے۔

'کابوس' شفق کا تیسرا اہم ناول ہے جس کے معنی عربی میں ایک مرض جسے انگریزی میں Incubs یا Nightmare سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی عجیب وغریب بیماری ہے جس میں مریض خواب میں ڈرا سہما اور خوف ودہشت کے کرب واضطراب میں مبتلا ہو کر چیخنے اور چلانے لگتا ہے۔ بلکہ در ودیوار سے خود ٹکرانے بھی لگتا ہے۔ یہ ایک بالکل ہی نفسیاتی معاملہ ہے۔ یہ ناول نگار کا آخری ناول ہے۔ شفق نے نہایت ہی ذہانت، بصیرت اور چابکدستی کے ساتھ اپنے اس ناول 'کابوس' کے اس عہد کے ان تمام مرحلوں اور منزلوں سے ہمیں روشناس کرایا ہے جو اب تک ادب کے ذریعہ ہم تک نہیں پہنچا تھا۔ صرف میڈیا کے ذریعہ کچھ مناظر کو اپنے انداز سے پیش کیا تھا۔ ایک حساس تخلیق کار وفنکار کی طرح شفق نے وہی کچھ لکھا جو انہوں نے پڑھا، سنا اور دیکھا تھا۔ بقول سید اشرف:

''مصنف کے اضطراب کا یہ عالم ہے کہ اس نے مکالموں کے سہارے پورا ناول لکھ دیا۔ ماحول سازی کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ یہ اور بات ہے کہ بیشتر مقامات پر تخلیقی آگ نے مکالموں سے ترسیل کا بھی کام لیا ہے اور ماحول سازی کا بھی۔''

بہر کیف جدید اردو ناول کی تاریخ میں شفق کے یہ تینوں ناول 'کانچ کا بازی گر'، 'بادل' اور 'کابوس' کی ادبی وعلمی اہمیت، افادیت، جاذبیت اور تہہ داری آج بھی برقرار ہے اور مستقبل میں بھی ان ناولوں کو اس عہد کے درد وداغ کے حوالے سے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

■

Rabia Khatoon
Research Scholar, Dept Urdu
Magadh University,
Bodhgaya-824234 (Bihar)

اردو کا شہر جلالپور

زائر حسین ثالثی

جلالپور سے متعلق اس مضمون میں زیادہ تر باتیں فیض آباد سٹلمنٹ رپورٹ 1879 مصنف اے ایف ملیٹ (A.F. Malyat) سے اخذ کی گئی ہیں۔

شہر کا تعارف: شہر جلالپور ہندوستان میں اتر پردیش کا ایک مذہبی و ادبی شہر ہے۔ قصبہ جلالپور ضلع امبیڈکر نگر (فیض آباد) کے جنوب مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ فیض آباد سے اس کی دوری 90 کلومیٹر ہے۔ اس آبادی کا حدود اربعہ تقریباً 7 کلومیٹر ہے۔ جلالپور مشہور ندی تمسا (ٹونس ندی) کے داہنے کنارے پر بسا ہے۔ یہ ندی سریو ندی میں ملنے سے پہلے اعظم گڑھ سے گزرتی ہے۔ سطح دریا سے اس شہر کی بلندی 118 میٹر ہے۔ یہ لکھنؤ سے 220 کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ اس کی جغرافیائی حیثیت 25.68 ڈگری اتری جھکاؤ اور 82.62 ڈگری پوربی دیشانتر پر ہے۔ یہاں کا مقامی وقت گرین واچ مین ٹائم سے پانچ گھنٹہ تیس منٹ چھپن سکنڈ (5:30:56) پہلے اور ہندوستانی اسٹینڈرڈ وقت سے چھپن سکنڈ بعد ہے۔

کثافت آبادی: 2001 کی مردم شماری کے لحاظ سے جلالپور کی آبادی 29634 ہے۔ جن میں 551 فیصد مرد اور 49 فیصد عورتیں ہیں۔

تعلیمی لیاقت 69 فیصد ہے جو ملک کے اوسط سے 59.5 فیصد سے زیادہ ہے۔

یہ شہر اکبر پور، بسکھاری، ٹانڈہ، راجے سلطان پور اور اعظم گڑھ کو سڑکوں کے ذریعے جوڑتا ہے۔ یہ شہر ضلع کی ایک تحصیل بھی ہے۔ اور ریلوے اسٹیشن مالی پور ہے۔

حکومتی نظام: یہ قصبہ جلالپور ہی کی تحصیل کے سرہر پور پرگنہ میں پڑتا ہے اور اب امبیڈکر نگر کے ضلع میں آتا ہے لیکن کچھ زمانہ پہلے جب حکومتی محکمے کچھ دوسری طرح کے تھے۔ تو جلالپور قصبہ دوسرے علاقوں سے جڑا تھا 1869 کے پہلے جلالپور ٹانڈہ تحصیل میں تھا کیونکہ تب پرگنہ سرہر پور تحصیل ٹانڈہ کے حدود میں تھا۔ (فیض آباد سٹلمنٹ رپورٹ اے۔ ایف۔ ملیٹ ص 19) بعد میں یہ قصبہ کچھ دنوں تک پرگنہ اکبر پور کے حدود میں تھا۔ انگریزی حکومت کے پہلے جلالپور اودھ کے باہر تھا اور اس کا تعلق اکبر پور یا فیض آباد سے نہ ہو کر جونپور یا الہ آباد سے تھا۔ نوابوں کے عہد میں انتظامی محکمے نظامت اور چکلہ تھے ان کا راج کئی نظامتوں میں بٹا ہوا تھا اور ایک نظامت میں کئی چکلے ہوتے تھے۔ اس وقت جلالپور، سلطانپور نظامت کے چکلہ الدے متو میں پڑتا تھا۔

مغل حکومت کے محکمۂ نظامت میں صوبہ سرکار اور محال تھے تب یہ قصبہ الہ آباد صوبے کے جونپور سرکار کے سرہر پور محال میں آتا تھا۔ مندرجہ بالا تشریحات سے یہ ظاہر ہے کہ برٹش حکومت کے پہلے جلال پور اودھ کے باہر تھا اور اس کا تعلق جنوبی حصے سے تھا۔

تاریخ: جلال پور کی تاریخ عہد وسطی سے آگے نہیں جاتی ابھی اس قصبے کی عمر تقریباً پانچ سو سال ہے۔ جس طرح یہ قصبہ بالکل پچھڑا ہوا ہے ٹھیک اسی طرح پرانے زمانے میں بھی یہ بالکل ہی نظر انداز کیا ہوا تھا کسی سرکار یا جاگیردار نے کبھی صدر مقام نہیں بنایا اور نہ ہی اس کے قریب سے کوئی حملہ آور اور نہ کوئی بڑی فوج گزری اور کسی وطن دوست راجہ نے کبھی اس کی فکر کی انھیں سب وجوہات سے جلالپور کی تاریخ میں کسی طرح کا اتار چڑھاؤ یا کسی طرح کی تحریک نہیں ہے۔

ابتدائی دور: ضلع کے گزیٹیر کے مطابق یہ قصبہ اکبر اعظم جلال الدین کے نام پر بسایا گیا تھا ایسا بھی سمجھا جاتا ہے کہ جس وقت اکبر پور، شہزاد پور، شاہجہانپور، وغیرہ بستیاں بسائی گئیں اسی وقت جلال پور بھی وجود میں آیا۔ اکبر پور کے بارے میں تاریخی حقیقت یہ ہے کہ یہ اکبر اعظم کے ہی حکم سے بسایا گیا تھا اور اس کے بسانے کا شاید یہی مقصد بھی تھا۔

اس علاقے میں سب سے بڑے اہمیت کے حامل ایرانی سردار صوفی بزرگ بن کر آئے۔ جن کا اسم گرامی شاہ مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی تھا۔ وہ فارس میں سبستان کے سمنان کے بادشاہ تھے۔ 1388 میں وہ صوفی بزرگ بن کر ہندوستان آئے اور دلی ہوتے ہوئے بنگال کی اس وقت کی راجدھانی 'پنڈوا' پہنچے اور وہاں کے مشہور صوفی بزرگ علاؤ الحق کے مرید ہوئے اور تصوف میں پوری طرح سے فیضیاب ہوئے۔

پھر انھیں کی اجازت سے جلالپور سے اتر کی جانب کچھوچھہ تشریف لائے اور یہیں پر شاہ مخدوم صاحب نے اپنی خانقاہ کی نبیاد ڈالی۔

شاہ مخدوم اشرف ایک مشہور جوگی کی شہرت سن کر یہاں آئے تھے۔ اس جوگی کا نام اس وقت دور دور تک پھیلا تھا اس کا نام درپن ناتھ تھا وہ کچھوچھہ کے اتر میں جہاں پر شاہ اشرف کا مقبرہ ہے وہیں پر رہتا تھا بعد میں وہ شاہ اشرف کے دست حق پر مسلمان ہو گیا اور ان کے مریدوں میں شامل ہو گیا۔ مسلمان ہونے پر ان کا نام کمال الدین رکھا گیا عام لوگ آج بھی انھیں کمال پنڈت کے نام سے جانتے ہیں۔

شاہ مخدوم اشرف نے اس جگہ کا نام روح آباد رکھا

تھا جسے بعد میں ان کے بھیجے اور وارث حاجی عبدالرزاق نے رسول پور کردیا۔ بعد میں یہ مشترکہ جاگیر اشرف پور کچھوچھہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

جلال پور آباد ہونے کے پہلے علاقے کی یہ حالت تھی کہ بھروں کے پرانے گڑھ برباد ہو چکے تھے۔ مذہب اسلام کا کافی پرچار ہو چکا تھا۔ بُنائی پیشہ جوگی اسلام دھرم قبول کر چکے تھے صدیوں سے ستائے گئے کئی ہندو فرقے اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔ اسلام اب اس علاقے میں سماجی، علمی اور تہذیبی طاقت بن چکا تھا۔ اسلام کی طاقت کا چمکدار ثبوت بن کر جلال پور کی بستی وجود میں آئی۔

جلال پور کی تاریخ کا یہ پہلا دور نوابی عہد حکومت کے ٹھیک پہلے تک چلتا رہا۔ اس دور میں یہ بستی دھیرے دھیرے پھیلتی رہی لیکن اسے کسی طرح کی اہمیت نہیں مل سکی۔

نوابوں کا عهد: منصور علی خاں صفدر جنگ اودھ کی نوابی کے حقیقی حقدار تھے۔ 1708 میں گدی پر بیٹھے۔ ان کے انتقال کے بعد 1754 میں نواب شجاع الدولہ اودھ کی گدی پر بیٹھے۔ اس وقت جلالپور کے دکھن میں ایک بستی تھی جو نہوی علی پور کہلاتی تھی۔ یہاں پر اسی نام کی ایک جاگیر کا صدر مقام تھا وہاں پر ایک چھوٹا قلعہ بھی تھا۔ جہاں مال گزاری وصول کر کے رکھی جاتی تھی 1754 میں نواب شجاع الدولہ نے یہ جاگیر اپنے سالے افتخار الدولہ کو معافی میں دے دیا تھا۔ تب جلال پور موضع نہوی علی پور کی زمین میں ہی پڑتا تھا۔ تب تک جلالپور نام کا بورڈ مال گذاری موضع نہیں تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تب تک جلالپور کی اہمیت بالکل نہیں کے برابر تھی۔ نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں جو 1797 میں گدی پر بیٹھے دوبارہ یہ ریاست ان سے لے لی گئی اور براہ راست حکومت میں ملالی گئی۔ ریاست کے بسنے کے بعد دھیرے دھیرے بستی اجڑنے لگی۔ دیکھ ریکھ نہ ہونے پر قلعہ بھی کھنڈر بن گیا۔ یہاں کے اجڑے ہوئے لوگ جلال پور میں آکر بس گئے۔ نہوی علی پور کا موضع آج اسی جگہ پر تھا جسے نہوی کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ جلال پور کے دکھن میں سینچائی محکمے کے سرکاری ٹیوب ویل کے پاس ہے۔ یہاں پر اب بھی پرانی بستی کے آثار دیکھے جاسکتے ہیں۔

برٹش عهد:۔ یہ دور 1857 سے 1947 تک کا ہے اس پورے عہد میں جلالپور ملک صاحب کے ہی قبضے میں رہا۔ 1769 تک جلالپور پرگنہ اکبر پور میں تھا۔ لیکن اسی وقت جب نیا بندوبست ہوا تو جلالپور کو سرہرپور پرگنہ میں شامل کر دیا گیا۔

برٹش حکومت میں آتے ہی انگریزوں نے یہاں ایک تھانہ ایک ڈاکخانہ اور رجسٹریشن دفتر قائم کیا۔ تعلیم کے معقول انتظام کے لیے انگریزوں نے یہاں ایک مڈل اسکول بھی کھولا۔ تھانہ اور ڈاکخانہ اپنی جگہ پر ہی برقرار ہے لیکن رجسٹریشن آفس اور مڈل اسکول اب نہیں ہیں۔ مڈل اسکول اب اپنی قدیم جگہ پر باقی نہیں رہا۔ اس کو گرا کر وہاں پر رہائشی مکان بنا دیے گئے ہیں۔

ڈاکخانہ کے بغل میں آج جو ڈاک بنگلہ ہے برٹش دور میں رجسٹریشن کا دفتر تھا یہاں ایک رجسٹرار رہتا تھا جو ایک طرح ایجنٹ ہوتا تھا۔ رجسٹرار کی آمدنی رجسٹریشن کے لیے مقررہ کمیشن سے ہوتی تھی جبکہ اسے ایک مقررہ رقم سے کم آمدنی ہوتی تھی تو اسے سرکار سے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کافی رقم دی جاتی تھی۔

برٹش دور میں اسکول دو طرح کے تھے۔ ورنا کیولر اور انگلو ورنا کیولر۔ جلال پور اور اس کے آس پاس کے علاقے کے سبھی اسکول ورنا کیولر طرح کے تھے۔ اس طرح کے پرائمری اسکولوں کے اوپر یہاں کا ورنا کیولر مڈل اسکول تھا۔ اُس وقت اُس اسکول میں ساتویں درجے تک کی تعلیم دی جاتی تھی اور دوسرے مضمونوں کی طرح اس میں عربی، فارسی، سنسکرت، اردو اور ہندی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ انگریزی کی پڑھائی یہاں نہیں ہوتی تھی۔ یہ مڈل اسکول پورے ضلع میں اپنے ڈھنگ کا اکیلا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کی شروعات میں جلال پور میں ایک چھوٹا اسپتال بھی کھولا گیا یہ آج بھی اس علاقے کی خدمت کر رہا ہے۔ اس طرح برٹش دور میں جلال پور کو بہت اہمیت ملی اور یہاں حکومت کے کئی محکمے کھولے گئے۔ اس دور میں جلال پور نے خاص ترقی کر لی تھی۔ بُنائی کی گھریلو صنعت دھیرے دھیرے بہت بڑھ گئی۔ 1879 کی سٹلمنٹ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جلال پور میں تیار مال کہیں باہر نہیں جاتا تھا۔ لیکن بیسویں صدی کے شروع سے ہی یہاں کا مال دور دور تک جانے لگا تھا۔ پورے برٹش دور میں جلال پور ملک ہدایت حسین کے خاندان کے ہی قبضے میں رہا۔

آزادی کی لڑائی: 1857 اور 1942 میں آزادی حاصل کرنے کے لیے دو خاص زبردست پیمانے پر کوشش ہوئی۔ 1857 کے غدر میں جلال پور میں کوئی ہلچل نہیں تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ سمن پور اور بڑا گاؤں میو پور کے تعلقدار انگریزوں کے ہی ساتھ تھے ہاں جلالپور کے اتر اور پورب میں بغاوت بہت تیز تھی۔ بڑہر کے پلیوار چھتریوں نے اس لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

1942 کے بھارت چھوڑو آندولن کے دوران جلال پور کسی سے پیچھے نہیں تھا آزادی کے جن سورماؤں نے اس آندولن میں حصہ لیا تھا ان میں سے شاید ہی کوئی زندہ ہو۔ مگر ان کے ناموں کی ایک فہرست محکمہ بلاک کے سامنے اب بھی لگی ہوئی ہے۔

موجودہ دور: آزادی کے بعد کے دور کو یہ نام دیا جاسکتا ہے 1947 سے اب تک کا یہ دور جلالپور کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

آج کا جلال پور 50 ہزار سے اوپر کی آبادی والا قصبہ ہے یہاں کے انگوچھے کا کاروبار دور دور تک مشہور ہے۔ دیش کے کونے کونے میں جلال پور کے انگوچھے کی شہرت ہے یہاں تقریباً 10 ہزار پاور لوم کام میں لگے ہیں۔ علاقے کے گاؤں کی پیداوار کے لیے یہ اچھی منڈی ہے تب بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ترقی کی دوڑ میں جلال پور پیچھے ہی رہ گیا ہے۔ سرکار نے اس کی ترقی کے لیے خاص کوشش نہیں کی ہے۔ جیسے جلالپور پرانے زمانے میں نظر انداز تھا۔ ویسے ہی آج بھی نظر انداز ہے۔

تاریخی اور پرانی عمارتیں: جلالپور کی آبادی تقریباً پانچ سو سال پرانی ہے۔ اس لیے یہاں بہت ہی پرانی عمارت کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اس کے آس پاس کے علاقے میں متی کے نام سے چھوٹی چھوٹی مٹھیا پائی جاتی ہیں ان کی شکل وصورت چوکور، گول، چھ پہلی، آٹھ پہلی

پہلی جنگ عظیم کی شروعات میں جلال پور میں ایک چھوٹا اسپتال بھی کھولا گیا یہ آج بھی اس علاقے کی خدمت کررہاہے۔ اس طرح برٹش دورمیں جلال پور کو بہت اہمیت ملی اوریہاں حکومت کے کئی محکمے کھولے گئے۔ اس دورمیں جلال پورنے خاص ترقی کرلی تھی۔ بُنائی کی گھریلوصنعت دھیرے دھیرے بہت بڑھ گئی۔ 1879 کی سٹلمنٹ رپورٹ سے معلوم ہوتاہے کہ اس وقت جلال پور میں تیارمال کہیں باہرنہیں جاتاتھا۔لیکن بیسویں صدی کے شروع سے ہی یہاں کامال دوردورتک جانے لگاتھا۔ پورے برٹش دورمیں جلال پورملک ہدایت حسین کے خاندان کے ہی قبضے میں رہا۔

ہیں۔ کسی میں ایک دورازہ کسی میں دو، کسی میں چار اور کسی میں کوئی بھی دروازہ نہیں ہے۔ یہ عمارتیں کچھ ضرور پرانی ہیں اور ممکن ہے ان کی کچھ اہمیت بھی ہو۔

جلالپور میں کئی سو سال سے زیادہ کی پرانی عمارتیں ہیں جس میں پنچائتی امامباڑہ، شبیہ روضۂ حضرت امام حسینؑ، پلٹو صاحب کا مندر، گوبند صاحب کا مندر، مٹھیا، تھانہ ڈاکخانہ اور مڈل اسکول وغیرہ۔ جامع مسجد اکبر اعظم کے ہی زمانے کی بتائی جاتی ہے، لیکن تحریری طور پر اس کا کہیں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

پرانی عمارتوں میں سب سے زیادہ جاذب نظر اور تاریخی اہمیت کی حامل جلالپور قصبے کے شمال مشرق کونے پر ٹونس ندی کے کنارے پر بنی عمارت بڑی درگاہ ہے۔ یہ قصبے سے تقریباً ایک کلومیٹر پورب کی طرف ہے یہ عمارت نواب شجاع الدولہ کے دور میں تعمیر ہوئی تھی۔

لوگ زبان اور عقائد: نئی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی 50 ہزار ہے۔ 1879 کی سٹلمنٹ رپورٹ میں اس کی آبادی 6752 بتائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک سو پچیس (125) سال میں آبادی تین گنی ہوگئی ہے۔ یہاں کی دو تہائی آبادی اسلام مذہب کے ماننے والوں کی ہے۔ یہاں باہر سے آنے والے نہیں کے برابر ہیں۔ لوگ یہیں کی مٹی کے بنے ہیں اور اس مٹی کی ساری خوبیاں یہاں کے لوگوں میں ہے۔ سیدھے سادے ملنسار اور خدا پرست ہیں۔

جلالپور کی تاریخ میں ہندو مسلم فساد جیسی بات کبھی تھی ہی نہیں مسلمانوں میں تقریباً آدھے شیعہ اور آدھے سنی مسلک کے ہیں سنیوں میں وہابی اور حنفی دونوں مسلک کے لوگ ہیں۔

جلالپور میں جو ہندو ہیں وہ زیادہ تر ویش (بنیا) برہمن یا ہریجن ہیں جلالپور کے آس پاس کوئی پرانا مندر یا ہندو دھرم کا کیندر نہ ہونے سے ایسا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں کے ہندو بھی بہت پہلے سے آباد نہیں تھے۔ بہت پہلے اس پورے علاقے میں وہ لوگ رہتے تھے جو نہ تو ہندو تھے نہ مسلمان جو بھی تھے ان مول باسیوں کے ہی نمائندے تھے۔

جلالپور: فیض آباد اور اعظم گڑھ کی سرحد پر آباد ہے۔ اس لیے یہاں کی زبان میں اودھی اور بھوجپوری دونوں کی چاشنی ہے۔ یہیں سے پچھم اودھ کا علاقہ ہے اور پورب بھوجپوری کا علاقہ، گاؤں دیہاتوں میں جو بولی ہے اس میں اودھی اور بھوجپوری دونوں کی جھلک ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہندی یا اردو ہے۔ جلالپور کی ادبی زبان اردو ہے ان پڑھ لوگوں کی زبان نہ ہندی ہے نہ اردو نہ دیہاتی اور نہ شہری بلکہ اس میں سبھی زبانوں کا عجیب گھال میل ہے۔ جلالپور کی ادبی زبان کی خوبیوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ہی یہ مضمون اور اس سے متعلق ساری تحریک اور پروگرام قلمبند کیے جا رہے ہیں۔

میلے اور تیوہار: جلالپور میں عید میلادالنبی، محرم، ہولی، دیوالی، دسہرہ وغیرہ بڑی خوشی اور میل ملاپ کے ماحول میں منایا جاتا ہے۔ محرم اور دسہرہ کے موقعے پر یہاں بڑے میلے بھی لگتے ہیں۔ طرح طرح کے ادبی پروگرام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہاں کے میلوں اور تیوہاروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں ہندو مسلمان دونوں کھلے دل سے حصہ لیتے ہیں۔ ہولی اور عید کے موقع پر دونوں فرقے کے لوگ عید ملن اور ہولی ملن کا پروگرام منعقد کرتے ہیں۔

روزگار و صنعت: جلالپور کی خاص تجارت اور پیشہ بُنائی کا ہے۔ یہ یہاں کا سب سے پرانا اور بڑا روزگار ہے۔ یہاں کے تیار گمچھے اور اسٹیل کے سامان آسام، بنگال، بہار، مدھیہ پردیش اور دوسری ریاستوں میں بہت مقبول ہیں۔ جلالپور کا ذریعہ معاش اسی کاروبار پر منحصر ہے۔ اب ہتھ کرگھوں کی جگہ پاورلوم نے لے لی ہے۔ آج کل یہاں ہزاروں پاورلوم چل رہے ہیں۔

کچھ دنوں پہلے تک یہاں کے دیسی جوتے بھی مشہور تھے لیکن اب دیسی جوتوں کا رواج اُٹھ جانے سے یہ کاروبار ختم ہوگیا۔

انگریزوں کے زمانے میں یہاں نیل کا کام بھی ہوتا تھا جہاں پر زیندر دیو انٹر کالج ہے وہاں اس وقت نیل بنانے کا مرکز تھا نیل بنانے کے بڑے بڑے ٹینکوں پر کالج کی عمارتیں بنا دی گئی ہیں۔

تعلیمی سماجی اور سیاسی صورت حال: جلالپور اپنی قدیمی وراثت اور تہذیب کے لیے مشہور رہا ہے اور ہندوستان میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ اس شہر میں زیندر دیو انٹر کالج، گورنمنٹ گرلس انٹر کالج (جی جی آئی سی)، امر گاندھی گرلس انٹر کالج، جعفریہ نیشنل انٹر کالج، جعفریہ نسواں انٹر کالج، مولانا آزاد گرلس انٹر کالج، مرزا غالب انٹر کالج، کرامتیہ اسکول، فیضان عزیزی، مدرسہ اسلامیہ، ندائے حق، مکتب جعفریہ، مدرسہ پنجتنی، امامیہ مہدیہ، حوزۂ علمیہ بقیۃ اللہ، جامعہ امام جعفر صادقؑ، مکتب امامیہ و جامعہ، زینبیہ نسواں ہائر سکنڈری اسکول، مدرسہ امامیہ تاج المکاتب مصطفیٰ آباد، مکتبہ ولی عصر وغیرہ اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈگری کالجوں میں علائم سنگھ یادو گرلس پی جی کالج، مہاویر پرساد اسمارک گرلس بی اے بی ایس سی، ڈی ایل ایڈ کالج ہیں۔

جلالپور ہمیشہ سے ہی حکومت کی نظروں سے نظر انداز رہا ہے۔ اسی وجہ سے جلالپور میں ابھی تک نہ کوئی میڈیکل کالج کھل سکا اور نہ کوئی یونیورسٹی۔ حالانکہ جتنی بھی سرکاریں اقتدار میں رہی ہیں۔ جلالپور کا کوئی نہ کوئی اس حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر رہا ہے مگر پھر بھی کوئی کام نہیں ہو سکا۔

پھر بھی یہ شہر تعلیمی میدان میں بہت آگے رہا ہے۔ اس شہر میں مرحوم شفیق حسین (I.A.S.)، قیصر ہند ڈاکٹر رفیق حسین سول سرجن، احمد حسن (I.P.S.)، وحید الحسن (I.R.S.) اور نہ جانے کتنی ہی نامور شخصیتیں ہوئیں۔ اور آج بھی اس راستے پر سفر جاری ہے۔

اردو کی معروف ہستیاں اور ان کے کارنامے: جلالپور شہر علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں پہ اردو زبان و ادب کا ہمیشہ بول بالا رہا ہے۔ یہاں تقریباً 95 فیصد افراد اردو زبان بولتے ہیں۔

اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے والوں میں مرحوم ظفر جلالپوری، اور موجودہ دور میں انور جلالپوری، نیر جلالپوری، شبیر حسین پروفیسر پرویا آشرم ڈگری کالج، ڈاکٹر محبوب عالم لکچرر ڈگری کالج ٹانڈہ، زاہد جعفری جلالپوری، فاخر جلالپوری، آفاق فاخری جلالپوری، شمسی جلالپوری، صندل جلالپوری، محمد اسعد، وغیرہ ہیں۔

اردو کے فروغ میں اردو مراکز کا رول: اردو زبان صدیوں سے تہذیب اور ادب کی مثال رہی ہے جو آج بھی قائم ہے۔ زبان چاہے کوئی بھی ہو اس کو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والا ہی زبان کو اور اس کی پہچان کو زندہ رکھ سکتا ہے۔

جلالپور شہر پہ اردو اداروں کی کوئی خاص توجہ نہیں ہے۔ پھر بھی اس شہر میں اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد لکھنؤ، حیدرآباد، مہاراشٹر، اورنگ آباد جیسے شہروں سے کم نہیں ہے۔ یہ شہر اپنے ہی طریقے سے اردو کی خدمات انجام دے رہا ہے۔

مذہب: جلالپور میں کئی مذہب کے لوگ موجود ہیں جن میں ہندو مذہب 48 فیصد، مسلمان مذہب 50 فیصد، جین مذہب 0.5 فیصد، سکھ مذہب 0.2 فیصد، بودھ مذہب 0.2 فیصد، و دیگر مذہب کے لوگوں کی تعداد 1.1 فیصد ہے۔

■

Zayer Husain Salsi S/o Alhaj Md Jafar Sahab
Mohalla- Jafrabad (Badi Masjid) Post: Jalalpur
District: Ambedkar Nagar - 224149 (UP)
Mob: 8127767258,9795135631
E-mail:-zayerhusainsalsi@gmail.com

اسلم محبوب خان

معاشرے میں استاد کا کردار

آج کے معاشرے میں جہاں چاروں طرح ظلمات ہی ظلمات ہیں۔ دنیا کی ہزاروں بستیوں میں امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ جہاں نسلیں تباہی کے دہانوں پر کھڑی ہیں۔ ترقی یافتہ سماج کی تعلیم یافتہ نوجوان نسل اخلاق باختگی کی شکار اور ظلمات کی خوگر ہے۔ جہاں تعلیمی مراکز و ادارے بچوں کو انسان بنانے کی بجائے انھیں ایک مشین بنا کر سجا رہے ہوں۔ طلبہ کی کیا بات ہے خود اساتذہ اخلاقی زوال کی ان سطحوں پر پہنچ گئے ہوں جہاں ایسے ٹوٹے بکھرے سماج میں بھی ایک امید کی کرن 'استاذ' ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ آج بھی معصوموں کو اسکولوں میں داخل کرا کر یہ کہنا واجب الامر سمجھا جاتا ہے کہ ''میرے بچے کا خیال رکھیے گا اور میرے بچے پر خاص توجہ دیجیے گا''

مذکورہ دونوں جملے محض زبان سے ادا کیے گئے رسمی کلمات نہیں بلکہ استاد کے شانوں پر رکھی گئی ہزاروں ٹن وزنی ذمے داریاں ہیں۔ یہ وہ ذمے داریاں ہیں جو اگر ڈھنگ سے ادا کردی گئیں تو اب بھی انسانی سماج کی معراج کی امیدیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔

ڈاکٹر محمد اکرام خان استاد کی معنویت ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''استاد کا مرتبہ والدین کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ تو استاد کو والدین کے مقابلے میں زیادہ عزت دیتے ہیں۔ اس لیے کہ والدین تو بچوں کو زندگی دیتے ہیں اور استاد اس زندگی کو با معنی بنانے کا ہنر سکھاتے ہیں۔ استاد کو ملک کا بہترین محافظ سمجھا جاتا ہے اور تعلیم حفاظت کے لیے بہترین ہتھیار ہے۔''

سکندر سے کسی نے پوچھا کہ تم اپنے والد سے زیادہ استاد کی عزت کیوں کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ والد تو مجھے آسمان سے زمین پر لانے کی وجہ بنے لیکن میرے استاد نے مجھے زمین سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

اسکول کی دعائیہ مجلس میں جب صبح صبح معصوم بچے اقوال زرّیں سناتے ہیں اور کبھی کسی استاد پر کوئی قول پڑتا ہے تو ذہن کے ساتھ ساتھ روح کے دریچے بھی کھلنے لگتے ہیں۔ منجملہ ان میں سے کبھی یہ قول سنائی دیتا ہے'' ایک ایسا شخص جو ہمیشہ بچوں کے روشن مستقبل کے لیے متفکر رہتا ہے۔ جو طلبہ کو اس لیے رُلاتا ہے کہ وہ زندگی بھر مسکراتے رہیں۔ جو معصوم بچوں کے کاموں میں اس لیے غلطیاں تلاش کرتا ہے کہ زندگی بھر ان کی سرگرمیاں خامیوں سے پاک رہیں۔ جو طلبہ کو خوبصورت خواب دکھا کر انھیں سچ کر دکھانے کا حوصلہ دیتا ہے۔ اُسے استاد کہتے ہیں۔''

لیکن کیا ہمارے معاشرے میں سچ مچ استاد ایسی ذمے داریاں نبھا رہے ہیں۔ جن کے ذریعے ہم ایک صالح معاشرہ تشکیل دے سکیں۔ کیا ہم آج کے تمام اساتذہ سماج سے یہ امیدیں وابستہ کرسکتے ہیں کہ وہ نئی نسل کو اس قدر ہوشمند، قابل اور اچھا انسان بنا دیں گے کہ آنے والی دنیا جنت اور امن و شانتی کا نمونہ ہوگی۔ کیا ہم ماڈرن زمانے کے ماڈرن اسکولوں کی ٹیچنگ سے یہ امید کرسکتے ہیں کہ ہمارے بچے محض ایک مشین یا سافٹ ویئر بن کر نہیں رہ جائیں گے۔ کوئی بھی استاد یا سرپرست ان باتوں کا اثبات یا نفی میں جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ وہ ابھی اس معاملے میں ایقان کے درجے میں نہیں امکان کے درجے میں کھڑا ہوا ہے۔

اسکول کے ابتدائی سالوں میں ٹیچر کی ذمے داری بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن نصاب کی تکمیل کی ذمے داری کو ہی وہ سب سے بڑی ذمے داری سمجھتا ہے، جو ایک غلط رجحان ہے۔ اس مرحلے میں استاد کی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ صرف نصاب کی تکمیل کو ہی تعلیم و تعلم کا مقصد نہ سمجھے بلکہ ہر کم سن بچے کی کمزوری، ان کے مسائل اور نصاب سمجھنے میں ہونے والی دشواریوں کو پہچان کر اس کا مداوا کرنے کی کوشش کرے۔ ٹیچر کی ذمے داری یہاں تک بنتی ہے کہ اگر کوئی بچہ غذائیت کی کمی کے بنا عدم توجہی

اور عدم دلچسپی کا شکار ہوتا ہے یا زیادہ ضد کرتا یا روتا ہے تو اس پر خصوصی توجہ دے کر اس کی غذائیت کے مسائل، اسے خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ ابتدائی مرحلے کی چند غلطیاں یا مسائل آگے بڑھ کر خوفناک مسائل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ "تعلیم اور اس کے وسائل" میں ڈاکٹر محمد اکرام خان لکھتے ہیں:

"جس طرح بعض لوگ اپنی لاعلمی اور لاپروائی کی وجہ سے مرض کا علاج کرانے کے لیے ابتدائی منزل پر توجہ نہیں دیتے۔ اسی طرح بعض اساتذہ اور والدین بچوں کے مسائل کی طرف اس وقت تک توجہ نہیں دیتے، جب تک وہ تشویشناک صورتِ حال اختیار نہ کرلیں۔ نوعمر، نوبالغ، بالغ اور نوجوان بعض اوقات اپنی جسمانی تبدیلیوں، جسمانی شخصیت کی خامیوں، خانگی ذمے داریوں اور پریشانیوں، تفریح کے لیے وسائل کی کمی، ساتھیوں میں عدمِ مطابقت، ناکامی کے خوف، ناانصافی کے احساس، محبت میں محبوب کی بے التفاتی، زندگی میں عام مایوسی، پیشے کے انتخاب کی معذوری، بے روزگاری وغیرہ وغیرہ سے پریشان ہو کر کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں اور مدرسہ اور مدرسے کے باہر طرح طرح سے اپنی کبیدگی اور پریشانی کا اظہار کرتے اور دوسروں کے لیے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر استاد کو کل وقتی طور پر رہنمائی، گائڈنس کے ماہر کا تعاون حاصل کر کے صورت حال پر قابو پانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایسے موقعوں پر مشیر طبی، نرس، تربیت جسمانی کے استاد اور والدین کے مشوروں سے بھی بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ رہنمائی یا گائڈنس کا کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں ہے بلکہ صورتِ حال کے مطابق رہنمائی یا گائڈنس کی تدبیر کرنی چاہیے اور مرض کے بڑھنے سے پہلے ہی اس کے علاج کی طرف توجہ دینی چاہیے۔"

اسکول کے ابتدائی سالوں میں ٹیچر کی ذمے داری بہت زیادہ ہوتی ہے۔لیکن نصاب کی تکمیل کی ذمے داری کو ہی وہ سب سے بڑی ذمے داری سمجھتا ہے،جو ایک غلط رجحان ہے۔اس مرحلے میں استا د کی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ صرف نصاب کی تکمیل کو ہی تعلیم و تعلم کا مقصد نہ سمجھے بلکہ ہر کم سن بچے کی کمزوری، ان کے مسائل اور نصاب سمجھنے میں ہونے والی دشواریوں کو پہچان کر اس کا مداوا کرنے کی کوشش کرے۔

اگر یہ کہا جائے کہ استاد زندگی کے وسیع تجربات میں یا تو سب سے شیریں تجربہ ہے یا سب سے تلخ تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ بیشمار مثالوں سے یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ یا تو ایک استاد کسی طالب علم کی زندگی بناتا ہے یا کسی طالب علم کی زندگی ہمیشہ کے لیے برباد کر دیتا ہے۔ اس لیے ایک استاد کا رویہ، اس کے اخلاق، اس کی عادات اور اس کا زندگی گزارنے کا ڈھنگ بچے پر راست یا بالراست طریقے سے اثر انداز ہوتا ہے۔

"اردو زبان کی تدریس" میں معین الدین لکھتے ہیں:

"استاد کی ذمے داریوں میں سے ایک اہم ذمے داری یہ ہے کہ طلبا کی ترقی کا جائزہ لے اور اس بات کا اندازہ لگائے کہ طالب علم کا کون سا پہلو کمزور ہے اور کس کام میں وہ پچھڑا ہوا ہے۔ اس کے پیشِ نظر وہ موادِ مضمون کی تنظیم نو اور طریقۂ تدریس میں حسبِ ضرورت اصلاح کرتا رہتا ہے۔ اندازۂ قدر کے تحت محض موادِ مضمون کی جانچ پر زور نہیں دیا جاتا بلکہ وقوفی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ احساسی اور عملی نشو و نما کا بھی پتہ لگایا جاتا ہے۔ یعنی اس کی رو سے طلبا کے رویے، شوق تصورات، تفکرات اور عادتوں میں تبدیلی کا بھی اندازہ لگانا مقصود ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اندازۂ قدر کا تصور زیادہ جامع اور بسیط ہے۔ اس کے مقابلے میں امتحان کا تصور بہت محدود اور تعلیمی اور نفسیاتی اعتبار سے ناقص بھی ہے۔"

درج بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ بچہ کو صرف نصاب کے بندھے ٹکے دائرے میں نہیں سمیٹا جا سکتا بلکہ اس کے نفسیاتی پہلو اور اس کی سوچ و افکار پر تعلیمی عمل کا کیا اثر ہو رہا ہے اس پر بھی نگاہ کرنا ضروری ہے۔ سب سے اہم ترین پہلو تدریسی عمل کا یہ ہے کہ بچے میں اخلاقی رو سے کیا تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں؟ یا پھر ہو بھی رہی ہیں یا نہیں؟ یا وہ کسی بداخلاقی کا شکار ہوتا نظر آ رہا ہے۔ ان ساری باتوں کا جائزہ وقتاً فوقتاً لیتے رہنا ایک استاد کی عین ذمے داری ہے۔

اگر صحیح ڈھنگ سے بچوں کی ارتقائی کیفیت کا جائزہ لیں تو بڑے افسوس کے ساتھ یہ نتائج سامنے آتے ہیں کہ اخلاقی ارتقا تو بہت دور کی بات ہے زبان دانی کے معاملے میں بھی بچے برسہا برس اسکول آنے کے بعد بالکل انگوٹھا چھاپ رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک المیے کے سوا اور کچھ نہیں کہ کروڑوں روپیوں کی لاگت کے باوجود تعلیمی پالیسیاں اساتذہ کے سرد رویے کے باعث ناکام ہو جاتی ہیں اور روایتی ڈھب سے ایک ٹیچر نکلنا ہی نہیں چاہتا۔

قومی پالیسی کی روشنی میں پرائمری، سیکنڈری، ہائر سیکنڈری اور ڈی ایڈ کا نیا نصاب تیار کیا گیا ہے۔اس لیے معلمین کی تربیت کے مروجہ طریقوں میں اہم تبدیلی لانا ضروری ہے۔نئی تعلیمی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے روایتی تدریسی طریقوں کی خامیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تدریسی تکنیک میں بھی تبدیلیاں لانا ضروری ہے۔فی زمانہ بیشتر اسکولوں میں نصاب کے اجزا کو ایک بے لچک طریقے سے سکھادینے ہی کو تدریس سمجھا جاتا ہے۔یہ خیال جڑ پکڑ چکا ہے کہ اُردو تو کوئی بھی پڑھاسکتا ہے۔یہ خیال بھی عام ہوتا جارہا ہے کہ کتاب کے نثر، نظم اور قواعد کو پڑھ کر سنادینے کا مطلب تدریس ہے۔

ایک مخصوص اندازِ تدریس اور کتاب کو پڑھ دینے کو تدریس نہیں کہتے۔ بلکہ درس و تدریس ایک ایسی ذمہ داری ہے جس پر ایک بچے کا مستقبل، سماج کا وقار اور ملک کی طاقت داؤ پر لگی ہوتی ہے۔ ایک استاد اپنی ذمہ داریوں سے منہ موڑ کر آنے والی نسلوں کی مکمل فصل کو آگ لگانے کا کام انجام دے رہا ہے۔ اس غیر ذمہ دارانہ رویے کی باز پرس اور تنبیہ نہایت ضروری امر ہے۔ اس سلسلے میں غلام نبی مومن لکھتے ہیں:

"قومی پالیسی کی روشنی میں پرائمری، سیکنڈری، ہائر سیکنڈری اور ڈی ایڈ کا نیا نصاب تیار کیا گیا ہے۔ اس لیے معلمین کی تربیت کے مروجہ طریقوں میں اہم تبدیلی لانا ضروری ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے روایتی تدریسی طریقوں کی خامیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تدریسی تکنیک میں بھی تبدیلیاں لانا ضروری ہے۔ فی زمانہ بیشتر اسکولوں میں نصاب کے اجزا کو ایک بے لچک طریقے سے سکھا دینے ہی کو تدریس سمجھا جاتا ہے۔ یہ خیال جڑ پکڑ چکا ہے کہ اُردو تو کوئی بھی پڑھا سکتا ہے۔ یہ خیال بھی عام ہوتا جا رہا ہے کہ کتاب کے نثر، نظم اور قواعد کو پڑھ کر سنا دینے کا مطلب تدریس ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بارہ برس تک اُردو سیکھنے کے بعد بھی طلبہ میں سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیتیں پیدا نہیں ہو پاتیں۔"

آج مدرس کو اس بات کو پیشِ نظر رکھنا نہایت

ضروری ہے کہ سارا تعلیمی نظام موجودہ وقت میں 'طالب علم مرکزیت' کا حامل ہے۔ اسکول، اسکول کی عمارت، اسکول کا ماحول، ٹیچر، تختۂ سیاہ، میزیں، کتابیں اور ٹیچر کی تنخواہ سب کچھ ایک طالب علم کے لیے ہے۔ اگر یہ سارا نظام مل کر ایک طالب علم کو آگہی سے محروم رکھتا ہے تو ایسے تعلیمی نظام کو نہایت بوسیدہ اور Outdated قرار دیا جانا چاہیے۔ استاد کی ذمہ داریاں سماج میں سب سے بڑی ہیں۔ کیونکہ یہ معمارِ قوم ہے۔ یہی انجینئر بنائے گا یہی

ہماری ذمہ داریوں میں یہ بات شامل ہے کہ ہم اساتذہ کے اذہان پر محنت کریں او ران کی فکری ارتقا پر کام کریں۔دانشوران کا کہنا ہے کہ روبہ زوال انسانی سماج کی آخری امید کی کرن اساتذہ ہیں۔یونیسیف کی سابقہ سفیر برائے اطفال ملالہ یوسف زئی کا قول عالمی سطح پر موضوع بحث رہا۔انھوں نے کہا کہ ایک قلم ایک بیاض اور ایک استاد ساری دنیا کو بدلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر، یہی مستقبل کے کلکٹر اور تحصیلدار تشکیل دے گا۔ یہی بلڈر اور تاجر بننے کی سوچ بچے کے ذہن میں ڈالے گا۔لیکن ٹیچر تو محض نصاب کی تکمیل کو اپنا کام سمجھ بیٹھا ہے۔شاید اس کے پیچھے صدر مدرس اور انتظامیہ کمیٹی کا دباؤ بھی ہو۔

اس سلسلے میں نہایت باریک بینی سے تجزیے کی ضرورت ہے۔ایسے بہت سے تجزیے پڑھنے میں آتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے ہم زوال کا شکار صرف اس لیے ہیں کہ ہم خود اپنی زبان پر کنٹرول نہیں کر پا رہے۔ایک استاد خود بداخلاقی اور بدکلامی کا شکار ہے۔اُس میں نہ بیٹھنے کا سلیقہ ہے اور نہ ہی اٹھنے کا۔بچوں سے بد تہذیبی کے انداز میں بات کرنا۔غصے میں آجانا اور ان کے والدین تک کو برا بھلا کہہ دینا۔یہ بچوں کے ذہن پر اس قدر بد اثرات مرتب کر رہا ہے کہ ہماری سوسائٹی ایک خوفناک انحطاط کی جانب رواں دواں ہے اور ہمیں اس کی خبر بھی نہیں کہ ہم بد تہذیبی کی کس کھائی میں جا گریں گے۔

امریکہ کی ایک فلاحی تنظیم جس کا نام SEGA ہے۔ ملیشیا کی تعلیمی فلاحی تنظیم NAMA کے ساتھ مل کر ایک خوش آئند پروگرام گذشتہ چند برسوں سے چلا رہی ہے جس کا مقصد ہے کہ اساتذہ کی سوچ اور طریقۂ کار کو بدلا جائے۔اس ضمن میں وہ مسلم اداروں بالخصوص اُردو اداروں کو متوجہ کر رہی ہے اور اس ضمن میں عالمی سطح کے 5روزہ کیمپ ملیشیا میں منعقد کرتی ہے۔ان دونوں ہی تنظیموں کے باہمی اشتراک سے تربیتی کیمپ میں صبح تا شام نہایت مصروف ترین شیڈول میں ایک ہی بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ آپ خودشناس بنیں اور نئی نسل کے بہترین مستقبل کی ذمہ داریوں کو قبول کریں۔اس سلسلے میں انھوں اپنے پروگرام کا نام رکھا ہے Transform the Transformers ''یعنی اُن لوگوں کو بدلیے جو سماج کی نئی نسل کو ڈھال رہے ہیں''۔اس نعرہ کے ساتھ ان کے تمام پروگرام میں یہ بات واضح طور پر کہی جاری ہے کہ اب آپ کو طلبہ کے مافی الضمیر کو بھی سننا پڑے گا۔ہوسکتا ہے کوئی ایسی کہانی آپ کے سامنے آئے جو دوسرے بچوں کو تحریک دے سکے۔ہوسکتا ہے ایسا کوئی پوشیدہ درد ہو جس کے بیان کردینے کے بعد بچہ کھل جائے اور مستقبل کا ایک ہونہار طالب علم بن سکے۔

ہماری ذمہ داریوں میں یہ بات شامل ہے کہ ہم اساتذہ کے اذہان پر محنت کریں اور ان کی فکری ارتقا پر کام کریں۔دانشوران کا کہنا ہے کہ روبہ زوال انسانی سماج کی آخری امید کی کرن اساتذہ ہیں۔یونیسیف کی سابقہ سفیر برائے اطفال ملالہ یوسف زئی کا قول عالمی سطح پر موضوع بحث رہا۔انھوں نے کہا کہ ایک قلم ایک بیاض اور ایک استاد ساری دنیا کو بدلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر حلیمہ فردوس کے مطابق تعلیم فی الوقت 'استاد، طالب علم اور نصاب' اس تثلیث پر قائم ہے۔وہ لکھتی ہیں:

آج تدریسی تقاضے کچھ اور ہیں۔نصاب کی تکمیل جزوی حیثیت اختیار کر گئی ہے کیونکہ بچے کے سیکھنے کا عمل صرف اسکول کی چار دیواری تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ سارا معاشرہ اس کے لیے کلاس روم بن گیا ہے۔......تدریس کے تین اہم زاویے یعنی ایک معلم دوسرا طالب علم اور تیسرا نصاب ہے۔آج کی تعلیم Child Centred ہے۔ طالب علم کی ذات مرکز کی حیثیت رکھتی ہے، گو یہ زاویہ اہم ہے،لیکن اس تثلیث میں دیگر دو زاویے بھی اہمیت کے متقاضی ہیں۔طالب علم کے بغیر معلم کی شخصیت ادھوری ہوگی۔معلم اور طالب علم کی بے توجہی کی وجہ سے جانفشانی اور محنت سے تیار کیا گیا نصاب بے مصرف اور بے وقعت کہلائے گا۔اساتذہ کو چاہیے کہ ہر زاویے کی اہمیت کو سمجھیں۔''

نئے وقت کی تعلیم میں ایک معلم کو بعض اوقات اداکار بن کر مختلف کرداروں کو ادا کرنا پڑتا ہے بالخصوص وہ مضامین جن کا طریقہ تدریس بیانیہ ہے۔اگر ہم کہانی اور ڈراما کو اداکاری کی طرح اسٹیج پر ادا کریں تو ظاہر ہے اس میں اپنی پوری جان ڈال دیں گے۔اسی طرح پرائمری و سیکنڈری سطح پر اسے بہت موثر بنایا جاسکتا ہے۔آج کل کے جدید ترین تعلیمی نظام میں معلم، مدرس یا ٹیچر لفظ کو کالعدم قرار دینے کی تیاری ہے اور اب ٹیچر کو Felicitator کا درجہ دیا گیا ہے۔یعنی موقع وسہولت دینے والا۔ایک ٹیچر بچوں کو بولنے کا موقع دے۔ان کے نظریے سے نصابی موضوع کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ایک بچہ کو ایک معلم بولنے کا موقع دے گا تو بچہ کی شخصیت میں ایک زبردست انقلاب واقع ہوگا اور اس کے مافی الضمیر کی ادائیگی اُسے

آج تدریسی تقاضے کچھ اور ہیں۔نصاب کی تکمیل جزوی حیثیت اختیار کر گئی ہے کیونکہ بچے کے سیکھنے کا عمل صرف اسکول کی چار دیواری تک محدو د نہیں رہا۔بلکہ سارا معاشرہ اس کے لیے کلاس روم بن گیا ہے۔......تدریس کے تین اہم زاویے یعنی ایک معلم دوسرا طالب علم اور تیسرا نصاب ہے۔آج کی تعلیم Child Centred ہے۔ طالب علم کی ذات مرکز کی حیثیت رکھتی ہے، گویہ زاویہ اہم ہے،لیکن اس تثلیث میں دیگر دو زاویے بھی اہمیت کے متقاضی ہیں۔

بیباک اور تحصیلِ علم کی بابت مشتاق بنائے گی۔ورنہ جس طرح کی تدریس اور تعلیمی عمل کو ہم دیکھ رہے ہیں وہ نہایت فرسودہ اور دلچسپی سے عاری ہے۔اس بابت سنجیدگی سے غور کیے جانے اور تعلیمی نظام میں اساتذہ کی فکری ارتقا اور اصلاحی تجدید کی اشد و اہم ضرورت محسوس ہورہی ہے۔اساتذہ کی شخصیت وافکار میں انقلاب کے بغیر تعلیمی نظام میں انقلاب کی تمام کوششیں بے سود ہیں۔

■

Aslam Mahboob Khan
Asst. Teacher, Govt. P.U. College for Women
Basawakalyan
Dist. Bidar - 585327 (UP)
Cell:9972009286

کچن گارڈن

نسیم سعید

'قدرت سے قربت' نہ صرف انسانوں کی مُسکان و خوشی کی فراہمی کا ایک غیبی ذریعہ ہے بلکہ یہ انسان کی خود اعتمادی میں اضافے کا بھی ایک بہترین متبادل ہے۔ شجر کاری، سرسبزی اور شادابی سے رشتہ قدرت کی موجودگی کا احساس کرانے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ نباتات وحیوانات اسی طرح پرندوں اور قدرتی ماحول سے مربوط رہنا ہی انسان کی جسمانی اور ذہنی صحت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ قدرت سے اپنے اس رشتے کی بقا کے لیے زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس مقصد کی تکمیل اپنے روزآنہ کے معمول سے ہی پورا کیا جاسکتا ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ شہر کی دوڑتی بھاگتی، تیز رفتار زندگی میں ایسا کیسے ممکن ہے۔ شہروں میں فلیٹ کلچر کے ساتھ ہی بڑی عمارتوں کے اطراف خالی جگہیں چھوڑنے کا رواج عام ہے۔ Farm House جیسے جدید رہائشی طرز زندگی کے نظریے نے بھی خوب فروغ پایا ہے۔ احاطہ شدہ طویل کُھلی ہموار جگہوں میں رہائشی عمارتوں کے اطراف باغوں کا لگانا اب ایک جدید تہذیب کا ہی حصہ بن گیا ہے۔ گویا باغبانی اور چھوٹے پیمانے پر کاشتکاری اب شہری زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ روزآنہ کی ضروری سبزیوں کے لیے لوگ اب کاشتکاری پر منحصر رہنا اور بازاروں کا رُخ کرنے کی بجائے خودکفیل بننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ایک پودے کو درخت بنتے دیکھنا یقیناً اپنے آپ میں ایک سکون و راحت بھرا تجربہ ہے۔ باغبانی کرنے سے ہم میں مثبت تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ کٹائی چھنٹائی، مناسب و وافر مقدار میں کھاد پانی دینا اور اُن پر سلیقے سے نظر رکھنا ہم میں نظم وضبط کی ہی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ باغبانی کرنے کا ہماری صحت پر خاصا اثر پڑتا ہے۔ دل کو سکون، چین، سکھ، راحت اور اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ من خوش ہے تو تن کو بھی خوش ہونے میں وقت نہیں لگتا۔ پیڑ پودے خالص آکسیجن کے ساتھ صحت بخش اور صحت مند ماحول سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اطبا وحکما کے مطابق باقاعدہ باغبانی کرنے سے خون میں شکر کی سطح، خون کا دباؤ اور کولیسٹرول کی سطح بھی قابو میں رہتی ہے۔ یہ وزن میں تخفیف اور موٹاپے پر قابو پانے کا بھی اچھا ذریعہ ہے۔ نصف گھنٹے کی باغبانی کرنے سے 250 کیلوری توانائی کا استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مٹی کی سوندھی خوشبو اور من پسند مہک بھی ہمارے دل و دماغ، اعصاب اور نظام تنفس پر اچھے اثرات مرتب کرتی ہے۔ پودے اُگانا اور اُن کی نگہبانی کرنا ایک بے حد پاکیزہ اور تخلیقی کام ہے۔ باغبانی کرتے ہوئے ہماری تخلیقی صلاحیت اور بہترین کارگزاریوں میں اضافے کے ساتھ ہی قدرت سے بھی ہمارا رشتہ مضبوط و مستحکم ہو جاتا ہے۔ بیجوں سے اکھوا کا نکلنا، قلموں کی گانٹھوں سے پتیوں کا نشوونما پانا اور اُن کے رنگوں و جسامت میں تبدیلیاں واقع ہونا، پودوں کا رفتہ رفتہ بڑھنا، مسلسل نئی نئی پتیوں کا آنا، غنچوں کا چٹخنا اور پھولوں کا کھلنا یہ سب ایسے قدرتی مناظر ہیں جن کا دلفریب، پُر لطف، خوش بخت اور دل نشین منظر یقیناً قدرت کے وجود پر اعتبار، یقین اور اعتماد کا روح افزا اور فرحت بخش ایمان کے تقاضے کی نشانی ہے۔ نئی امنگ، جوش وخروش، پھرتیلا پن اور خود بخود حرکات وسکنات کے جذبے سے لبریز کرنے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

وقت بہ وقت انکشافات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ باغبانی کرنے کا ہمارے نفسیاتی صحت پر بھی کافی اچھا اثر مرتب ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف عام انسان متاثر ہوتا ہے بلکہ سزا یافتہ مجرموں پر بھی خاصا فرق دکھائی دیتا ہے۔ ذہنی دباؤ اور تناؤ کے کم ہونے کے ساتھ ہی کام کرنے کی گنجائش، صلاحیت اور کارکردگی کا بہترین مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس لیے جب مایوسی حاوی ہوجائے، نیند نہ آئے اور ذہنی دباؤ کا خاتمہ نظر نہ آئے تو جسم وجان کے اعصاب کو اس سے نجات دلانے کے لیے، دل و دماغ کو سکون بخشنے کے لیے باغبانی اور کھیتی باڑی ایک موثر علاج ہے۔ شہری زندگی ان حالات سے دوچار ہے اور نجات کا واحد ذریعہ کچن گارڈن ہے۔

انسانی صحت کے تعلق سے بات کریں تو دیہی زندگی کے مقابلے شہری زندگی زیادہ پریشان کن نظر آتی ہے۔ متوازن غذا کے نہ ملنے سے بھی شہری زندگیاں زیادہ بے چینی، انتشار اور بے اطمینانی کا سامنا کرتی ہیں۔ وجہ صاف ہے کہ ہمیں ملنے والی اجناس، ہری سبزیاں اور دالیں ملاوٹوں سے پُر ہیں۔ 'بیماریوں کا عالمی بوجھ' عنوان

سے ہندوستان کے تعلق سے جو باتیں خاص توجہ کا مرکز ہیں اُن میں پانچ بنیادی صحت بخش ضروری عناصر کی کمی اور ٹی بی جیسی بیماری کا ذکر ہے۔ پروٹین، وٹامن اور آئرن جیسے صحت بخش عناصر کی کمی سے زیادہ تر ہندوستانی شکار ہیں۔ خوردنی اشیا میں ایسے بنیادی عناصر کی کمی سے متاثر معاشرہ نئے صحت مند ہندوستان کی تشکیل ہرگز نہیں کرسکتا۔ بیماریوں اور غذاؤں میں ضروری اشیا کی کمی وزیادتی کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ لہٰذا صحت بخش غذا ہی صحت مند انسان کی تشکیل کرتی ہے اور صحت مند انسان صحت افروز معاشرہ۔ یہی صحت افروز معاشرہ خوشحال، خوش صحت اور خوش نصیب ہندوستان کی تعمیر کی ضمانت ہے اور دیہاتی وشہری زندگیوں کی صحت سے ہی یہ ممکن ہے۔ کیوں کہ دونوں زندگیاں صحت مند ہندوستان کی دو آنکھیں ہیں۔ صرف ایک آنکھ کی روشنی سے یہ معذور ہے۔ اس لیے آج ان مقاصد کے حصول کے تحت شہروں میں باورچی خانے کے باغوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

دیہی علاقوں میں زراعت، کاشتکاری، باغبانی اور مویشی پالنے کا زیادہ تر کام مرد بالغ کسان ہی انجام دیتے ہیں۔ خواتین، بچے اور بوڑھوں وضعیفوں کا اس میں کم ہی رول رہتا ہے۔ مگر شہروں میں اپنے گھروں، باورچی خانوں اور بالکنی سے متصل باغبانی اور کاشتکاری کے فروغ کے نظریے سے انھیں بھی یہ تمام مواقع حسب ضرورت فراہم ہوجاتے ہیں۔ شہروں میں خواتین اپنے آشیانوں میں ہی تازہ سبزیاں اُگا کر صحت وتندرستی کے ساتھ ہی ذمے داریوں کا بوجھ کم کررہی ہیں۔ گویا ایک طرح سے وہ خود کفیل بنتی نظر آتی ہیں۔ تروتازہ، ہری بھری اور غیر کیمیائی اجزا پر مشتمل سبزیاں حاصل کرنے کے لیے گھر کی بگیہ کو ہی سرسبز وشاداب رکھنا ہوگا۔ چھت، بالکنی، کھڑکیاں اور دالان کا استعمال کرکے اپنی اس خوش کن دلچسپی کو فروغ دینا آج شہروں میں عام بات ہے۔ اس کے لیے گراں قیمتی فینسی گملوں کا استعمال ہی ضروری نہیں ہے۔ اس کے لیے پرانی بالٹی، ٹب اور پلاسٹک بوتلیں بھی بروئے کارلائی جاسکتی ہیں۔ متوسط جسامت کے ٹب میں مٹی اور نامیاتی کھاد کا استعمال کرکے، پتہ گوبھی، پھول گوبھی، شملہ مرچ، مولی اور پیاز جیسی سبزیاں اُگا سکتے ہیں۔ باغبانی کے تکنیکی اصولوں وعلوم کو حاصل کرکے ٹماٹر، بھنڈی، بینس اور بینگن جیسی سبزیاں بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ خود کے ذریعے اس کارخیر میں وقت لگانے اور محنت ومشقت کرنے سے کفایت شعاری اور بچت کاری کو فروغ دینے میں مدد بھی ملتی ہے۔ باورچی خانے سے نکلنے والے نامیاتی کچروں اور پانی کو زمین کی زرخیزی میں بدلنے کے لیے استعمال کرکے ملک کی صفائی تحریک کا بھی حصہ بن سکتے ہیں۔ وقت بہ وقت گملوں میں لال مٹی کا چھڑکاؤ کرنے سے پودوں کو نامیاتی اجزا ملتے رہتے ہیں۔ ان پودوں سے نہ صرف بالکنی اور زینوں کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ نامیاتی سبزیوں کا حصول سب سے بڑی بات ہے۔ اُسی طرح مختلف اقسام کی بیلیں بھی پھلوں اور پھولوں کے ساتھ دلکش مناظر اور خوبصورتی عطا کرتی ہیں۔ مختلف موسموں اور اوقات کا تعین کرکے ہم ہر طرح کے پھل پھول اور سبزیاں کو حاصل کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج باورچی خانے کی باغبانی شہری طرز زندگی کا ایک اہم حصہ بن گئی ہے۔ جب پہلے آبادی کم تھی تو بڑے شہروں میں بھی ہر گھر کے پیچھے ایک کچن گارڈن ہوا کرتا تھا۔ اب یہ کچن گارڈن چھتوں، بالکنی اور زینوں پر منتقل ہوگیا ہے۔

گھروں کے اندر پودے لگانے کا آغاز ہزاروں سال قبل ہوگیا تھا۔ لیکن آج یہ جدید طرز زندگی کا ایک اہم حصہ ہے اور اسے لوگ بنیادی ضرورتوں میں شمار کرتے ہیں۔ سب ہی پودوں کی گھروں کے اندر زیادہ اچھی طرح نشوونما نہیں ہو پاتی۔ کبھی کبھی وہ قبل از وقت مرجھا جاتے ہیں۔ کیونکہ سب ہی پودے ملے جلے اجالوں میں صحت مند نہیں رہ سکتے۔ یہ پودوں کی انواع واقسام اور ان کی نگہبانی پر منحصر ہے۔ گھر کے اندر رکھے پودوں کی دیکھ بھال بھی باغیچوں کے پودوں کی طرح ہی کرنا ہے۔ وقت بہ وقت ان کی چھٹائی اور ضروری کھاد دے کر مناسب مقدار میں پانی بھی فراہم کرنا ہوتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کے تعاون سے بھی معلومات جمع کرکے حسب منشا پودے کی نشوونما کرکے ہم اپنے مطلوبہ مقاصد کو حاصل کرسکتے ہیں۔ عام طور پر گھروں کے اندر چھوٹے پودے اور بیلوں کو لگائیں تو بہتر ہے۔ انھیں گھر کے کسی بھی گوشے میں جگہ بھی مل جاتی ہے۔ مناسب رنگوں کے گملوں کا انتخاب بھی اس طرح سے خوبصورتی میں اضافہ ہی کرتا ہے۔

اس مضمون کا مقصد یہی ہے کہ شہری لوگوں کی مستقبل قریب میں فلاح وبہبودی اسی میں ہے کہ کچن گارڈن کی تشکیل وصورت ہی اپنے لیے تھوڑی کاشتکاری کو خود انجام دیں، نہ صرف خود کفیل بننے کے نظریے سے بلکہ ہر بدلتے حالات سے مقابلے کے لیے بھی۔ کیوں کہ اگلی چند دہائیوں میں سبزیوں کی پیداوار میں کمی ہونا لازمی ہے۔ اس لحاظ سے کچن گارڈن کو فروغ دینا آج شہر والوں کے لیے بنیادی ضرورت میں شامل ہے۔

یہ حقیقت قابل تسلیم ہے کہ باغبانی کرنے کا شوق و دلچسپی ہر انسان کا فطری تقاضا ہے۔ چھوٹے بڑے، بالغ، نوجوانوں، ضعیف العمر، مردوزن سب ہی کے درمیان باغبانی کرنے کا شوق کم وبیش پایا جاتا ہے۔ آج باغبانی کرنا ایک فیشن کی شکل بھی اختیار کرچکا ہے۔ بارش کی رم جھم میں تو باغبانی کی خوشیاں دوبالا ہو جاتی ہیں۔ دیہاتوں، قصبوں، چھوٹے شہروں کے علاوہ بڑے شہروں میں بھی لوگ اس طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ باغبانی کا سب سے اچھا موسم مانسون کا ہوتا ہے۔ مانسون کے موسم میں گرمی کے ساتھ نمی بھی ہوتی ہے۔ جو پودوں کی جڑوں کو اچھی طرح پھیلنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اچھی باغبانی کے لیے مانسون کا موسم ایک طرح سے قوت بخش مقوی دوا تسلیم کیا جاتا ہے۔ کمپوسٹ کھاد پودے کی نشوونما کے لیے اچھی مانی جاتی ہے۔ مہینے میں دوبار کھادوں کو بدل کر صبح وشام پانی کی مناسب مقدار فراہم کرکے اچھی باغبانی کی جاسکتی ہے۔ پودوں کو کھلے آسمان کے نیچے رکھ کر اور بے کار پتوں کو کاٹ چھانٹ کر اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرسکتے ہیں۔ بڑے شہروں میں فلیٹ سسٹم کو رواج زیادہ ہونے سے اس کار خیر کے لیے جگہ کی کمی لازمی بات ہے۔ مگر ایسی عمارتوں کی چھتوں اور بالکنی پر چھوٹی ٹنکیوں میں پانی بھر کر کمل کا پھول بھی کھلا لیں تو حیرت کی بات نہیں ہے۔ سبزیاں اپنی غذائی وطبیعی اہمیت کی وجہ سے 'حفاظتی خوراک' کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ان میں صحت کو برقرار رکھنے اور جسم کی بہترین نشوونما کے لیے تمام ضروری اجزا مثلاً نشاستہ، لحمیات، حیاتین، نمکیات وغیرہ وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں جو کہ دیگر غذائی اجناس میں قلیل مقدار میں ملتے ہیں۔ سبزیاں جسم سے نہ صرف غلیظ اور فاسد مادوں کے اخراج میں مدد دیتی ہیں بلکہ یہ آنتوں اور خون کی نالیوں میں کولیسٹرول کی تہوں کی صفائی بھی کرتی ہیں۔ نیز دماغ کی قوت یادداشت یا قوتِ حافظہ میں اضافہ کے لیے بھی یکساں مفید ہوتی ہیں۔ سبزیوں کا متوازن استعمال جسم میں مختلف بیماریوں کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا کرتا ہے۔ ماہرین خوراک کے ایک اندازے کے مطابق انسانی جسم کی بہترین نشوونما کے لیے غذا میں سبزیوں کا استعمال 300 تا 350 گرام فی کس روزانہ ہونا ضروری ہے۔ یہ ایک متوازن خوراک ہے اور صحت مندی کی ضمانت بھی۔

عالمی حرارت (Global Warming) کے بڑھتے اثرات کے مدنظر اب سبزیوں کا ہر موسم میں حصول دنیا کے تمام خطوں میں ضرورت کے لحاظ سے تقریباً ناممکن

ہوتا نظر آتا ہے۔ آب و ہوا میں تبدیلی، خشک سالی، قحط سالی، سیلاب و باڑھ اور مانسون کے بے وقت ظہور پذیر ہونے سے غذائی قلت یا غذائی بحران کا مسئلہ عام بات ہے جس سے قیمتیں بھی آسمان کو چھونے لگی ہیں۔ غذائی عدم تحفظ کے مسئلہ سے لے کر تغذیہ بخش عناصر کی موجودگی کا احساس بار آور کراتا ہے کہ اب گھریلو پیمانے پر سبزیوں کی کاشت ہی اس کا واحد حل ہے۔ جسے ہم Kitchen Gardening, Organic Farming, Organic Gardening, Organic Kitchen Garden باورچی خانے کے نامیاتی باغیچے یا گھریلو باغ جیسے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ آج یہ شہری زندگی کا ایک اہم حصہ بھی ہے کیونکہ شہری انسانی آبادی اس کی کمی کا خمیازہ بھگت رہی ہے اور یہ اُس مسئلہ کا مستقل حل ہے۔ باورچی خانے کے باغیچوں میں کیمیائی کھادوں کا استعمال قطعی نہیں ہونے کی صورت میں حاصل ہونے والی سبزیاں ضروری تغذیہ بخش عناصر سے پُر ہوتی ہیں۔ جس سے نامیاتی کاشت کو ہی فروغ حاصل ہوا ہے۔ پودے کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کر کے فضائی آلودگی کو کم کرتے ہیں تو آکسیجن کا اخراج کر کے ماحول کو پرلطف بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ گویا معاشیات اور ماحولیات کا مشترکہ فائدہ ہی حاصل ہوتا ہے۔ دراصل شعاعی ترکیب کے عمل کے دوران سورج کی روشنی میں پانی اور سبز مائیہ کا استعمال کر کے پودے اپنی غذا خود بناتے ہیں اور آکسیجن پیدا کرتے ہیں گویا یہ ایک طرح سے غذا ساز اور خودکفیل ہوتے ہیں۔ حاصل ہونے والی نامیاتی غذا تمام وٹامن اور انٹی آکسیڈنٹ سے مزین ہوتی ہیں۔ زیادہ تروتازہ اور Phytochemicals ہوتی ہیں۔ کچن گارڈننگ خود شہری زندگی کو محرک، تناؤ اور دباؤ سے آزاد اور امراض سے نجات والا بناتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے سبزیوں کی پیداوار میں اضافہ کر کے اُس کی بدولت غذائیت کی کمی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ گھریلو پیمانے پر سبزیوں کی کاشت انتہائی موثر کاوش ہے یعنی اپنی غذا خود پیدا کرنا۔

گھریلو باغیچے کی منصوبہ بندی کرتے وقت ایسی جگہ کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جہاں پودے پر دن میں کم از کم چھ گھنٹے سورج کی روشنی پڑتی ہو۔ سایہ دار جگہ اس کام کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہوتی۔ سبزیوں کی کاشت کے لیے زمین کا بالائی حصہ (9 سے 12 انچ) انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ چوں کہ اسی حصے سے پودے کو خوراک اور پانی حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یہ حصہ کافی نرم ہونا چاہیے۔ سخت زمین یا چکنی مٹی میں ریت اور گوبر کھاد ڈال کر اُسے قابل کاشت بنایا جاسکتا ہے۔ مٹی کا بھربھرا اور نرم ہونا اس لیے ضروری ہے کہ پودوں کی جڑیں اچھی طرح پھیل سکیں۔

گھریلو کاشت کرتے وقت کاشت کی جگہ اور اس کی جسامت، لگائی جانے والی سبزیوں کی فہرست، پیداوار کے لیے ضروری تکنیک کا استعمال، دیکھ بھال کے لیے درکار وقت، مطلوبہ آلات، بیجوں اور کھادوں کا تعین، Biological Pesticide اور جراثیم کش ادویات کا استعمال وغیرہ ان عوامل پر غور وفکر کرنا لازمی ہے۔ نیز ناگہانی آفات کی صورت میں رہنمائی کے وسائل کا انتظام بھی ضروری ہے۔

کھادوں کے انتخاب میں گوبر اور پتوں کی کھادوں کو اولیت دینا ضروری ہے۔ جانوروں، مرغیوں کے فضلے کو دو تین ماہ زیر زمین رکھنے سے گوبر کھاد تیار ہو جاتی ہے۔ اُسی طرح سبزیوں، پھلوں اور انڈوں کے چھلکوں نیز سڑنے گلنے والی دیگر اشیا کی ہلکی تہوں پر گوبر کی تہہ چڑھانے سے دو تین ماہ میں مدفون اشیا بہترین نامیاتی کھاد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انڈوں کو اُبالنے کے بعد اس کا پانی ضائع نہ کرتے ہوئے ٹھنڈا کر کے پودوں کی جڑوں میں ڈالنے سے بھی کافی اچھی نشوونما ہوتی ہے۔ خون اور گوشت کو دھونے کے بعد اس کا پانی پودوں کے لیے کافی مفید ثابت ہوتا ہے۔

نامیاتی غذا کے حصول کے مقصد کے تحت کیمیائی کھاد کے استعمال سے اجتناب برتنا ضروری ہے۔ اگر باغیچے کی زمین کم طاقت کی بھی ہے تو نامیاتی کھاد کے وافر مقدار میں استعمال سے یہ طاقتور ہو جاتی ہے۔ پتوں اور پودوں کے قد اور پھیلاؤ کے لیے نائٹروجن ضروری ہے تو فاسفورس، جڑوں کی مضبوطی اور مختلف بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت بڑھاتی ہے اور پوٹاشیم کی موجودگی میں فاسفورس اور نائٹروجن کا صحیح استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کیلشیم، آئرن اور بوران کی قلیل مقدار بھی ضروری ہے۔ بیجوں کے صحت مند ہونے کی ضمانت بھی لازمی ہے۔ ایک خاندان کی سبزیاں ایک ہی رقبے پر یکے بعد دیگرے کاشت کرنے سے بچنا اس لیے ضروری ہے کہ اس سے کیڑوں اور بیماریوں کے حملے کی شدت میں کمی واقع ہوتی ہے۔

نامیاتی طریقے سے کاشت میں بظاہر کیمیائی طریقے سے کاشت کی بہ نسبت کم فصلیں حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن یہ زیادہ قوت بخش ہوتی ہے۔ نامیاتی طریقے سے اُگایا گیا بیگن نہ صرف بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت میں اضافہ کرتا ہے بلکہ معدے کو طاقت اور بھوک میں بھی زیادتی پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ قبض کشا اور دل کو تقویت فراہمی کا ذریعہ بھی ہے۔ سبزیوں کے علاوہ پھولوں اور پھلوں کی کاشت کو بھی بطور کچن گارڈن فروغ دیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک طرح سے اضافی لائق تعریف عمل ہے۔ اس کے ذریعے نہ صرف انواع واقسام کے پھلوں اور پھولوں سے متعلق معلومات کا ذخیرہ اکٹھا کیا جاسکتا ہے بلکہ بطور تعلیم وتعلم اور درس و تدریس کے پیش نظر نسل جدید کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ ان کی دلکشی اور خوش نمائی یقیناً خوش نصیبی اور خوش بختی کی علامت ہے۔ وہیں مہک، خوشبو اور لذت بھی سرور ولطف کے ساتھ مزاج کی خیریت اور صحت مندی کی پہچان ہے۔

آیئے ہم سب یہ عہد کریں کہ اپنے پُرامن، سرسبز و شاداب ماحول کی بقا اور انسانی زندگی کو خوشحال، صحت بخش، پُرسکون و پراطمینان بنانے کے لیے باورچی خانے کے باغیچے کے نظریے کو عملی طور پر اختیار کر کے قدرت کے بنائے نظام کے تحفظ کی ضمانت بنیں گے۔ نیز تغیر پذیر عالمی تہذیب وتمدن میں انسانی زندگی کا قدرت سے رشتہ مضبوط ومستحکم بنائیں گے۔

■

Naseem Sayeed
Sayeed Manzil
Haji Nagar New Yerkheda
Kamptee 441001
Dist, Nagpur(MS)

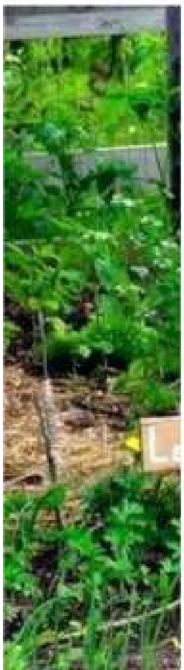

27 جولائی 2018 کی دیر رات میں 11 بج کر 54 منٹ 27 سیکنڈ پر چاند گرہن شروع ہوا۔ یہ سب سے زیادہ وقفہ والا چاند گرہن جو 28 جولائی 2018 علی الصبح 3 بجکر 49 منٹ تک جاری رہا۔ یہ چاند گرہن ہماری سرزمین ہندوستان کے ساتھ مشرق وسطیٰ (Middle East) کے کچھ حصوں، مرکزی ایشیا (Central Asia) اور مشرقی افریقہ کے ملکوں میں بھی دکھائی دیا تھا۔ یہ اس صدی کا سب سے زیادہ وقفے والا یعنی پورے 4 گھنٹے 54 منٹ تک جاری رہنے والا چاند گرہن تھا۔ اس کی شروعات 27 جولائی 2018 کو 11 بج کر 54 منٹ 27 سیکنڈ پر بحیثیت جُزوی چاند گرہن کے شروع ہوکر اس کا رنگ پیلا ہو گیا اور پھر 28 جولائی 2018 علی الصبح 1 بج کر 15 سیکنڈ پر یہ مکمل چاند گرہن میں تبدیل ہو گیا تب اس کا رنگ لال ہو گیا تھا اور پھر 2 بج کر 43 منٹ 12 سیکنڈ پر یہ پھر جزوی چاند گرہن میں تبدیل ہوا اور پھر اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور پھر 3 بج کر 49 منٹ پر یہ چاند گرہن کا حسین قدرتی منظر بھی ختم ہو گیا تھا۔ یہ قدرتی آسمانی نظارہ 15 جون 2011 کے بعد اب واقع ہوا تھا۔ اُس وقت یہ مکمل چاند گرہن 1 گھنٹہ 40 منٹ تک قائم رہا تھا جبکہ اس مرتبہ یہ 1 گھنٹہ 49 منٹ تک رہا۔ یہ تمام جانکاری امریکہ کی خلائی ایجنسی ناسا (NASA) کے گوڈارڈ خلائی فلائٹ سینٹر نے دی ہے۔ یہ چاند کے رنگوں کی تبدیلی کا آسمان میں خوبصورت منظر دیکھنے کا موقع اُن لوگوں کو مل سکا جو سائنس میں شوق اور ذوق رکھتے ہیں۔ ایسا کب سے ہوتا چلا آرہا ہے اور کیوں ہوتا ہے؟:

''قدیم زمانہ کی بات ہے، جب چین کے رہنے والے اکثر دیکھا کرتے تھے کہ اژدہا یا کوئی دیو پیکر جانور آسمان میں نمودار ہوتا تھا جو سورج کو نگلنے کی کوشش کرتا نظر آتا تھا۔ چینی عوام سورج کو اس آفت سے بچانے کے لیے ڈھول پیٹتے یا سنکھ پھونکتے تھے۔ یہ حالت کبھی تو جلدی اور کبھی قدرے دیر میں ختم ہو جاتی تھی۔

وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے شور مچا کر سورج کو بچالیا ہے۔ دراصل یہ سورج گرہن تھا جو خود بخود ختم ہو ہی جاتا ہے۔ کتنے ہی ایسے واقعات اور کیفیات مثلاً طوفان، خشک سالی، سیلاب یا اچھی بارش اور اچھی فصل کا ہونا ظہور میں آئے جنہیں زمانہ قدیم کے انسان قدرت کا قہر یا عذاب الٰہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ ان عذابوں سے بچنے کی خاطر یا خدا کے حضور میں اظہار تشکر کے طور پر عبادت گاہیں تعمیر کرتے یا جانوروں کی قربانیاں دیتے، نیز اُن دیوتاؤں کے حضور میں سر جھکاتے تاکہ وہ اپنے بندوں پر رحم کرتے رہیں۔

اسی زمانے میں ایسے انسان بھی موجود تھے جو اپنے اطراف کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے اور جو کچھ نظر آتا اس کا سبب جاننے کی کوشش کرتے۔ اس کوشش کے نتیجے میں ان کے ذہن میں دو سوال پیدا ہوتے تھے، جن کی ابتداء 'کیوں' اور 'کیسے' سے ہوتی تھی۔ وہ سوچتے کہ 'سورج کیوں طلوع ہوتا ہے اور کیوں ڈوب جاتا ہے؟' یا 'بارش لانے والے بادل کیوں گرجتے ہیں؟' یہی ہمارے اوّلین سائنسداں تھے۔ سائنسی ذہن و دانش کی نشوونما کے لیے لازم ہے کہ چاروں طرف بکھرے ہوئے قدرت کے 'عجائبات' کو سمجھیں اور اس کے سربستہ رازوں سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کرتے رہیں اور یہ ان کے لیے ایک چیلنج تھا، جس کو ہر سائنسی ذہنیت نے قبول کیا۔

آج ہم سائنس کی مدد سے زیادہ تر سوالوں کے جواب تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں، لیکن اب بھی کتنے ہی قدرتی طور پر واقع ہونے والے حقائق حل نہیں کیے جا سکے ہیں یا اگر حل کر بھی لیے گئے ہیں تب بھی قدرے شک کی گنجائش باقی ہے۔ ظاہر ہے کہ شک وشبہ دور کرنا از حد ضروری ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ بعض بڑے سمندروں میں کہیں کہیں چشمے ملتے ہیں جن کی وجہ سے موسم میں تبدیلی ہوا کرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ لاکھوں برس پہلے بیحد بڑے رینگنے والے جانور (Reptiles) ڈائنو سارس (Dinosaurs) کیوں اور کیسے صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹ گئے؟ انسان آج اس کوشش میں سرگرداں ہے کہ فضائے بسیط (Space) اور اپنی دُنیا کے وجود اور ارتقاء کو پورے طور پر سمجھ لے لیکن ابھی تک سائنسدانوں کو مکمل کامیابی نہیں ملی۔ چنانچہ ہم مجبوراً ہر ایسے وقوع کو حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیتے ہیں۔ مثلاً زمین کی کشش یا بجلی کا وجود یا انسانی ذہنوں کے الگ الگ طور پر کام کرنے کے طریقے ایسے مظاہر ہیں۔ یہ ایک لمبی فہرست ہے، اسی لیے عموماً ان سے چشم پوشی کرنے میں فی الحال مضر ہے۔'' (بحوالہ مضمون 'قدرت کے پُراسرار حقائق' مصنف بلقیس موسوی، علی گڑھ شائع رسالہ ''سائنس کی دنیا'' نئی دہلی، شمارہ اپریل۔ جون 2011)

اب سوال یہ ہے کہ یہ چاند گرہن اور سورج گرہن کیوں ہوتے ہیں؟

''قدیم زمانے کے لوگوں نے ان گرہنوں کے مشاہدوں سے یہ نتیجہ نکالا کہ سورج، چاند اور زمین یہ تینوں خلائی اجرام 18 سال 11 مہینوں کے بعد اُسی حالت میں واپس آجاتے ہیں۔ اس لیے وہ ان کی پیش گوئیاں کرنے لگے تھے لیکن دُوربین کی دریافت کے بعد یہ ہی پیش گوئیاں زمین، چاند اور سورج کے فاصلوں کے حساب کتاب کے ذریعہ ہوتی ہیں۔ دُوربین کے ذریعہ آسمانی اجسام کا مشاہدہ کیا گیا اور کئی بے بنیاد باتوں کا پردہ فاش

ہوا۔ پھر لوگوں میں آسمانی اجسام کے بارے میں دریافتوں کا سلسلہ تیزی سے جاری ہوگیا یہاں تک کہ ستاروں و دیگر آسمانی اجسام یا اجرامِ فلکی کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات سامنے آئیں:

1۔ آسمان میں تمام اجسام گول یعنی کُروی پائے گئے۔

2۔ تمام ستارے دراصل سورج پائے گئے اور وہ ننھے ننھے اس لیے نظر آتے ہیں کیونکہ وہ ہماری زمین کی سطح سے کروڑوں کلومیٹر دور ہیں اور ٹمٹماتے ہوئے اس لیے نظر آتے ہیں کہ سب کی روشنی ہماری زمین کے گرد ہوا کے غلاف میں سے گُزر کر آتی ہے۔

3۔ تمام سورج جیسے ستاروں میں ہائیڈروجن (Hydrogen) گیس جلتی ہے اور ہیلیم (Helium) گیس میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس عمل کو گداخت یا فیوژن (Fusion) کہتے ہیں۔ اسی عمل سے روشنی پیدا ہوتی ہے اور ہر قسم کی لہریں جیسے ریڈیائی لہریں، ایکسریز (X-rays) بھی اسی گداخت یا فیوژن کی وجہ سے سورج میں سے خارج ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے تمام سورج جلتی ہوئی آگ کے بہت ہی بڑے گولے جیسے ہوتے ہیں۔

4۔ تمام سورج الگ الگ سائز، عُمر اور مختلف رنگوں کے دریافت ہوئے ہیں یعنی نیلے، پیلے، لال اور سفید۔

5۔ ہمارے سورج کا رنگ پیلا ہے۔

6۔ ہمارے سورج کا اوسطاً درجۂ حرارت 550 سینٹی گریڈ پایا گیا ہے۔

7۔ ہمارے سورج کا قُطر 14,00,000 کلومیٹر پایا گیا ہے۔ جبکہ ہماری زمین یعنی کُرۂ ارض (Earth) کا قطر 12,756 کلومیٹر پایا گیا ہے۔

8۔ ہمارے سورج کا ہماری زمین کی سطح سے اوسطاً فاصلہ 14,91,00,000 کلومیٹر پایا گیا ہے۔ یہ فاصلہ آسمان میں باقی تمام سورجوں کے مقابلے میں ہماری زمین سے سب سے نزدیک پایا گیا ہے۔ اسی لیے آسمان میں باقی کے تمام ستارے رات میں نظر آتے ہیں کیونکہ اُن تمام ستاروں کی روشنیاں دن میں ہمارے سب سے نزدیکی سورج کی روشنی میں ماند پڑ جاتی ہیں۔ اس لیے یہ تمام ستارے ہمیں دن کے وقت آسمان میں دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ ہاں البتہ سورج گرہن کے وقت جب ہمارا چاند ہمارے سورج کی روشنی کو ڈھک دیتا ہے تب آسمان میں ستارے دن کے وقت دکھائی دیتے ہیں۔

9۔ ہمارا سورج اپنے محور (Axis) پر گھومتا ہوا پایا گیا ہے اور اپنا ایک چکر یا گردش (Rotation) 24.5 دنوں میں پورا کرتا ہے۔

10۔ ہماری زمین بھی گیند کی طرح گول یعنی ایک کُرہ (Sphere) کی طرح ہے اور اپنے محور پر ایک گردش 24 گھنٹوں میں (یعنی ایک رات اور ایک دن) پورا کرتی ہے علاوہ ازیں ہمارے سورج کے گرد اپنے مدار میں ایک چکر (Revolution) 365.25 دنوں میں پورا کرتی ہے جس کو آپ ایک سال کہتے ہیں۔

11۔ ہمارا چاند بھی گول ہے اور ہمارے کُرۂ ارض کا ایک قُدرتی سیارچہ پایا گیا ہے جو ہمارے کُرۂ ارض کے گرد اپنے مدار میں 27.32 دنوں میں ایک چکر پورا کرتا ہے۔

12۔ ہمارا چاند بھی اپنے محور پر 27.32 دنوں میں ایک چکر پورا کرتا ہے۔ یہ حُسنِ اتفاق ہے اور اسی لیے ہمیں ہمارے چاند کا ایک طرف کا حصہ دکھائی نہیں دیتا ہے۔

13۔ ہمارے چاند کا قُطر 3,476 کلومیٹر پایا گیا ہے یعنی

تقریباً ہمارے کُرۂ ارض کا ایک چوتھائی ہے۔

14۔ ہمارے کُرۂ ارض سے ہمارے چاند کا فاصلہ 3,84,000 کلومیٹر پایا گیا ہے۔ مندرجہ بالا فاصلوں اور سائزوں کی وجہ سے ہمارے کُرۂ ارض کی سطح سے ہمارے سورج اور ہمارے چاند تقریباً ایک ہی سائز کے دکھائی دیتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ چاند اور سورج گرہن کیا ہیں؟

آج کل گرہن کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ گرہن وہ اثر ہے جب ایک خلائی جرم کا سایہ دوسرے خلائی جرم پر پڑنے سے تیسرے جرم کی روشنی رُک جاتی ہے۔ کُرۂ ارض، سورج کے گرد مداری سفر کرتا ہے۔ یہ دونوں خلائی اجرام یعنی کُرۂ ارض اور چاند کی اپنی روشنی نہیں ہے۔ سورج (ستارہ) روشنی اور گرمی کا ایک ذریعہ ہے جس کے ذریعے رات اور دن بنتے ہیں اور چاند چمکتا ہے۔ کُرۂ ارض 23.5 درجہ اپنے عمودی محور پر جھکا ہوا ہے۔

سورج گرہن: سورج گرہن اُس وقت واقع ہوتا ہے جب چاند، کُرۂ ارض اور سورج کے درمیان اس طرح حائل ہوتا ہے کہ وہ سورج کی روشنی کو کُرۂ ارض تک پہنچنے سے روک دیتا ہے یعنی چاند کا سایہ کُرۂ ارض پر پڑنے سے دن میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اُس وقت ہم کو دن کے وقت آسمان میں ستارے دکھائی دیتے ہیں۔

چاند گرہن: چاند گرہن اُس وقت واقع ہوتا ہے جب کُرۂ ارض، چاند اور سورج کے درمیان اس طرح حائل ہوتا ہے کہ وہ سورج کی روشنی کو چاند پر پہنچنے سے روک دیتا ہے یعنی کُرۂ ارض کا سایہ چاند پر پڑتا ہے۔ کُرۂ ارض، سورج کی روشنی کو چاند پر پہنچنے سے روک دیتا ہے اور چاند پر اندھیرا ہو جاتا ہے یا پھر چاند پیلے لال رنگ کی قُرص میں بدل جاتا ہے۔

دونوں قسم کے گرہنوں کو مزید مکمل اور جُزوی گرہنوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ سورج، چاند کے مقابلہ میں 400 گُنا بڑا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سورج اور کُرۂ ارض کا درمیانی فاصلہ بھی چاند اور کُرۂ ارض کے درمیانی فاصلہ کا 400 گُنا زیادہ ہے۔ اسی لیے کُرۂ ارض کی سطح سے چاند اور سورج ایک ہی سائز کے دکھائی دیتے ہیں اور اسی وجہ سے چاند، سورج کی مکمل روشنی کو کُرۂ ارض پر پہنچنے سے روک دیتا ہے۔ جب وہ سورج اور کُرۂ ارض کے درمیان حائل ہوتا ہے تو اُس وقت چاند اپنے دو قسم کے سائے کُرۂ ارض پر ڈالتا ہے یعنی جُزوی اور مکمل۔ جُزوی سایہ ہلکا ہوتا ہے جبکہ مکمل سایہ گہرا ہوتا ہے۔

جزوی گرہن: جُزوی گرہن، کُرۂ ارض کی سطح کے اُن علاقوں سے دکھائی دیتا ہے جن علاقوں پر چاند کا سایہ پڑتا ہے۔ جُزوی گرہن میں سورج کٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جُزوی گرہن کے دوران چاند کے کچھ حصوں پر کُرۂ ارض کا مکمل سایہ پڑتا ہے اور باقی حصے پر جُزوی سایہ ہوتا ہے۔ جُزوی سایہ کے تحت چاند پیلا لال دکھائی دیتا ہے۔

مکمل گرہن: مکمل گرہن، کُرۂ ارض کی سطح کے اُن علاقوں سے دکھائی دیتا ہے جن علاقوں پر چاند کا سایہ مکمل پڑتا ہے۔ مکمل گرہن ایک گھنٹہ سے بھی زیادہ کا ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ سورج گرہن ہر ماہ نئے چاند کے نمودار ہونے پر اور چاند گرہن ہر ماہ مکمل چاند ہونے پر کیوں نہیں واقع ہوتا ہے؟

یہ اس لیے کہ چاند کے مدار کی دوسمتی سطح کُرۂ ارض کی

دو سمتی سطح کے مقابلے میں پانچ درجہ جھکا ہوا ہے۔ اسی لیے چاند زیادہ تر سورج اور کُرۂ ارض کی لائن کے یا تو اوپر ہوتا ہے یا پھر نیچے ہوتا ہے۔ اس لیے ہر ماہ چاند نمودار ہونے پر سورج، چاند اور کُرۂ ارض ایک ہی لائن میں نہیں ہوتے ہیں۔

کُسُوفِ چَنبَری (حلقہ نُما) گرہن: جب چاند، کُرۂ ارض سے بہت دور ہوتا ہے تب وہ سورج گرہن کے دوران سورج کی روشنی کو مکمل طور پر نہیں ڈھک پاتا ہے۔ اس لیے مکمل سورج گرہن کی بجائے کُسُوفِ چَنبری (حلقہ نُما) گرہن واقع ہوتا ہے اور جب چاند مکمل طور پر سورج کے سامنے ہوتا ہے تب سورج کے نُورانی کُرہ کی ایک لائن چاند کے گرد آگ کے حلقہ کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ کُسُوفِ چَنبری گرہن 12 منٹ تک دکھائی دیتا ہے۔ انگریزی کے لفظ (Annulus) کا مطلب ہے چَنبَر۔

مکمل گرہن کا اثر (کُسُوفِ چَنبَری): مکمل گرہن کے واقع ہونے سے ٹھیک تھوڑی ہی دیر پہلے یا بعد میں یعنی سورج کی روشنی کے غائب ہونے سے پہلے یا دوبارہ نمودار ہوتے وقت سورج، چاند کی قُرص پر واقع پہاڑوں کے درمیان میں سورج چمکتا ہے۔ کبھی کبھی تو بہت ہی چمکدار جگہ جو کہ کُسُوفِ چَنبری کے مانند لگتا ہے، کبھی کبھی چمکدار موتیوں کی کمان دکھائی دیتی ہے۔ یہ بائلی بیڈس کے نام سے جانی جاتی ہے۔

وارننگ: سورج گرہن یا سورج کو کبھی بھی اپنی کھلی آنکھوں یا دوربین یا بائنا کلر کے ذریعہ نہیں دیکھیں ورنہ آپ اپنی بینائی ہمیشہ کے لیے کھو سکتے ہیں۔ اس کے لیے ایک خاص قسم کا چشمہ آتا ہے جس کو سولر فلٹر ویئیونگ گوگل کہتے ہیں یا پھر دوربین پر اچھی قسم کا فلٹر لگا ہوتا ہے۔ اس کو دیکھنے کے لیے آپ ایک سورج گرہن پروجیکشن کِٹ بھی بنا سکتے ہیں۔

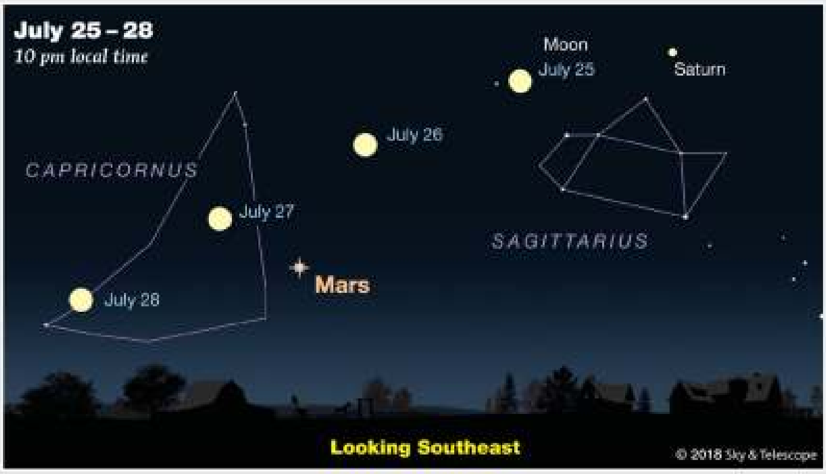

سورج گرہن اور چاند گرہن کے فائدے: برطانوی ہیئت داں جناب نورمین لوکیر (Norman Lockyer (1836-1920) نے 1868 میں مکمل سورج گرہن کے موقع پر سورج کے رنگین کُرہ (Chromosphere) میں ایک نامعلوم گیس کا پتہ لگایا تھا۔ انھوں نے اس گیس کا نام ہیلیم (Helium) رکھا جو یونانی لفظ ہیلیوس (Helios) سے لیا گیا ہے اور جس کا مطلب سورج ہے۔ 1895 تک ہمارے کُرۂ ارض کی سطح پر ہیلیم گیس دریافت نہیں ہوئی تھی۔

آرتھر ایڈینگٹن (Arthur Eddington) نے 1919 میں مکمل سورج گرہن کے دوران مشہور سائنسداں البرٹ آئین اسٹائن (Albert Einstein) کا خیال کہ دور دراز کے ستارے سورج کی کششِ ثقل (Gravity) سے متاثر ہوں گے، ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے آسمان میں سورج کے نزدیک ستاروں کے محل وقوع ناپے اور ثابت کر کے دکھایا کہ سورج گرہن نے سورج کی روشنی کو موڑ دیا ہے۔ آئین اسٹائن نے اپنا خیال اپنے ایک نظریہ اضافیت (Relativity) میں ظاہر کیا تھا۔

سورج گرہن اور چاند گرہن کے اور بھی فائدے ہیں۔ سائنسدانوں اور فلکیاتی ماہرین نے سب سے بڑا فائدہ یہ اُٹھایا کہ اُس کے ذریعہ سورج، چاند اور زمین کے قُطر کے ساتھ ساتھ اُن کے درمیانی فاصلے بھی ناپ دیے ہیں۔ اُن فاصلوں کو آج بھی آپ سورج گرہن کے عکسی کِٹ کے ذریعے سورج گرہن کے دوران تصدیق کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو سورج گرہن کے دوران سورج کا عکس کاغذ پر اُتار کر ٹرگنومیٹری کے فارمولے سے حساب لگانا ہوگا۔

اب آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ چاند گرہن اور سورج گرہن کیا ہیں اور ان کے فائدے کیا ہیں۔ لہٰذا اب آپ کو ان سے قطعاً ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ ایک قُدرتی عمل ہے اور ابتدا سے واقع ہوتے رہتے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ نہ تو قدیم زمانہ میں چاند اور سورج گرہن سے انسانی زندگی پر کوئی بھی اثر ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا۔ ہاں! البتہ اس کا مشاہدہ کرنے میں ضرور احتیاط رکھیں کیونکہ آپ کی آنکھوں کی روشنی بہت ہی نازک ہے جو کسی بھی تیز روشنی یا شعاعوں کے اثر سے فوراً زائل ہو سکتی ہے اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔ اس لیے آج کل سورج گرہن کا مشاہدہ کرنے کے لیے احتیاط اور حفاظتی طریقے بھی دریافت کر لیے گئے ہیں۔ اُن کی ہی مدد سے ان قُدرتی نظاروں کا لُطف اُٹھائیں اور کسی بھی بے بنیاد پیش گوئی، سورج گرہن یا چاند گرہن سے متعلق، پر بالکل دھیان نہ دیں بلکہ جو لوگ نہیں جانتے ہیں اُن کو بھی ان کے بارے میں بتائیں۔''

(بحوالہ کتاب 'گرہن کیا ہے؟' مصنف انیس الحسن صدیقی (ایم۔اے۔) شوقین ہیئت داں، ترمیم شدہ ایڈیشن شائع 2016 ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔6)

■

A.H. Siddiqui
679, Sector - 22B
Gurugram- 122015 (Haryana)
M:9654949434
Email: aneessiddiqui2003@gmail.com

پینٹ

Paint

ونڈوز آپریٹنگ سسٹم کے سبھی ورژن میں ایکسیسریز (Accessories) ایک ایسا پروگرام موجود ہے، جس کی مدد سے آپ اپنے کمپیوٹر پر ہی رنگ برنگی تصویریں بنا سکتے ہیں اور فنکار بن سکتے ہیں۔ اس پروگرام کا نام پینٹ برش (Paint-brush) یا پینٹ (Paint) ہے۔ یہ پروگرام حقیقت میں ڈرائنگ اور پینٹنگ سے متعلق ہے۔ اس میں مختلف اوزار (ٹول) ہیں، جن کے ذریعے آپ متعدد خوبصورت پینٹ یا رنگین تصویر بنا سکتے ہیں۔ اس باب میں اس کے بارے میں تفصیل سے پڑھیں گے۔

پینٹ شروع کرنا (Starting Paint)

یہ پروگرام ایکسیسریز کے مینو میں موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا، آپ درج ذیل طریقے سے اسے شروع کر سکتے ہیں:

1۔ اسٹارٹ بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے اسٹارٹ مینو کھل جائے گا۔

2۔ 'آل پروگرامس' کو کلک کیجیے۔ اس سے پروگراموں کا مینو کھل جائے گا۔

3۔ ایکسیسریز پر کلک کیجیے۔ اس سے ایکسیسریز کا مینو کھل جائے گا۔

4۔ ایکسیسریز کے مینو میں 'Paint' آپشن کو کلک کیجیے۔ اس سے پینٹ پروگرام شروع ہو جائے گا۔

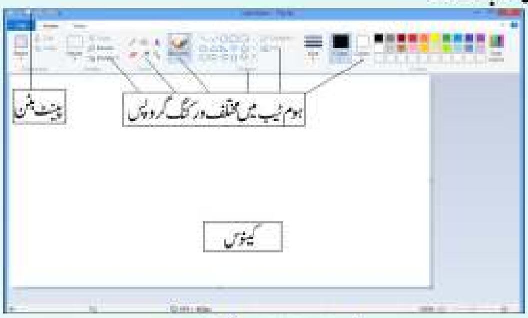

تصویر W-9.1: پینٹ کی مین ونڈو

اگر آپ کے ڈیسک ٹاپ پر پینٹ پروگرام کا شارٹ کٹ بنا ہے، تو آپ اسے ڈبل کلک کر کے سیدھے ہی اسے شروع کر سکتے ہیں۔ پروگرام شروع ہونے پر آپ کی اسکرین پر تصویر W-9.1 کی طرح پینٹ کی مین ونڈو کھل جائے گی۔ تصویر میں اس ونڈو کے مختلف حصوں کی جانب نام سے اشارہ کیا گیا ہے۔

پینٹ پروگرام میں بھی ورڈ پیڈ کی طرح ٹائٹل بار کے نیچے ربن بنا دیا گیا ہے، جس کے دو حصے ہیں۔ ہوم ٹیب (Home Tab) اور ویو ٹیب (View Tab)۔ ہوم ٹیب میں پانچ مینو دیے گئے ہیں۔ ونڈو کا باقی حصہ خالی ہوتا ہے اور اس کے سفید حصہ میں آپ تصویر بنا سکتے ہیں۔ یہ سفید حصہ جتنا بڑا ہوگا، تصویر بھی اتنی ہی بڑی بنے گی۔ اس حصے کا سائز آپ اپنی مرضی سے طے کر سکتے ہیں۔

کسی تصویر کی چوڑائی گھٹانے یا بڑھانے کے لیے سفید حصہ کے دائیں کنارے پر بالکل بیچ میں بنے نقطہ کو ماؤس پوائنٹر سے پکڑ کر بالترتیب بائیں طرف یا دائیں طرف کھینچیے اور مرضی کی جگہ پر لے جا کر چھوڑ دیجیے۔ اسی طرح تصویر کی لمبائی (یا اونچائی) گھٹانے بڑھانے کے لیے سفید حصے کے نچلے کنارے پر بیچ میں بنے نقطہ کو ماؤس پوائنٹر کے ذریعے پکڑ کر اوپر نیچے کھینچا جاتا ہے۔ اگر آپ تصویر کی لمبائی یا چوڑائی دونوں ایک ساتھ بدلنا چاہتے ہیں، تو سفید حصے کے دائیں نچلے کونے پر بنے نقطہ کو اسی طرح کسی بھی سمت میں کھینچیے اور مناسب جگہ پر لے جا کر سیٹ کر دیجیے۔

پینٹ پر کام کی شروعات (Getting Started with Paint)

پینٹ پروگرام شروع کرنے اور بنائی جانے والی تصویر کا سائز طے کر لینے کے بعد آپ اس پر کام شروع کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہوم ٹیب میں پانچ مینو کے بٹنوں/آئیکانس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ نیچے دیے گئے مینو اہمیت کے مطابق لکھے گئے ہیں:

تصویر W-9.2: ہوم ٹیب میں Tools مینو

1۔ **Tools مینو:** اس میں دیے گئے سبھی بٹن/آئیکان تصویر کی شکل بنانے، اس میں رنگ بھرنے، اسے ہٹانے، اس میں متن (ٹیکسٹ) لکھنے وغیرہ سے متعلق ہیں۔

- **پینسل** (Pencil): اس ٹول کی مدد سے آپ مختلف موٹائی کی لکیریں اسی طرح کھینچ سکتے ہیں، جس طرح پینسل کے ذریعے تصویر بنائی جاتی ہے۔
- **رنگ بھرو** (Fill with Color): اس ٹول کی مدد سے آپ کسی بھی تصویر میں من چاہا رنگ بھر سکتے ہیں۔
- **ٹیکسٹ** (Text): اس ٹول کی مدد سے آپ اپنی تصویر میں کسی بھی جگہ پر ٹیکسٹ لگا سکتے ہیں۔
- **ربڑ** (Eraser): اس ٹول کے ذریعے آپ تصویر کا کوئی بھی حصہ اسی طرح مٹا سکتے ہیں، جس طرح پینسل کے ذریعے بنائی گئی تصویر ربڑ کے ذریعے مٹائی جاتی ہے۔

- **رنگ اٹھاؤ** (Pick Color): اس ٹول کے ذریعے تصویر پر سے اٹھا کر کسی رنگ کو چن سکتے ہیں۔

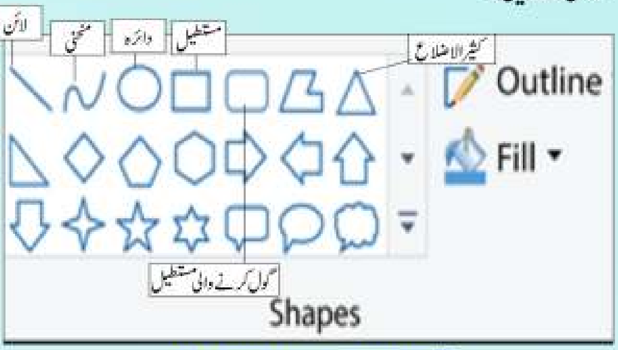

تصویر W-9.3: ہوم ٹیب میں Shapes مینو

- **میگنی فائر** (Magnifier): اس ٹول کی مدد سے آپ تصویر کو دوگنا، تین گنا وغیرہ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔

2۔ Shapes **مینو**: اس مینو میں دیے گئے آپشنز کے ذریعے آپ مختلف قسم کی شکلیں بنا سکتے ہیں۔

- **لائن** (Line): اس ٹول کی مدد سے آپ مختلف موٹائی کی سمپل لائن کھینچ سکتے ہیں۔
- **مسطتیل** (Rectangle): اس ٹول کے ذریعے آپ کسی بھی سائز کی مستطیل یا مربع (Square) بنا سکتے ہیں۔
- **گول گونے والی مستطیل** (Rounded Rectangle): اس ٹول کے ذریعے ایسی مستطیل بنا سکتے ہیں، جس کے کونے گولائی لیے ہوئے ہوں۔
- **کثیرالاضلاع** (Polygon): اس ٹول کے ذریعے کثیرالاضلاع بنا سکتے ہیں۔
- **بیضوی** (Ellipse): اس ٹول کی مدد سے آپ کسی بھی سائز کے بیضوی دائرے بنا سکتے ہیں۔

اسی طرح سے آپ اور بھی پہلے سے طے شدہ شکلوں کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اس مینو میں Outline اور Fill آپشن کے ذریعے آپ یہ بھی طے کر سکتے ہیں کہ شکل کے احاطہ (باؤنڈری) اور اس کے اندر کس طرح کے برش کے ذریعے رنگ کیا جائے گا۔

3۔ Colors **مینو**: پینٹ پروگرام میں کسی بھی وقت دو رنگوں کا سلیکشن ہوا ہوتا ہے۔ آپ جو بھی خطوط یا لکیریں، شکلیں وغیرہ بناتے ہیں یا رنگ بھرتے ہیں، تو ان پر وہی

تصویر W-9.4: ہوم ٹیب میں Colors مینو

رنگ لاگو ہوتا ہے۔ رنگ کا انتخاب کرنا بہت آسان ہے۔ اس کے لیے رنگوں کی پٹی میں دو من پسند رنگوں کو کلک کر دیجیے۔ چنے ہوئے رنگ اس پٹی کی بائیں جانب دکھائے جاتے ہیں۔ ماؤس کے دائیں یا بائیں کلک سے آپ دونوں رنگوں کا استعمال کر سکتے ہیں۔

لکیروں کی موٹائی چننا (Selecting Line Width)

پینٹ میں آپ جو شکلیں بناتے ہیں یا لکیریں کھینچتے ہیں، ان کی موٹائی آپ پہلے طے کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی بھی شکل چنیے اور پھر Shapes مینو کے بعد سائز (Size) ڈراپ ڈاؤن بٹن کو کلک کیجیے۔ پل ڈاؤن مینو کھل جائے گا۔ آپ ان میں کسی بھی آپشن کو کلک کر کے اس موٹائی کی لکیریں کھینچ سکتے ہیں۔ آپ کے ذریعے چنی ہوئی موٹائی آگے بنائی جانے والی سبھی شکلوں پر لاگو ہوگی، جب تک کہ آپ اسے بدل نہیں دیتے۔

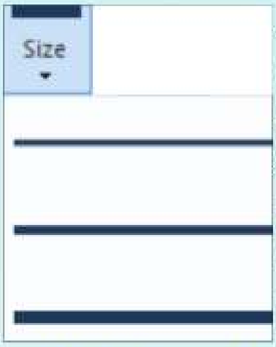

تصویر W-9.5: لکیروں کی موٹائی چننا

برش کا استعمال (Using Brush)

برش کا استعمال کر کے آپ کسی بھی شکل کے کسی بھی حصے میں من چاہا رنگ بھر سکتے ہیں۔ Brushes ڈراپ ڈاؤن مینو کلک کرنے پر ایک مینو کھلتا ہے، جس میں مختلف قسم کے برش کے آپشن دیے گئے ہیں جیسے کہ ایئر برش، آئل پینٹ برش، کریان (Crayon)، مارکر (Marker)، رنگین پینسل، واٹر کلر برش وغیرہ۔ آپ ان میں سے کوئی بھی آپشن چن سکتے ہیں۔ برش کے انتخاب کے بعد نوک کی موٹائی چننے کے لیے سائز (Size) ڈراپ ڈاؤن مینو (تصویر W-9.5) کا استعمال کریں۔ آپ کے ذریعے چنی گئی موٹائی یا پہلے سے چنی گئی موٹائی الٹے رنگ میں نظر آتی ہے۔ برش چننے کے بعد اس رنگ کا بھی انتخاب کر لیجیے، جس کو آپ بھرنا چاہتے ہیں۔

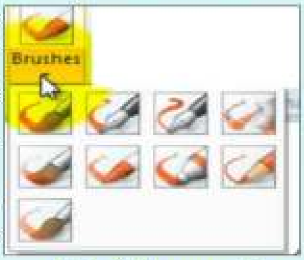

تصویر W-9.6: مختلف قسم کے برش

اب ماؤس پوائنٹر کو بنیادی جگہ پر لے جائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے کرسر کی شکل بدل گئی ہے۔ اب آپ جہاں جہاں رنگ بھرنا چاہتے ہیں، اس کرسر کو وہاں وہاں لے جا کر ماؤس بٹن کو سرکائیے۔ جب تک ماؤس بٹن دبا رہے گا، تب تک کرسر کی جگہ پر رنگ بھرتا رہے گا۔ ماؤس بٹن چھوڑ دینے پر رنگ نہیں بھرا جائے گا۔ اس طرح آپ کہیں بھی، کوئی بھی رنگ بھر سکتے ہیں۔

4۔ Image **مینو**: اس میں دیے گئے بٹنوں کے ذریعے آپ سفید حصہ (کینوس) پر لگی تصویر کا انتخاب کر سکتے ہیں اور چنی ہوئی تصویر کو کسی بھی زاویہ سے گھما سکتے ہیں یا اس کا

تصویر W-9.7: ہوم ٹیب میں Image مینو

تصویر W-9.8: تصویر کا سائز چننے کے آپشن

سائز بدل سکتے ہیں۔تصویر کا انتخاب پورا ہو یا کسی مستطیل حصہ کا ہو یا کسی بھی سائز کا ہو، اس کے لیے Select ڈراپ ڈاؤن مینو میں آپشن دیے جاتے ہیں۔

- **فری فارم سلیکٹ** (Free-form Select): اس ٹول سے آپ تصویر کا کوئی بھی اور کسی بھی سائز کا حصہ چن سکتے ہیں۔
- **مستطیل انتخاب** (Rectangular Select): اس ٹول سے آپ تصویر کا صرف مستطیل حصہ چن سکتے ہیں۔

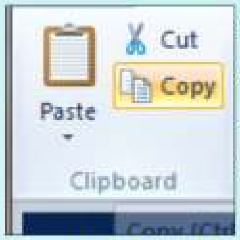

تصویرW-9.9: ہوم ٹیب میں Clipboard مینو

5۔ **Clipboard مینو**: اس مینو میں دیے گئے بٹنوں کے ذریعے آپ اپنے کمپیوٹر میں کسی بھی اسٹور کی گئی تصویر کو تلاش کر کے یہاں پینٹ کے سفید حصہ (کینوس) پر لگا سکتے ہیں اور پھر اس تصویر یا اس کے کسی بھی حصہ کو دیے گئے ٹولس کے ذریعے ٹھیک کر سکتے ہیں۔

آگے ہم ان میں سے ٹولس کے استعمال کے بارے میں تفصیل سے بتائیں گے۔ بقیہ کے بارے میں آپ خود مشق کر سکتے ہیں۔ کسی وقت آپ جس ٹول کو کلک کر کے چن لیتے ہیں، آگے اسی ٹول سے متعلق کام کر سکتے ہیں۔

سیدھی لائنیں کھینچنا (Drawing Straight Lines)

سیدھی لائنیں کھینچنے کے لیے پہلے لائن ٹول یا بٹن کو کلک کر کے چن لیجیے اور لائن کی موٹائی بھی طے کر لیجیے۔ اس کے ساتھ ہی رنگ بھی چن لیجیے۔ اب بنیادی علاقے میں پوائنٹر اس جگہ پر کلک کیجیے، جہاں سے لائن شروع ہوگی اور پھر ماؤس پوائنٹر کو لائن کے دوسرے سرے پر لے جا کر کلک کر دیجیے۔ اس سے آپ دیکھیں گے کہ ان دونوں جگہوں کے درمیان ایک سیدھی لائن بن گئی ہے۔ اگر آپ دوسری بار کلک کرتے وقت شفٹ کنجی کو دبا لیتے ہیں، تو سیدھی لکیریں صرف افقی (Horizontal)، عمودی (Vertical) اور 45 ڈگری کے زاویہ پر جھکی ہوئی بنائی جا سکتی ہے۔

مستطیل اور مربع بنانا (Drawing Rectangle and Square)

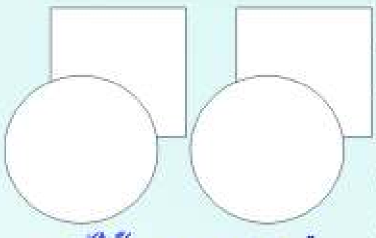

تصویرW-9.10: پینٹ میں بنائی گئی شکلیں

مستطیل بنانے کے لیے پہلے Shapes مینو میں مستطیل ٹول کو کلک کیجیے۔ اب ماؤس پوائنٹر کو اس نقطہ پر لے جا کر ماؤس بٹن کو دبا لیجیے، جہاں آپ مستطیل کا ایک کونا رکھنا چاہتے ہیں۔ اب ماؤس بٹن کو دبائے رکھ کر پوائنٹر کو کھینچتے ہوئے اس نقطے پر لے جا کر چھوڑ دیجیے، جہاں آپ مستطیل کا سامنے والا کونا رکھنا چاہتے ہیں۔ ماؤس پوائنٹر کو کھینچتے ہوئے آپ کو مستطیل بنتی ہوئی دکھائی دے گی۔ ماؤس بٹن چھوڑ دینے پر آپ دیکھیں گے ان دونوں نقطوں کے بیچ ایک مستطیل بن گئی ہے۔

مربع بنانے کے لیے اوپر کا کام کرتے وقت شفٹ کنجی کو بھی دبائے رکھتے ہیں اور پہلے ماؤس بٹن کو، پھر شفٹ کنجی کو چھوڑتے ہیں۔ اگر آپ شفٹ کو پہلے ہی چھوڑ دیں گے، تو مربع صحیح نہیں بنے گا۔ تصویر W-9.10 میں پینٹ پروگرام کے ذریعے بنائی ہوئی ایک مستطیل اور ایک مربع دکھایا گیا ہے۔

گول کونے والی مستطیل اور مربع بنانے کا طریقہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اس میں مستطیل ٹول (Rectangle Tool) کی جگہ پر گول مستطیل ٹول (Rounded Rectangle Tool) کو چنا جاتا ہے۔

بیضوی اور دائرہ بنانا (Drawing Ellipse and Circle)

بیضوی بنانے کے لیے پہلے Shapes مینو میں Ellipse مینو کو کلک کیجیے۔ اب جہاں آپ بیضوی بنانا چاہتے ہیں، وہاں ایک ایسی مستطیل کا تصور کیجیے، جو اس بیضوی کو پوری طرح گھیر لے۔ ماؤس پوائنٹر کو اس تصوراتی مستطیل کے کونے پر لے جا کر ماؤس بٹن کو کلک کر کے پکڑ لیجیے اور اسے کھینچتے ہوئے اس خیالی مستطیل کے سامنے والے کونے تک لے جا کر چھوڑ دیجیے۔ ایسا کرتے ہوئے بیضوی بنتا ہوا دکھائی دے گا۔ ماؤس بٹن چھوڑ دینے پر آپ دیکھیں گے کہ ان دونوں نقطوں کے بیچ بڑے سے بڑا بیضوی بن گیا۔

دائرہ بناتے وقت بھی اوپر کام کیے جاتے ہیں، لیکن اس کے لیے شفٹ کنجی کو دبائے رکھا جاتا ہے۔ ماؤس بٹن چھوڑتے وقت شفٹ کنجی دبی ہوئی ہونی چاہیے۔

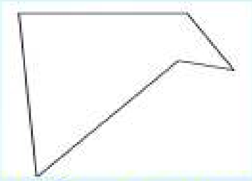

تصویرW-9.11: پینٹ میں بنایا ہوا کثیر الاضلاع

تصویر W-9.10 میں پینٹ پروگرام کے ذریعے بنایا گیا ایک دائرہ اور ایک بیضوی بھی دکھایا گیا ہے۔

کثیر الاضلاع بنانا (Drawing Polygon)

کثیر الاضلاع بنانے کے لیے پہلے Shapes مینو میں کثیر الاضلاع ٹول کو کلک کیجیے۔ اب کسی نقطہ سے شروع کر کے ماؤس بٹن کو دبائے رکھ کر کھینچتے ہوئے کثیر الاضلاع کا ایک ضلع (سائڈ) بنائیے۔ اب اگلی سائڈ بنانے کے لیے ماؤس پوائنٹر کو کسی نقطہ پر لے جا کر کلک کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ پہلی سائڈ کے دوسرے نقطہ سے اس نقطے تک ایک سائڈ بن گئی ہے۔ اسی طرح کلک کرتے ہوئے آخری سائڈ کو چھوڑ کر سبھی سائڈ بنا لیجیے۔ آخری سائڈ بنانے کے لیے کثیر الاضلاع یا کسی اور ٹول کو کلک کر دیجیے۔ اس سے کثیر الاضلاع پورا ہو جائے گا۔

تصویر W-9.11 میں پینٹ پروگرام کے ذریعے بنایا ہوا ایک کثیر الاضلاع دکھایا گیا ہے۔

شکلوں میں رنگ بھرنا (Filling Colors in Shapes)

کسی شکل میں رنگ بھرنا بہت ہی آسان ہے۔ اس کے لیے پہلے رنگ بھرو (Fill Color) ٹول کو کلک کیجیے۔ اس سے بنیادی علاقہ میں آپ کے پوائنٹر کی شکل بدل جائے

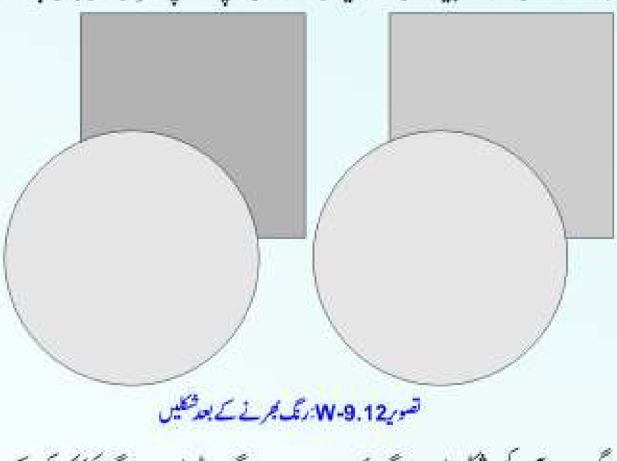

تصویرW-9.12: رنگ بھرنے کے بعد شکلیں

گی۔ اب آپ کسی شکل میں جو رنگ بھرنا چاہتے ہیں، رنگ پٹی میں اس رنگ کو کلک کر کے چن لیجیے۔ اب ماؤس پوائنٹر کو اس شکل میں کہیں لے جا کر کلک کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ فوراً ہی وہ شکل آپ کے چنے گئے رنگ سے بھر گئی ہے۔

اس طرح آپ الگ الگ رنگوں کا انتخاب کر کے شکلوں کو الگ الگ رنگوں سے بھر سکتے ہیں، جیسا کہ تصویر W-9.12 میں دکھایا گیا ہے۔

یہاں یہ دھیان دینا ضروری ہے کہ کسی شکل میں رنگ بھرتے وقت وہ شکل چاروں طرف سے کسی لکیر کے ذریعے بند ہونی چاہیے، یعنی اس کی سرحدی لائن (Boundary) کہیں سے بھی ٹوٹی ہوئی یا کھلی ہوئی نہیں ہونی چاہیے، ورنہ رنگ شکل سے باہر بہہ کر پوری تصویر میں پھیل جائے گا۔

ٹیکسٹ جوڑنا (Adding Text)

آپ اپنی تصویر میں کسی بھی جگہ پر کوئی بھی ٹیکسٹ جوڑ سکتے ہیں۔ اس کے لیے

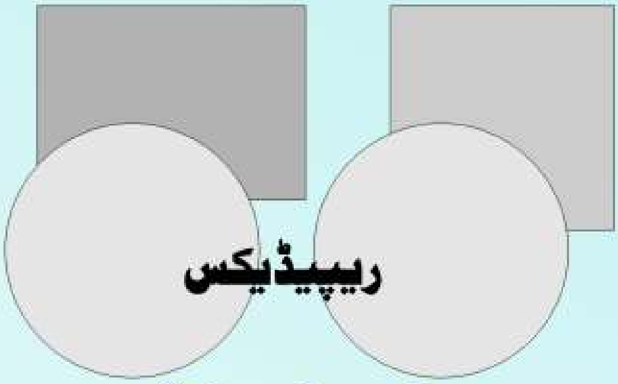

تصویر W-9.13: ٹیکسٹ جوڑنے کے بعد شکلیں

پہلے Tools مینو میں ٹیکسٹ ٹول کو کلک کیجیے۔ اب تصویر میں اس جگہ پر ماؤس پوائنٹر دبا کر کھینچتے ہوئے ایک مستطیل باکس بنائیے، جہاں آپ ٹیکسٹ یا متن جوڑنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ٹیکسٹ کا فارمیٹنگ بار (Formatting Bar) کھل جائے گا۔

فارمیٹنگ بار میں بھرے جانے والے ٹیکسٹ کا روپ (Font)، سائز (Size) اور اسٹائل (Style) طے کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی رنگ پٹی میں کلک کر کے مناسب رنگ کو چن لینا چاہیے۔ اب ٹیکسٹ ٹائپ کرنا شروع کیجیے۔ ٹیکسٹ پورا ہو جانے کے بعد اگر اور بھی ٹیکسٹ ڈالنا ہو، تو ماؤس پوائنٹر سے اس باکس سے باہر کہیں کلک کیجیے، ورنہ کوئی دوسرا ٹول کلک کر کے ٹیکسٹ ٹول سے نکل جائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ مستطیل باکس غائب ہو گیا ہے اور آپ کے ذریعے بھرا گیا ٹیکسٹ اس جگہ پر چنے گئے رنگ میں نظر آرہا ہے۔ تصویر W-9.13 میں تصویروں میں ایک ٹیکسٹ بھرا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

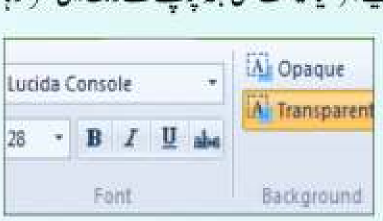

تصویر W-9.14: ٹیکسٹ کا فارمیٹنگ بار

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ ٹیکسٹ جوڑتے وقت ٹیکسٹ ٹول کو کلک کرتے ہی ربن کے Tools مینو میں تصویر W-9.14 کی طرح دو آپشن دیے جاتے ہیں، جن میں سے آپ کسی ایک کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ پہلا، غیر شفاف (Opaque) آپشن چننے پر آپ کے ذریعے جوڑا گیا ٹیکسٹ اس جگہ پر پہلے سے بنی ہوئی شے کو ہٹا دے گا۔ دوسرا، شفاف (Transparent) آپشن چننے پر پہلے سے بنی ہوئی شے بیک گراؤنڈ میں دکھائی دیتی رہے گی۔ تصویر W-9.13 میں جوڑا گیا ٹیکسٹ دوسرے آپشن کو چن کر جوڑا گیا ہے۔

ربڑ کا استعمال (Using Eraser)

تصویر یا شکل کا کوئی حصہ مٹانے کے لیے ربڑ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے پہلے ربڑ (Eraser) ٹول کو کلک کیجیے۔ اس کے بعد سائز (Size) ڈراپ ڈاؤن مینو (تصویر W-9.5) میں آپ کسی بھی سائز کو کلک کر کے چن سکتے ہیں، جس سے ربڑ کا سائز موٹا یا پتلا ہو جائے گا۔ آپ کے ذریعے چنا گیا (یا پہلے سے چنا ہوا) سائز الٹے رنگ میں دکھائی دیتا ہے۔

اب ماؤس پوائنٹر کو تصویر کے علاقے میں لے جائیے۔ وہاں اس کا روپ بدل کر چھوٹے مربع جیسا ہو جاتا ہے۔ اب اس کو تصویر کے اس حصے پر لے جائیے، جسے آپ مٹانا چاہتے ہیں۔ اب ماؤس بٹن کو دبائے رکھ کر اس پوائنٹر کو احتیاط سے تصویر کے اس حصے پر سرکائیے، جسے آپ صاف کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک ماؤس بٹن دبا رہے گا، تب تک ربڑ کا کام کرے گا۔ ماؤس بٹن چھوڑ دینے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس طرح ماؤس بٹن کو دبا کر پوائنٹر کو کھینچتے ہوئے آپ تصویر کا کوئی بھی حصہ صاف کر سکتے ہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ پینٹ میں کوئی شکل یا تصویر کا کوئی حصہ بن جانے کے بعد نہ تو آپ اسے سرکا سکتے ہیں اور نہ ہی اس کا سائز گھٹا بڑھا سکتے ہیں۔ آپ صرف 'Undo' ہدایت کے ذریعے (جو Ctrl کنجی اور U کنجی ایک ساتھ دبانے پر ایکٹو ہوتا ہے) اس کو پوری طرح ہٹا سکتے ہیں۔ یہ ہدایت بھی پچھلی زیادہ سے زیادہ تین چیزوں پر اثر دار رہتی ہے۔ Undo کے علاوہ ربڑ ٹول کے ذریعے ہی تصویر کا کوئی حصہ مٹایا جا سکتا ہے۔

تصویر کو محفوظ کرنا (Saving the Picture)

ونڈوز کی دیگر فائلوں کی طرح آپ پینٹ پروگرام کے ذریعے بنائی گئی تصویر کو بھی ایک فائل کے طور پر محفوظ کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے پینٹ بٹن کلک کر کے پل ڈاؤن مینو میں 'Save' یا 'Save As' ہدایت دیجیے۔ پہلی بار یہ ہدایت دینے پر آپ کو پچھلے ابواب کی طرح 'Save As' کا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔

اس ڈائیلاگ باکس میں اوپر والے لسٹ باکس میں فولڈر کا نام بھرا یا چنا جاتا ہے اور 'File Name' کے ٹیکسٹ باکس میں فائل کا نام بھرا جاتا ہے، جو شروع میں 'Untitled' ہوتا ہے۔ مناسب نام بھر کر اور 'Save' بٹن کو کلک کر کے تصویر کو محفوظ کر سکتے ہیں۔

جس طرح سے کسی ٹیکسٹ دستاویز کے کئی فائل ایکسٹینشن ہوتے ہیں، اسی طرح کسی شکل یا تصویر کے بھی کئی فائل ایکسٹینشن ہوتے ہیں۔ کچھ اہم اور مشہور ایکسٹینشن ہیں۔ BMP, PNG, TIFF, JPEG وغیرہ۔ تصویر کو اسٹور کرتے وقت آپ ان میں سے کوئی بھی ایکسٹینشن چن سکتے ہیں۔

تصویر کو چھپوانا (Printing the Picture)

جس طرح آپ ورڈ پیڈ میں بنائی گئی دستاویزوں، مکتوبات وغیرہ کو اپنے پرنٹر پر چھپواتے ہیں، اسی طرح پینٹ میں بنائی گئی تصویروں کو بھی چھپوایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے پہلے پینٹ بٹن کلک کر کے پل ڈاؤن مینو میں 'Page Setup' ہدایت دیجیے، جس سے آپ کو پیج سیٹ اَپ کا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔ اس میں کاغذ کا سائز، حاشیہ وغیرہ طے کر لیجیے اور پرنٹر پر اسی طرح کا کاغذ لگا کر پرنٹر کو آن کر لیجیے۔

اب مینو میں '.....Print' ہدایت دیجیے، جس سے آپ کو 'Print' کا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔ چھپائی شروع کرنے کے لیے اس ڈائیلاگ باکس میں Print بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے آپ کی تصویر پرنٹر پر چھاپ دی جائے گی۔

■

بہ شکریہ: ریپیڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

مغرب میں تنقید کی روایت

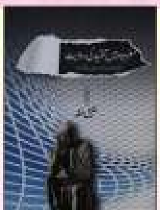

مصنف: عتیق اللہ

صفحات: 568، قیمت: 245 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: حقانی القاسمی، شاہین باغ، نئی دہلی 25

پروفیسر عتیق اللہ بین علومی نقاد ہیں۔ مغربی و مشرقی ادبیات، تحریکات، رجحانات، میلانات پر ان کی گہری نظر ہے۔ انھوں نے اردو تنقید کو بہت سی نئی جہتوں اور زاویوں سے بھی روشناس کرایا ہے۔ ماحولیاتی تنقید کی نظری اور اطلاقی صورتوں کی تلاش کا شمار ان کی اوّلیت میں کیا جا سکتا ہے۔ نئے جہانِ افکار کی جستجو ان کے مزاج میں شامل ہے۔ ان کی تنقیدی تحریروں میں تازگی اور توانائی کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے زاویے بھی روشن ہوتے ہیں جن سے عموماً اردو والے نا آشنا ہیں۔

'مغرب میں تنقید کی روایت (قدیم یونان و روم سے دریدا تک)' بھی ان کی ذہنی جستجو کا ایک نیا جزیرہ ہے۔ اس کتاب کے ذریعے انھوں نے اس سرچشمے سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے جس سے اردو تنقید کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ یہ حقیقت کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ اردو تنقید نے مغربی تنقیدی اصول و نظریات سے کسبِ نور کیا ہے اور اردو تنقید کی شعریات وضع کرنے میں مغرب سے ہی مدد لی گئی ہے۔ اردو تنقید کا اوّلین منشور 'مقدمہ شعر و شاعری' (خواجہ الطاف حسین حالی) بھی مغربی تنقیدی اصول سے ہی ماخوذ ہے اور اردو کے جدید تنقیدی مباحث اور ڈسکورس میں بھی اب زیادہ تر حوالے مغربی ناقدین کے ہی آتے ہیں خاص طور پر جدید اور مابعد جدید تنقیدی نظریات و اصطلاحات بیشتر مغربی تنقید سے ہی مستعار ہیں۔ اردو کی نظری اور اطلاقی تنقید میں بھی مغربی معیارِ نقد کو ہی مدِ نظر رکھا جاتا ہے اس لیے اردو تنقید کی روایت، منہج اور طریقِ کار کو سمجھنے کے لیے مغرب کی تنقیدی روایت کا ادراک اور اس کی تفہیم ضروری ہے مگر المیہ یہ ہے کہ اردو میں مغربی تنقید کی روایت کے حوالے سے کوئی مستند اور مبسوط کتاب نہیں ہے۔ ایسی صورت میں طلبا اور اساتذہ کے لیے ایک ایسی کتاب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی جس میں مغرب کی تنقیدی روایت سے آگہی کی کوئی صورت سامنے آئے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اسی ضرورت کے تحت یہ کتاب تشکیل دی ہے اور مغرب میں تنقید کی قدیم و جدید روایت، رجحانات، رویے اور جدید تنقیدی مباحث پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ خاص طور پر ساختیات، پس ساختیات، ردِ تشکیل جیسے تنقیدی مباحث پر انھوں نے اپنی کتاب میں بہت مبسوط اور معروضی انداز میں گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں جن مباحث اور موضوعات کو شامل کیا ہے وہ آج کے تناظر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ مغرب میں تنقید کی روایت اور رویوں کو سمجھے بغیر اردو تنقید میں کوئی پیش رفت ممکن نہیں ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اس موضوع پر کتاب تحریر کرتے وقت انگریزی کی ان اہم کتابوں کو اپنے سامنے رکھا ہے جن سے مغرب کی تنقیدی روایت، رویے، رجحانات اور افکار و تصورات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

پروفیسر عتیق اللہ کی یہ کتاب گیارہ ابواب پر محیط ہے۔ پہلا باب 'مغرب میں شعریات کا باب اوّل' کے عنوان سے ہے۔ اس میں انھوں نے شعریات کی توضیح کرتے ہوئے شعریات کو شاعری کی تخلیقی گرامر قرار دیا ہے۔ ہیومر، پنڈار وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے پانچویں صدی قبل مسیح کے زبانی ادب کے حوالے سے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ اس کی کوئی منظم شعریات نہیں تھی صرف اشارات ہیں جن سے اس عہد کے تنقیدی ذہن کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اسی باب میں افلاطون اور ارسطو کے تنقیدی نظریات کے حوالے سے بھی بحث کی ہے اور افلاطون کے شعر مخالف نظریے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ افلاطون شاعری سے اس لیے کد رکھتا ہے کہ اس کی اساس تخیل یا محض نقل پر ہے۔ ارسطو کے شعری نظریے پر بھی انھوں نے بحث کی ہے۔ ان کے قاری اساس تصور یعنی نظریہ کیتھارسس کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے نظریات کے حوالے سے بہت عمدہ بحث ہے۔ چونکہ افلاطون اور ارسطو دونوں ہمارے تنقیدی مباحث میں

شامل رہتے ہیں اس لیے ان دونوں کے نظریات سے آگہی اردو کے ناقدین کے لیے ضروری ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ نے دوسرے باب میں اطالوی/رومی ادب وتنقید کو اپنا موضوع بناتے ہوئے ورجل، ہوریس اور دیگر شعرا کا ذکر کیا ہے اور ہوریس کو پہلا مکمل ہیئت پسند نقاد قرار دیتے ہوئے یہ تحریر کیا ہے کہ اس کے خیالات پر یونانی شعریات کا گہرا اثر تھا۔ شاعری کے تعلق سے بھی اس کے مخصوص نظریات تھے۔ تقابلی تنقید کے بنیاد گزار کوئن ٹلین کے بارے میں انھوں نے تفصیلی بحث کرتے ہوئے بڑی اہم بات لکھی ہے کہ اسی نے تقابلی ادب کو ایک معیار دینے کی کوشش کی اور اس کی شعریات کا بنیادی موضوع خطابت اور اسلوب کے تعلق سے کچھ امور تھے۔ رومانی تنقید کا بنیاد ساز لانجائنس کے نظریات پر بھی انھوں نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

تیسرے باب میں انھوں نے قرونِ وسطیٰ اور دانتے کے حوالے سے تفصیلی بحث کی ہے۔ دانتے کے تعلق سے انھوں نے لکھا ہے کہ اس نے گو کہ لاطینی زبان کو مردہ قرار دیا تھا لیکن اس کے کلاسیکی ادب کا زبردست معترف تھا۔ دانتے نے مقامی زبان میں 'طربیہ خداوندی' جیسا شاہکار لکھ کر یہ ثابت کیا کہ ورناکیولر میں بھی زبردست اظہار کی قوت ہے۔ مقامی زبان کی عظمت کے حوالے سے یہ باب بہت اہمیت کا حامل ہے۔

عہد نشاۃ الثانیہ پر پروفیسر عتیق اللہ نے چوتھے باب میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اسے تجدید کی سمت اقدامِ اوّل قرار دیا ہے۔ اس باب کے ذیل میں انھوں نے سرفلپ سڈنی، بین جانسن جیسے اہم نقادوں کے تصورات اور نظریات پر بحث کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ سرفلپ سڈنی نے اپولوجی فار پوئٹری میں شاعری کا دفاع کرتے ہوئے نشاۃ الثانیہ کی اصل روح کو کسب کرنے کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ ان کے مطابق سڈنی شاعری کو تضیع اوقات نہیں بلکہ انسانوں کو نیکی کی طرف مائل کرنے والی شے قرار دیتا ہے۔ بین جانسن جیسے ڈراما نگار، شاعر اور نقاد پر گفتگو کرتے ہوئے انھیں انگریزی ادب کی تاریخ کا ایک تخلیق کار ہی نہیں اہم نقاد کہا ہے اور ان کے افکار و نظریات کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔

کتاب کا پانچواں باب نوکلاسیکی تنقید سے متعلق ہے۔ اس میں انھوں نے نوکلاسیکی تنقید کے خد و خال پر روشنی ڈالتے ہوئے جوزیف ایڈیسن، الیگزینڈر پوپ، ڈاکٹر جانسن، ڈرائڈن، بوالو جیسے اہم ناقدین کے نظریات سے گفتگو کی ہے اور بہت سے اہم نکات پیش کیے ہیں۔ ایڈیسن کے تعلق سے ان کا خیال ہے کہ اسی نے قاری کو ایک اہم حیثیت دی جبکہ پوپ نے کلاسیکی اصولوں کا اطلاق کیا اور جانسن نے انگریزی تنقید میں تاریخی شعور کو اہمیت دی۔ ڈرائڈن نے تنقید کو تنقید کے طور پر سنجیدگی سے لیا اور بوالو نے نوکلاسیکیت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے بوالو کے تصورِ شعر اور تصورِ زبان پر بھی فکر انگیز گفتگو کی ہے۔

چھٹے باب میں رومانیت کو انھوں نے اپنا مرکز بناتے ہوئے اِسے شعر و نقد میں ایک نئے معیار کی تلاش کا عنوان دیا ہے اور اس ضمن میں انھوں نے رومانویوں کے تصورِ تخیل پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ شیلی، لیمب، ولیم ہیزلٹ کے تصورات پر بھی گفتگو کی ہے۔ شیلی جو ایک رومانی شاعر تھا اس کا خیال تھا کہ صرف موزوں تحریر ہی شاعری نہیں ہے بلکہ نثر میں بھی شعری حسن پیدا ہو سکتا ہے۔ لیمب اور ولیم نے بھی بہت فکر انگیز تنقیدی مضامین تحریر کیے ہیں۔ ہیزلٹ کا یہ خیال ہے کہ اس کی تنقید کا مقصد محض تحسین ہے جنھیں وہ پسند کرتا ہے انھی پر قلم اٹھاتا ہے۔ اس باب میں انھوں نے رومانیت کے تصور ساز ولیم ورڈس ورتھ اور وجدان اساس فلسفیانہ تنقید کا بنیاد ساز کالرج پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

ولیم کے پوئٹک ڈکشن (Poetic diction) پر انھوں نے اچھی بحث کی ہے جس سے بہت سے ایسے نکتے سامنے آئے ہیں جنھیں آج کے عہد میں اگر بروئے کار لایا جائے تو شاعری کی لفظیات میں تبدیلی و تغیر ہی نہیں بلکہ ترقی کے امکانات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ کالرج کے تصورِ شعر پر بھی معنی خیز بحث ہے کہ یہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ناقدانہ ذہن بھی رکھتا تھا اور اسی نے رومانیت کو فلسفیانہ اساس مہیا کی ہے۔

ساتویں باب میں انھوں نے سائنسی مطالعے کے موسس چارلس آگسٹن، بینٹ بیوو اور ہپولٹ ٹین کے نظریات سے گفتگو کی ہے۔ رومانیت کے بعد مغرب کے تنقیدی نظریات میں بڑی تبدیلیاں آئیں اور بہت سے نقادوں نے پرانے تصورات سے انحراف بھی کیا۔ اسی عہد میں بینٹ بیوو ابھرتے ہیں جن کے بارے میں ایلیٹ جیسے ناقد کا یہ کہنا تھا کہ جدید تنقید کا آغاز بینٹ بیوو سے ہوتا ہے۔ اسی عہد میں ٹین بھی تھے جنھوں نے سائنسی بنیادوں پر ادب کے مطالعے کو تنقید کا صحیح منصب قرار دیا۔ یہ باب آج کے تناظر میں بہت اہم ہے کہ اب ادب اور سائنس کے رشتوں کے حوالے سے گفتگو کا آغاز ہو چکا ہے اور سائنسی بنیادوں پر ادب کی تفہیم اور تنقید کے عمل کی شروعات بھی ہو چکی ہے اور اس کے بہت مثبت اور مفید نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں۔

آٹھویں باب میں حقیقت پسندی کی شعریات پر گفتگو کی گئی ہے۔ حقیقت پسندی کے فلسفیانہ اور ادبی تصور پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے لوکاچ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ ادیب پر لازم آتا ہے کہ ہر موانعات اور خوف کو بالائے طاق رکھ کے اپنے اردگرد کی جانی ہوئی حقیقتوں کو نہایت دیانت داری کے ساتھ پیش کرے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے شیلر کی یہ رائے بھی لکھی ہے کہ حقیقت پسندی کسی کو شاعر نہیں بنا سکتی اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ چیمپ فلوری حقیقت پسندی کے نعرے سے خوش نہیں تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے حقیقت پسندی اسکول سے تعلق رکھنے والے بالزاک کا بھی ذکر کیا ہے۔

نواں باب 'عہد وکٹوریہ کی تنقید قدیم و جدید کی آویزش' کے عنوان سے ہے۔ اس عہد کی تنقیدی رو اور روش پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے نیومین، کارلائل، آرنلڈ، والٹر پیٹر اور آسکر وائلڈ کا بطور خاص ذکر کیا ہے اور ان کے تنقیدی افکار پر مبسوط روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے آرنلڈ کو تنقید کی تاریخ میں ایک ایسا اہم موڑ بتایا ہے جس کی وجہ سے تنقید میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ آرنلڈ نے ہی نہ صرف تنقید میں غیر جانب داری پر زور دیا بلکہ تہذیب، تاریخ، سیاست اور اخلاق جیسے موضوعات کو بھی تنقید میں شامل کیا۔ ٹی ایس ایلیٹ اور ایف آر لیوس پر بھی آرنلڈ کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اسی باب میں انھوں نے جمالیات جیسے تصورِ نقد کا بھی جائزہ لیا ہے اور اس ضمن میں ہیگل اور کروچے کے جمالیاتی تصورات پر روشنی ڈالی ہے۔ خاص طور پر انھوں نے جمالیات کے تھیوری ساز والٹر پیٹر کو اپنا محور بناتے ہوئے اسلوب کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ پیٹر اسلوب کی دو خصوصیات بتاتا ہے۔ ایک دماغ اساس اسلوب، دوسرا روح اساس اسلوب۔ ان دونوں اسالیب کے حوالے سے بڑی اچھی گفتگو سامنے آئی ہے۔ ایک اقتباس سے اس کی وضاحت ہو سکتی ہے:

''محض مناسب ترین لفظوں کا انتخاب یا فن پارے کی خارجی نامیاتی وحدت کسی اسلوب کو پوری ایک قوت میں نہیں بدلتی۔ اسلوب میں روح یا شخصیت کی رنگ آمیزی کے بغیر فن پارہ محض ایک چست و درست گوشت پوست کا ڈھانچہ تو ہو سکتا ہے لیکن زندگی سے عاری ڈھانچہ۔ فن کار کی شخصیت 'سانس' کی طرح اس کے فن میں غیر معمولی سرگرمی کا باعث ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے الفاظ روشن اور حیات بیز ہو جاتے ہیں۔ یہ سارا عمل روح کی سطح پر نامیاتی ہوتا ہے اس کے لیے کوئی خاص اصول متعین نہیں

ہیں۔'دماغ اساس اسلوب' کے تحت تمام اجزا کو ایک وحدت میں ڈھالا جاتا ہے جس کا تعلق فن پارے کے ڈزائن اور منصوبہ بندی سے ہے۔ روح اساس اسلوب 'اسلوب میں آدمی' Man in Style کا مظہر ہوتا ہے۔ اس طرح وہ جتنا شخصی ہوتا ہے اتنا ہی غیر شخصی بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے اس میں ہر ایک کے لیے کشش ہوتی ہے اور ہر ایک اس کی طرف رجوع ہونا چاہتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو اسے وسعت بخش کر آفاقیت سے ہم کنار کرتا یا 'انسانیت' کی روح سے سرشار کرتا ہے۔ حقیقت اساس اسلوب اور روح اساس اسلوب مل کر خیال اور اظہار میں وحدت کے موجب ہوتے ہیں نیز کسی بھی فن پارے کی کاملیت اور عظمت کا راز بھی خیال و اظہار کی ہم آہنگی میں مضمر ہے۔''

دسویں باب میں پروفیسر عتیق اللہ نے بیسویں صدی میں قدیم و جدید شعریات، تصادم اور ادغام پر بحث کی ہے اور اس ذیل میں انھوں نے ان تمام تصورات کی توضیح کی ہے جو ساختیاتی شعریات اور ساختیاتی فکر سے متعلق ہیں۔ آئی اے رچرڈ کے تعلق سے لکھا ہے کہ وہ پہلا نقاد ہے جس نے ادبی تنقید کے اصولوں کا سوال اٹھایا اور یہ بھی بتایا کہ شاعری کی زبان جذباتی ہوتی ہے اور نثر کی زبان حوالہ جاتی۔ رچرڈ کے تنقیدی طریق کار پر تفصیلی گفتگو کے علاوہ ٹی ایس ایلیٹ کے تنقیدی تصورات و طریق کار بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ پیکریت اور دادائیت جیسے تحریکات و رجحانات کے خد و خال سے بھی قارئین کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مارکسی تنقید اور اس کے فکری نظام پر گفتگو کرتے ہوئے کارل مارکس کی جدلیاتی مادیت کی تشریح کی ہے۔ کارل مارکس اور فرائڈ کے تصورات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے کہ مارکس اور فرائڈ دونوں نے دنیائے ادب کو متاثر ہی نہیں کیا بلکہ بڑی حد تک اس کی قلب ماہیت کردی۔ مارکس کا تعلق سرتاسر خارج سے تھا جبکہ فرائڈ نے فرد کی اندرونی شخصیت کی طرف توجہ دی۔ اس باب میں اڈلر اور یونگ کے نفسیاتی تصورات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان ناقدین کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے ادب میں تحلیلِ نفسی کے تنقیدی طریق کار کے اطلاق کی کوششیں کی۔

گیارہویں باب میں تھیوری اور ادبی تھیوری کے ضمن میں انھوں نے ساختیات، روسی ہیئت پسندی اور ساختیاتی ردِ تشکیلی تنقید، پس ساختیات/ ردِ تشکیل، نو مارکسی تنقید، تاریخی نو تاریخی تنقید، تہذیبی مطالعے کی روایت اور نئی ترجیحات پر بحث کی ہے۔ انھوں نے تھیوری کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے علم و فہم کے بغیر ہمارا انتقاد ذہنا یتیم اور یسیر ہے۔ ساختیات کے بنیاد گزار: فردناں دی سوسیئر کے ادبی اور لسانی تصورات پر گفتگو کرتے ہوئے ساختیات کی اہمیت اور اس کے بنیادی نکات کو بھی واضح کیا ہے۔ انھوں نے ساختیاتی مفکرین میں رولاں بارتھ، لیوی اسٹراس، جولیا کرسٹیوا اور دیگر نقادوں کے حوالے سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ساختیات کی عمارت لسانیات کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ روسی ہیئت پسندی کے ذیل میں میخائل باختن کے تصورات، بیانیات اور اس کے متعلقات کے حوالے سے عمدہ بحث ہے۔ ردِ تشکیلی تنقید کے ضمن میں ژاک دریدا کے تصورات اور اردو تنقید میں ڈی کنسٹرکشن کے حوالے سے بہت اچھی بحث ہے۔ ردِ تشکیل کا سب سے بڑا نمائندہ ژاک دریدا ہے جس نے ردِ تشکیل کو صرف ادبی تنقید تک محدود نہیں کیا بلکہ دوسرے متون کی قرأت پر بھی اس کا اطلاق کیا۔ یہیں لاکاں اور فوکو کے تصورات پر بھی بہت اہم بحث ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ نام ہیں جن کے حوالے تنقیدی ڈسکورس میں شامل رہتے ہیں خاص طور پر یہ نام مابعد جدید تنقید میں بہ کثرت اور تواتر کے ساتھ استعمال میں آتے رہے ہیں۔ اس لیے مابعد جدید رجحان کو سمجھنے کے لیے ان کے تصورات کی تفہیم لازمی ہے۔ اس کے بغیر مابعد جدیدیت کی تمام شقیں واضح نہیں ہوسکتیں اور نہ ہی ساری طرفیں کھل سکتی ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ نے نو مارکسی تنقید اور تانیثی تنقید و تحریک پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور صنفی مساوات کے علم برداروں میری وال اسٹون کرافٹ، جان اسٹوارٹ مل وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ تانیثی تحریک کے حوالے سے انھوں نے بہت سی اہم تفصیلات درج کی ہیں۔ ان کے مطابق تانیثیت درج ذیل مروج کلیوں کے رد سے عبارت ہے کہ:

1- عورت بہ مقابلہ مرد کے ایک کمزور اور نازک جنس ہے۔
2- عورت اور مرد کے مابین ایسی مخصوص حیاتیاتی عضویت کی تفریق ہے جس کی بنیاد پر انھیں دو علاحدہ علاحدہ خانوں اور درجوں میں رکھا جانا ضروری ہے۔
3- مروج صنفی تقسیم کے مطابق مرد و عورت کی کارکردگی، حتیٰ کہ پیشہ ورانہ کارکردگی کے دو نمایاں درجات ہیں۔ اگر مرد کا درجہ اوّل ہے تو عورت کا دوم۔ اسی نسبت سے وہ دوسری درجے کی شہری ہوئی اور اس کی ملازمتیں، پیشے اور کام بھی مخصوص بلکہ ثانوی درجے کے ٹھہرے۔
4- اعصابی اور جسمانی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ ذہنی اور عقلی سطح پر بھی دونوں اجناس دو مختلف حدود کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسی لیے تعلیم و تربیت کے شعبے مردوں اور عورتوں کے لیے مخصوص ہیں۔
5- جذباتی، احساسی اور احساساتی سطح پر بھی دونوں کے ردہائے عمل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔
6- عورت ایک قابل رحم اور مجبور صنف ہے جسے ہمیشہ مردوں کے دستِ شفقت اور پناہ کی ضرورت ہے۔
7- مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور سماجی سطحوں پر مرد اور عورت کے حقوق و فرائض کے درجے مختلف ہیں وہ کہیں داسی ہے، کہیں کنیز، کہیں کٹھ پتلی، کہیں ملکیت، کہیں گمرو دھو، گویا وہ ایک شے commodity یا طبقے کی طرح ٹائپ ہے اور تابعداری جس کی تقدیر۔

پروفیسر عتیق اللہ نے ورجینا وولف کے مطمح نظر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''وولف نے Androgynism دو جنسیت (بہ یک وقت نر مادہ کی خصوصیت رکھنے والا) کے اس حیاتیاتی تصور پر بھی واضح طور پر روشنی ڈالی ہے جسے سب سے پہلے اساطیری ذہن نے خلق کیا تھا۔ وولف تذکیر و تانیث کے اس تصور کے منافی ہیں جس سے وحدت اور ہم آہنگی کے بجائے نفاق اور دوئی کو تحریک ملتی ہے۔ وہ ہر اس علاحدگی کے تصور کے خلاف ہیں جس کے تحت مرد و زن کی خصوصیات کو دو مختلف خانوں میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے اور علی العموم اس قسم کی درجہ بندی چند مروج اور موجود ازقبل مفروضات کا ایک تدریجی نتیجہ ہوتی ہے۔ وولف مسلسل تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ:

''غالباً وہ ذہن جو خالص تذکیری ہے، ایک خالص تانیثی ذہن کے سوا کچھ اور پیدا کرہی نہیں سکتا۔''

ورجینا وولف کے تصورات نے ادب و تنقید اور تانیثی صحافت پر گہرے اور دور رس اثرات قائم کیے ہیں۔''

پروفیسر عتیق اللہ نے تاریخی نو تاریخی تنقید، تاریخی تہذیبی مطالعے کی روایت، نئی ترجیحات پر بھی بہت عمدہ بحث کی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مغرب کے جدید قدیم تنقیدی تصورات اور افکار کی تفہیم میں یہ کتاب ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

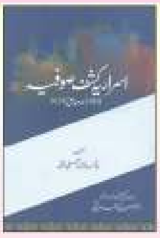

اسراریہ کشف صوفیہ

مصنف: سید محمد کمال سنبھلی

صفحات: 803، قیمت: 335 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر غلام اشرف قادری، صدر شعبۂ فارسی

گاندھی فیض کالج، شاہجہاں پور 242001 (یوپی)

ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی ہمیشہ سے ہی اردو، فارسی و عربی زبان وادبیات کی ترویج وترقی میں سرگرم رہا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی 'اسراریہ کشف صوفیہ' بھی ہے جسے سید محمد کمال سنبھلی واسطی نے تاریخی نام سے موسوم کرتے ہوئے عہد شاہجہانی میں تصنیف کی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے کیا ہے جو زیر بحث ہے۔ یہ کتاب روایتی انداز میں ایک تاریخ اور تذکرہ دونوں کی شکل میں ہے۔ جس میں تقریباً ڈھائی سو سے زیادہ اولیا واصفیا وشعرا کا ذکر ہے۔ اگر منسلکہ شخصیات کو شامل کرلیا جائے تو کم وبیش بارہ سو افراد کے احوال درج ہیں۔ مغل عہد کے جغرافیائی ہندوستان کے اعتبار سے یہ وہ حضرات ہیں کہ جنھوں نے شمالی ہند میں تصوف کی راہ میں اعلیٰ مقام ومرتبہ حاصل کیا۔ تصوف وعرفان کے رموز ونکات کے مباحث کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب سید محمد کمال سنبھلی نے اپنے پیرومرشد خواجہ عبداللہ خرد کی خواہش پر تصنیف کی۔ موصوف اس قدر زود نویس تھے کہ تقریباً چھ سو صفحات پر مبنی اس کتاب کو محض ایک سال کی قلیل مدت میں 1069ھ مطابق 1658 میں پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ واضح کردوں کہ اس سلسلے میں مصنف نے نفحات الانس، کشف المحجوب، سیرالعارفین، اخبار الاخیار، تاریخ فیروزشاہی، رسالہ قشیریہ اور فوائد الفواد جیسی درجنوں کتابوں کا مطالعہ کیا اور اسے ماخذ ومنابع گردانا۔ مشتملہ صوفیا حضرات میں بیشتر سے بہ نفس نفیس ملاقات کی اور ان سے ڈھیروں معلومات حاصل کی۔ کسی وجہ سے اگر ان سے ملاقات نہیں ہوئی تو ان کے کسی معتبر جانشین سے رابطہ کرکے احوال وکوائف کو جمع کیا۔ ان کے ملفوظات کو پڑھا پھر یہ کتاب تصنیف کی۔

اس تذکرہ میں الہ آباد سے لے کر لکھنؤ، پنجاب، گجرات، قندھار وکابل تک کے صوفیا اولیا، مجاذیب اور شعراؤ غیرہ کے حالات زندگی اور روحانی وقلمی کارنامے قلمبند کیے ہیں۔ چونکہ مصنف نے معتبر ماخذ ومنابع سے استفادہ کیا اور اولیا واصفیا سے خود بھی ملاقاتیں کیں تھیں۔ تلاش وتحقیق کے بعد اطلاعات کو جمع کیا جس کی وجہ سے کتاب کی معتبریت پر شک کی گنجائش نہیں ہے۔ ایسا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انھوں نے بعض اطلاعات ایسی بھی قلم کے حوالے کی ہیں جن سے شریعت اور طریقت دونوں کی روح مجروح ہوتی نظر آتی ہے۔ مصنف نے شاید اس لیے اس طرح کے واقعات کو نقل کیا کہ اس وقت کے صوفیانہ مدارج اور اس وقت کا صوفی رنگ وروپ واضح ہوسکے اور کسی طرح حق بیان سے روگردانی نہ ہوسکے اگر مصنف موصوف اس بیان سے احتراز بھی کرلیتے تو کسے معلوم پڑتا مگر ایسا نہیں کیا وہ یقیناً واقعات پر مصلحتاً بھی صرف نظر نہیں چاہتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے اس کتاب میں ہندو جوگیوں اور سنتوں کو بھی جگہ دی اور ہندو صوفی ازم پر روشنی بھی ڈالی۔ اتنا ہی نہیں خواتین مجاذیب اور صوفیا کو بھی اس میں شامل کیا۔ یہ تمام باتیں سید کمال سنبھلی کی منشا کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ وہ چاہتے تھے زیادہ سے زیادہ شخصیات کے حالات زندگی کے ساتھ روحانی اور قلمی مراتب کو تفصیل سے پیش کیا جائے۔

اسرار کشف صوفیا ایک طرح سے صوفیا کا انڈکس بھی ہے۔ مصنف نے بعضے شرکا کے احوال تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں نقل کردیے ہیں اور بعض شخصیات کے لیے 'جمع الجمع' کی جانب اشارہ کردیا ہے۔ شاید اس لیے کردیا ہے کہ ان سے متعلق اطلاعات کو دوبارہ نقل کرنا بے جا سمجھتے تھے۔ واضح رہے کہ جمع الجمع ان کی تصنیف کردہ کتاب ہے جو مذکورہ کتاب سے پہلے لکھی گئی تھی۔ ایسی صورت میں قاری کے 'جمع الجمع' کی اوراق گردانی لازم ہوتی ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ کتاب ناپید ہے۔ غرض قاری پر احساس تشنگی واجب ہے۔

مترجم کتاب ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسراریہ کشف صوفیہ کے تینوں نسخوں سے استفادہ، تدوین وتصحیح متن کرکے اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ یقیناً موصوف کو زبان پر قدرت ہے اور حوصلہ قلم رانی بھی۔ ورنہ اتنی ضخیم کتاب کا ترجمہ کوئی معمولی بات نہیں۔ یقیناً صدیقی صاحب کے ذہن میں تحفظ زبان اور افکار صوفیہ کی ترویج کا خیال آیا ہوگا۔ قصہ مختصر یہ کہ مترجم نے جس طرح فن ترجمہ نگاری کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کارنامے کو انجام دیا وہ لائق تحسین ہے۔ انھوں نے ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ کتاب کی اصل روح برقرار رہے اور صوفیا کے احوال بیانی اور مراتب شماری میں مصنف کے بیانات سے اختلاف نہ ہو۔ شاید اسی لیے مترجم نے اپنے مقدمہ میں یہ وضاحت کردی ہے کہ شریعت اور سنت پر کلی طور پر مطابقت نہ رکھنے والے احوال واقوال سے بدظن نہ ہوں اور ان نفوس قدسیہ کے روشن خیالات اور مفید تعلیمات سے فائدہ اٹھائیں۔ غرض مترجم نے محض مترجم کا کردار ادا کیا ہے نہ کہ شریعت وطریقت کے پیچ وخم میں الجھ کر کوئی تصحیحی واصلاحی راہ اختیار کرلی ہے۔ ہو بہو سید محمد کمال سنبھلی کی بیان کردہ اس گرانقدر کاوش کو اردو کا رنگ عطا کردیا ہے جو مترجم کا فرض عین ہے۔

روحانی تعلیمات اور اعلیٰ کردار شخصیات کے روز وشب سے فیضیاب ہونے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مناسب ہے۔ مصنف ومترجم کے ساتھ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

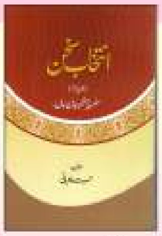

انتخاب سخن (جلد چہارم) سلسلۂ مظہر جانِ جاناں

مرتبہ: حسرت موہانی

صفحات: 315، قیمت: 155 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عبدالناصر، C-24، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

'انتخاب سخن (جلد چہارم) سلسلۂ مظہر جان جاناں' حسرت موہانی کی مرتب کردہ اردو کے قارئین کے لیے ایک ادبی میراث کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اسلاف کے اچھے کارنامے کو دنیا میں تادیر باقی رکھنے کے لیے اس کی ذمے داری آنے والی نسلوں کے کاندھے پر ہوتی ہے جو اس سے فائدہ بھی اٹھائے اور دوسروں کو اس سے استفادے کا موقع فراہم کرے۔ اس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اپنی ذمہ داریوں کو بطریق احسن ادا کررہی ہے۔

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی جو ایک عظیم شاعر، مجاہد آزادی اور صحافی بھی تھے اور انھوں نے 'اردوئے معلیٰ' کے نام سے اپنا رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ انھوں نے شعرا کے دواوین یکجا کیے۔ ان کا مطالعہ کیا اور ان کا انتخاب بطور ضمیمہ شائع کرنا شروع کردیا۔ یہ طویل کام عرصہ دراز تک چلتا رہا۔ شروع میں ان کا خیال تھا کہ یہ پانچ جلدوں

پر مشتمل ہوگا، لیکن بعد ازاں آٹھ اور آخر میں گیارہ جلدوں پر محیط یہ اپنی تکمیل کو پہنچا۔ اس میں کم و بیش 200 شعرا کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جو ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک نام کا تعلق ہے وہ حسرت موہانی کا ہی تجویز کردہ 'انتخابِ سخن' ہے۔

حسرت موہانی کا یہ کارنامہ واقعی غیر معمولی ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ اور 'بقامت کہتر و بقیمت بہتر' کی نمایاں مثال پیش کرتا ہے۔ اس میں ادبی و علمی سطح پر بھی قدیم و جدید شعرا کو جگہ ملی ہے۔ ان کے ادوار اور درجہ بندی بھی کی گئی ہے۔ مثلاً جلد اول میں سلسلۂ شاہ حاتم، جلد دوم میں سلسلہ ذوق، جلد سوم میں سلسلہ مومن اور جلد چہارم میں سلسلہ مظہر اور سلسلہ میر، درد و سوز شامل ہے۔ اس کے علاوہ ہر جلد کے دو جزو بھی مقرر کردیے گئے تاکہ قاری کو مزید آسانی ہو۔

ابھی سطور بالا میں، میں نے عرض کیا کہ جلد چہارم کے دو جزو ہیں۔ پہلے جزو میں مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کے تلامذہ کے کلام کے علاوہ اس سلسلے کے دیگر شاعر کو شامل کیا گیا جس میں حسرت، یقین، بیان، شاعر اور حزیں شامل ہیں۔ دوسرے جزو کے اہم شعرا میں میر، راسخ، میر حسن، میر درد، میر اثر، میر سوز، افسوس، امانت، لطافت، اور فصاحت شامل ہیں۔

مرزا مظہر جان جاناں کی پہچان زود گو شاعر کے طور پر ہوتی ہے۔ فارسی کے شاعر تھے لیکن ریختہ گوئی میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ متانت و سنجیدگی کے باعث ہر خاص و عام میں ان کی قدر تھی۔ آج ان کا کوئی دیوان یا مجموعہ کلام نہیں ملتا۔ البتہ عبدالرزاق قریشی نے مختلف تذکروں سے ان کا منتشر کلام یکجا کر کے 'مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام' کے نام سے شائع کردیا ہے جن میں اشعار کی کل تعداد 124 ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

چلے اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کے کارواں اپنا ــــ نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے ــــ کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

ان کے تلامذہ میں سے ایک حسرت بھی ہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

میں جدائی میں بھی دلدار سے مہجور نہیں
دل میں بستا ہے وہ آنکھوں سے مری دور نہیں

مظہر کے شاگرد رشید میں سب سے نمایاں انعام اللہ خاں یقین ہیں جن کی شعر گوئی کو استاد نے کافی نکھار دیا تھا۔ انھوں نے بہت ہی کم عمر پائی تھی پھر بھی تاریخ ادب اردو میں ان کا نام نقش ہوگیا ہے۔ ان کے کلام سے شیرینی، شگفتگی، شائستگی و لطافت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا دو شعر ملاحظہ ہو۔

کون کرسکتا ہے اس خلاق اکبر کی ثنا ــــ نارسا ہے شان میں جس کے پیمبر کی ثنا
وہ کون دل ہے جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں ــــ اس آفتاب کا کس ذرے میں ظہور نہیں

اس عہد کے ایک دوسرے شاعر خواجہ احسن الدین خاں بیان بھی ہیں جن کے کلام میں روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔ ان کا دو شعر دیکھیے۔

میری آہوں میں گر اثر ہوتا ــــ تو وہ کیوں مجھ سے بے خبر ہوتا
یار دل کو لیے ہی جاتا ہے ــــ مجھ کو بے دل کیے ہی جاتا ہے

مظہر کے ایک اور شاگرد حزیں ہیں۔ ان کے کلام میں بھی روانی پائی جاتی ہے۔ ایک شعر دیکھیے۔

نہ ہوتا اس قدر خوباں میں گر وہ تند خو نازک
تو کب ہوتی ہماری شاعری کی گفتگو نازک

کتاب کے دوسرے جزو میں جن شعرا کو جگہ ملی ہے وہ کلاسیکی عہد کے شعرا ہیں۔ ان میں سرفہرست میر تقی میر ہیں جنھیں خدائے سخن کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ مرتب بھی ان کے کلام سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے پیش نظر کتاب میں ان کے کلام کے لیے سب سے زیادہ 106 صفحات وقف کردیے ہیں۔ طوالت کے خوف سے محض ایک یا دو اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا ــــ خورشید میں بھی اس کا ہی ذرہ ظہور تھا
خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے سے ــــ معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا

راسخ بھی اسی عہد کے اعلیٰ درجہ کے شاعر ہیں۔ ایک شعر میں انھوں نے میر کے تلامذہ میں شامل ہونے کی جانب اشارہ کیا ہے۔

شاگرد ہیں ہم میر سے استاد کے راسخ
استادو ں کا استاد ہے استاد ہمارا

اگلے شاعر کی حیثیت سے میر حسن دہلوی کا نام آتا ہے جنھیں 'صاحب سحرالبیان' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ صاحب دیوان شاعر ہونے کے باوجود انھیں اردو دنیا سب سے بڑے مثنوی نگار کی حیثیت سے جانتی ہے۔ حالانکہ انھوں نے شعرائے اردو کا تذکرہ بھی لکھا ہے۔ یہاں ان کی غزل کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

صبا کے ہاتھ خط اس گلعذار کا پہنچا
خزاں رسیدوں کو مژدہ بہار کا پہنچا

اردو میں تصوف کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے حضرت خواجہ میر درد کا نام آتا ہے جو اٹھارہویں صدی میں سب سے محترم شخصیت خیال کیے جاتے تھے۔ اردو میں ان کا صرف ایک مختصر سا دیوان ہی موجود ہے لیکن اسی نے انھیں بلند ترین مقام پر فائز کررکھا ہے۔ ان کے دیوان کا پہلا شعر دیکھیے۔

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر کے کلام میں بھی تصوف کا رنگ موجود ہے۔ میر سوز کا بھی اپنا شعری امتیاز تھا۔

اس کے علاوہ دیگر شعرا میں میر شیر علی افسوس، امانت لکھنوی، لطافت لکھنوی اور فصاحت کے کلام شامل ہیں۔ ان کے کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ مائل بہ تنزل ہیں۔ پھر بھی خوبیوں سے خالی نہیں۔

بہ حیثیت مجموعی 'انتخاب سخن' شائع کرانا ایک بہتر عمل ہے تاکہ شعر و ادب کی دنیا سے وابستہ لوگوں کی اپنے قدیم ادبی سرمائے سے دلچسپی برقرار رہے اور اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے ان کا مطالعہ کرتے رہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

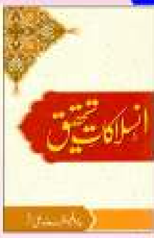

انسلاکات تحقیق

مصنف: پروفیسر محمد علی اثر
صفحات: 192، قیمت: 125 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: الانصار پبلی کیشنز، ریاست نگر، حیدرآباد
مبصر: عبداللہ مدنی، 214، مہاندی ہاسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

پروفیسر محمد علی اثر اردو ادب و تحقیق کی شش جہات شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک ممتاز محقق اور ناقد بھی ہیں۔ دکنی ادب میں ان کا قد خاصا بلند ہے۔ چالیس سالہ درس و تدریس کی طویل خدمات کے ساتھ ان کے قلم سے نکلنے والی ساٹھ سے زائد کتابوں کا عظیم سرمایہ ان کے ادبی کارناموں کا اہم حصہ ہے۔ ایک مدت سے اپنی کمزوری صحت کے باوجود موصوف اردو ادب کو صحت مند بنانے کے لیے سعی پیہم کر رہے ہیں۔ اثر صاحب کی ہر کتاب کچھ نئے انکشافات کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہے اور ان کا خورشید قلم اکثر و بیشتر نئی تحقیقی کرنوں کے ساتھ طلوع ہوتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'انسلاکات تحقیق' انھیں کرنوں کی ایک نئی روشنی ہے۔ یہ اثر کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں کل چودہ مضامین ہیں جن میں سے بعض تحقیقی نوعیت کے ہیں اور بعض تنقیدی انداز کے۔ ان مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔ (1) دکنی اردو شاعری میں قرآنی تلمیحات، (2) کلام عبداللہ قطب شاہ نئی تحقیق کی روشنی میں، (3) قطب شاہ اور اس کی نظم نگاری، (4) اردو کا پہلا نثری رسالہ اور اس کا مصنف، (5) تحقیق اور اس کے طریقہ ہائے کار، قدیم اردو کے حوالے سے، (6) حفیظ ہوشیار پوری۔ شاعر شہر محبت، (7) ڈاکٹر زور کے مرتبہ تذکرۂ مخطوطات، (8) سرسید تحریک اور علامہ شبلی نعمانی، (9) ملک محمد جوہر کی مثنوی اشتیاق نامہ، (10) رام پور کی داستانیں، (11) داستانوں میں تہذیبی عناصر، (12) اردو میں نظم نگاری کی تحریک اور انجمن پنجاب، (13) نعت گوئی میں راہی فدائی کی بصیرت (14) دکنی ادب کے فروغ میں اساتذۂ جامعہ عثمانیہ کا حصہ۔

مذکورہ بالا مضامین میں سے بعض تحقیقی مضامین دکنی ادب سے بھی متعلق ہیں، جو نہایت اہمیت کے حامل ہیں جیسے سب سے پہلا مضمون 'دکنی اردو شاعری میں قرآنی تلمیحات'۔ اس مضمون میں مصنف نے تلمیحات کی ایک کثیر تعداد کی طرف اشارہ کیا جو قرآن میں موجود ہیں اور پھر ان تلمیحات کو دکنی شاعروں کی شاعری میں تلاش کیا ہے اور مثال میں ان کے اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ یقیناً مصنف کا یہ بڑا کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں کئی ایسے اور مضامین ہیں جو مصنف کی تحقیقی صلاحیتوں کی غماز ہیں جیسے 'اردو کا پہلا نثری رسالہ اور اس کا مصنف' جس میں انھوں نے مختلف حقائق اور دلائل کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا رسالہ 'معراج العاشقین' اردو کا پہلا نثری رسالہ نہیں ہے بلکہ شاہ برہان الدین جانم کا رسالہ 'کلمۃ الحقائق' اردو کا پہلا نثری رسالہ ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ "جدید تحقیق کی روشنی میں حضرت میراجی شمس العشاق کے فرزند اکبر اور خلیفہ برہان الدین جانم دکنی اردو کے سب سے پہلے اور مستند نثر نگار ہیں۔ حضرت کے رسالے کلمۃ الحقائق کو اردو کی سب سے پہلی نثری تصنیف کا شرف حاصل ہے۔" (انسلاکات تحقیق، ص 68) اسی طرح ان کا ایک مضمون 'تحقیق اور اس کے طریقہ ہائے کار قدیم اردو کے حوالے سے' خصوصاً اردو کے ریسرچ اسکالرز کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے مگر تشنہ ہے۔ اس میں انھوں نے تحقیق کی تعریف اور اس کے مختصراً طریقہ کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماضی میں ہمارے مدونین و محققین حضرات سے جو چوک ہوئی ہے اس کا ذکر دلائل کے ساتھ کیا ہے۔ 'کلام عبداللہ قطب شاہ نئی تحقیق کی روشنی میں' یہ بھی ایک محققانہ مضمون ہے جس میں مصنف نے عبداللہ قطب شاہ کی چند نئی غزلوں، مرثیوں، رباعیوں اور ایک ریختی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے کلام کی خصوصیات پر تسلی بخش روشنی ڈالی ہے۔ مزید برآں ملک الشعرا غواصی اور عبداللہ قطب شاہ کی مخلوط غزلوں کا تقابلی مطالعہ کرکے یہ ثابت بھی کیا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کی بعض غزلیں غواصی کی ہی ہیں جو عبداللہ قطب شاہ کے دیوان میں درج ہیں۔ اس دعویٰ کی دلیل میں انھوں نے ان دونوں شاعروں کے مماثل اشعار کو ان ہی کے دیوان سے پیش کیا ہے اور اس کے کئی وجوہات بھی بیان کیے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "اس بات کا قوی امکان ہے کہ غواصی نے اعزاز و اکرام اور مالی منفعت کی خاطر اپنی غزلوں کے مقطعوں میں سلطان عبداللہ کے مزاج و طبیعت کے رجحان اور مسلک کے پیش نظر 'صدقے نبی'..... 'حیدر کے صدقے' جیسے الفاظ تخلص کی تبدیلی کے ساتھ اضافہ کر کے ان غزلوں کو عبداللہ قطب شاہ کی نذر کیا ہو"۔ (انسلاکات تحقیق، ص 47) ان مضامین کے علاوہ باقی دیگر مضامین بھی جیسے 'نعت گوئی میں راہی فدائی کی فنی بصیرت'، 'ملک محمود جوہر کی مثنوی اشتیاق نامہ' اور 'حفیظ ہوشیار پوری۔ شاعر شہر محبت' بہت معلومات افزا اور بہت ہی دلچسپ ہیں۔ 'ڈاکٹر زور کے مرتبہ تذکرۂ مخطوطات' یہ بھی ایک عمدہ مضمون ہے جس میں ڈاکٹر زور کے 'تذکرۂ اردو مخطوطات' کے پانچوں جلدوں کا مختصر اور جامع تعارف پیش کیا گیا ہے جو یقیناً کلاسیکی ادب کے شائقین کے لیے بے حد مفید ہے۔ پوری کتاب کو پڑھنے کے بعد یہی حاصل نکلتا ہے کہ 'انسلاکات تحقیق' کے ہر مضمون میں ادبی معلومات کا بیش قیمتی خزانہ پوشیدہ ہے جس کو اردو ادب کے باذوق حضرات وہاں سے نکال سکتے ہیں۔

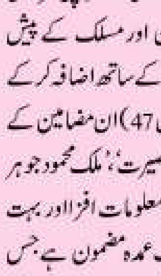

نظیری نیشا پوری۔ حیات وشاعری

مصنف: ڈاکٹر مدحت الاختر
صفحات: 222، قیمت: ندارد، سنہ اشاعت: 2017
مبصر: پروفیسر فداء المصطفیٰ فدوی
67، نائیڈو بلڈنگ، صدر منگل بازار، ناگپور، (مہاراشٹر)

ڈاکٹر مدحت مشہور جدید شاعر ہونے کے علاوہ اردو، فارسی کے مستند عالم، استاد اور ادیب ہیں۔ ان کے فارسی میں ڈاکٹر آف فلاسفی کے تحقیقی مقالے پر مبنی کتاب 'نظیری نیشاپوری۔ حیات وشاعری' ہے۔ کتاب ہذا فارسی شاعری کی تحقیق و تنقید کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔

محمد حسین نظیری نیشاپوری فارسی سبک ہندی کا عظیم شاعر ہے۔ وہ 1584 میں ہندوستان آیا۔ ترک وطن سے پہلے اس کی شاعری کی شہرت خراسان اور عراق تک پہنچ چکی تھی۔ تقریباً 30 سال تک یہاں زندگی بسر کرنے کے بعد 1614 میں بمقام احمد آباد گجرات میں اس کا انتقال ہوا۔ نظیری شہنشاہ اکبر اور جہانگیر کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا شمار فارسی کے مشاہیر شعرا میں ہوتا ہے۔ اس کی عظمت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ صائب، بیدل، غالب اور اقبال کی فارسی شاعری پر اس کے نمایاں اثرات ہیں۔ ان شعرا نے نہ صرف اس کی زمینوں میں غزلیں لکھی ہیں بلکہ اس کی شاعری سے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا ہے۔

اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت نظیری کی حیات وشخصیت اور شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں محمد حفظ الرحمن صاحب کا مرتبہ مصنف کا شناس نامہ ہے اور اس کے بعد جناب عشرت ظفر کا پر مغز مضمون 'ترانہ ہزار آہنگ' تقریظ کے بطور ہے۔ 'نظیری کی سوانح حیات' سے مقالے کا آغاز ہوتا ہے اس کے مختلف ذیلی عنوانات قائم کرکے ولادت، جائے ولادت، وطن، قیام کاشان، ورود ہندوستان، شمالی ہند اور گجرات احمد آباد میں قیام، سفرحج اور ہندوستان واپسی، مذہب ومسالک، محسن اور ممدوحین، وفات وتدفین وغیرہ بہ تفصیل جائزہ لیا گیا ہے۔ شخصیت وکردار کے عنوان سے طویل مضمون نظیری کے ذہنی ارتقاء، عزیز واقربا، اساتذہ وتلامذہ اور احباب و معاصرین پر روشنی ڈالتا ہے۔

نظیری سوانح حیات اور شخصیت وکردار کے مفصل جائزہ کے بعد نظریہ فن، مضامین شاعری، نظیری کا سبک، تدوین دیوان، حافظ اور نظیری وغیرہ عنوانات سے مضامین میں مصنف کے تحقیقی وتنقیدی جوہر بخوبی نمایاں ہوتے ہیں۔ ان مضامین کے بالاستیعاب مطالعے سے مصنف کی دقیقہ رسی، دقتِ نظری اور تحقیقی وتنقیدی سوجھ بوجھ کی تعریف و توصیف کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ اس اجمالی جائزے میں بخوف طوالت ایسے اقتباسات پیش نہیں کیے جاسکتے لیکن مطالعہ کرنے پر اہل نظر قارئین اس حقیقت کو ضرور محسوس کریں گے۔

نظیری بنیادی طور پر فارسی غزل کے صاحب طرز اہم ترین شاعروں میں سے ایک ہیں۔ ہمعصر شعراء سے موازنہ کرتے ہوئے صائب تبریزی نے غزل گوئی میں نظیری کی غیر معمولی اہمیت کا اعتراف یہ کہہ کر کیا ہے۔

صائب چہ خیال است شوی ہمچو نظیری
عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

لہٰذا اس کی غزل گوئی کا تجزیہ اس کے مضامین، شاعری، صنائع بدائع کا استعمال اور مسلسل غزلوں کے پیش نظر بڑی عمدگی سے کرکے بحیثیت غزل گو، اس کے مقام ومرتبے کا بخوبی تعین کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں قصیدہ گوئی کو شاعری کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا اور کسی شاعر کو قصیدہ گوئی کے بغیر سند اعتبار حاصل نہیں ہوتا تھا۔ نظیری نے بھی مختلف قصائد اپنے محسنوں اور مربیوں: اکبر، جہانگیر، شہزادہ مراد، خان خاناں، خان اعظم مرزا عزیز، عبداللہ خان، حاکم گجرات، وغیرہ کی مدح وستائش میں لکھے ہیں۔ جن کا مفصل تحقیقی وتنقیدی جائزہ قصیدہ گوئی کے عنوان سے لیا گیا ہے۔

مصنف نے اس کی قصیدہ گوئی کی اس خصوصیت کو اُجاگر کیا ہے کہ جن ہستیوں سے اس کو جذباتی تعلق تھا ان کی مدح وستائش کا حق ادا کردیا ہے مثال میں رسول ﷺ، خلفائے راشدین اور امام علی رضا کی مدح میں قصائد کا تذکرہ کیا ہے کہ ''وہ جب ان کی مدح میں قلم اُٹھاتا ہے تو ہر شاخ سے شگوفہ کاری کا ظہور ہوتا ہے۔ (ص 144)''۔ دیگر اصناف سخن کے تحت نظیری کے فکر سخن کا احاطہ کرتے ہوئے مراثی، رباعیات، اور قطعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ 'نظیری کی مرثیہ نگاری' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے واقعات کربلا پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا ہے۔ چھ شخصی مرثیے کلیات نظیری میں موجود ہیں:

(1) در رثائے برادر وفرزند (2) شہنشاہ اکبر کی وفات پر (3) خواجہ حسین ثنائی (دوست) (4) شہزادہ مراد کے انتقال پر (5) بیٹے نورالدین کی موت پر مرثیہ (6) دوست اور عزیز، انیسی کا مرثیہ۔

کلیات نظیری کے مطابق رباعیوں کی تعداد 137 اور قطعات تین بتائے گئے ہیں۔ رباعی گوئی میں اس کی مہارت کا ذکر کرتے ہوئے مختلف ذیلی عنوانات کے تحت چند رباعیات پیش کی گئی ہیں۔ 'تدوین دیوان' کے عنوان سے دنیا کی معروف اور اہم لائبریریوں اور کتب خانوں میں موجود نظیری کے مخطوط ومطبوعہ دواوین کے اختلافات اور اشعار کی تعداد میں کمی بیشی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تدوین دیوان کے متعلق مضمون تحقیقی اعتبار سے وقیع اور اہم ہے۔ 'حافظ اور نظیری' کے عنوان سے دونوں کا موازنہ کیا گیا ہے۔ فارسی شاعری نے خواجہ حافظ شیرازی سے بڑا دوسرا غزل گو پیدا نہیں کیا۔ نظیری کی غزل پر حافظ کے اثرات نمایاں ہیں۔ خود نظیری نے بھی حافظ کی پیروی کا اعتراف یوں کیا ہے۔

ما اقتدا بحافظ شیراز کردہ ایم
گردید معتقد ائے دوعالم کلام ما

کتاب کا آخری مضمون 'نظیری تذکروں کے آئینے میں' ہے اس میں فارسی تذکرہ نگاروں کی نظیری کے متعلق آرا پیش کی گئی ہیں۔ اس سے اس کی شخصیت اور شاعرانہ انفرادیت وعظمت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی (شعر العجم جلد سوم) اور پروفیسر نذیر احمد (رسالہ اردو ادب علی گڑھ، اکتوبر تا دسمبر 1954) نے اپنے قابل قدر مضامین میں نظیری پر تحقیقی وتنقیدی کام کو جس حد تک انجام دیا تھا اس میں کئی اہم پہلو اور جزئیات منصۂ شہود پر آنے سے رہ گئی تھیں۔ فاضل مصنف نے ان تمام کا مفصل احاطہ عہد مغلیہ کے معتبر ماخذوں، تذکروں، اور کتب تواریخ سے براہ راست استفادہ کرکے کیا ہے۔

کتاب کالجوں، یونی ورسٹیوں کی لائبریریوں اور نجی کتب خانوں میں خرید کر محفوظ رکھنے اور مطالعہ کرنے کے قابل ہے۔

مجتبیٰ حسین کی ابتدائی تین کتابیں (ایک جائزہ)

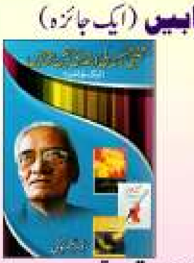

مصنف: ڈاکٹر افسر کاظمی
صفحات: 128، قیمت: -/250 روپے
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی 2
مبصر: عمران عراقی
552-B، گلی نمبر 22، ذاکر نگر، نئی دہلی 25

پیش نظر کتاب مجتبیٰ حسین کی ابتدائی تین کتابوں پر مشتمل ایک تجزیاتی مطالعہ ہے۔ جس کے ذریعے ڈاکٹر افسر کاظمی نے مجتبیٰ حسین کی طنزیہ اور مزاحیہ تحریروں کا باریک بینی سے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ تین کتابیں 'تکلف برطرف، قطع کلام اور قصہ مختصر' ہیں جو مجتبیٰ حسین کے ابتدائی مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔ ان مجموعوں میں طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے علاوہ رپوتاژ، سفرنامہ، کالم اور خاکے بھی شامل ہیں۔

کتاب کی ابتدا 'اپنی بات' کے ذریعے ڈاکٹر افسر کاظمی نے مجتبیٰ حسین سے اپنی عقیدت مندی کے اظہار اور کتاب کے وجود میں آنے کے اسباب سے کی ہے۔

یوں تو کتاب کے بیشتر حصے میں مصنف (خواہ وہ تجزیہ نگار کی حیثیت سے ہو یا ناقد کی) اپنی ہی بات کرتا ہے۔ جن میں دلائل کے پہلو باتوں کو اعتماد بھی بخشتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسی بھی کتابیں ہوتی ہیں جن میں دلائل (اقتباسات) کا پلڑا بھاری پڑ جاتا ہے۔ ایسی کتابوں کو اقتباسات کا مجموعہ کہنا کچھ غلط نہیں۔ کاظمی صاحب نے اس معاملے میں کچھ حد تک اعتدال برتنے کی کوشش کی ہے لیکن بعض جگہ غیر ضروری طور پر تنقیدی اقتباسات کو نقل کرنے میں فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ گویا انھیں خود سے زیادہ دیگر ناقدین کی آرا پر اعتماد ہو۔ شاید انھیں تمام پہلوؤں کی وضاحت کے لیے مصنف اس صفحے کا استعمال کرتا

ہے جہاں اتنی گنجائش بہر حال ہوتی ہے کہ وہ اپنی باتوں کو مختلف عناوین کے تحت ابتدائی صفحات پر درج کر سکے۔ ان صفحات میں مصنف نہ صرف کتاب کے وجود میں آنے کے اسباب پر اپنی دلیلیں پیش کرتا ہے بلکہ کتاب کی نوعیت اور اس کی اہمیت کی بھی وکالت کرتا ہے۔ گویا کتاب کو قاری کی عدالت میں پیش کرنے سے قبل ہی اس کا مقدمہ قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ اس تعلق سے مجتبیٰ حسین کیا خوب لکھتے ہیں ''پیش لفظ تو اصل میں مصنف کا معافی نامہ ہوتا ہے۔ جب کوئی کسی سے بچھڑتا ہے تو دم رخصت اپنا کہا سنا معاف کروالیتا ہے لیکن مصنف کو یہ سہولت حاصل رہتی ہے کہ وہ ملاقات سے پہلے ہی پیش لفظ میں اپنا کہا سنا معاف کروالے۔'' (ص 44)

حالانکہ یہاں مقدمہ نگار کی حیثیت سے پروفیسر بیگ احساس صاحب وارد ہوتے ہیں۔ شکر ہے بیگ احساس صاحب نے کتاب سے زیادہ مصنف اور مجتبیٰ حسین کو اپنے مقدمے کا محور بنایا ہے۔ لکھتے ہیں ''مجتبیٰ حسین ہمارے عہد کے اہم مزاح نگار ہیں۔ میرے نزدیک اردو کے چار اہم مزاح نگار سید احمد شاہ بخاری پطرس، رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین ہیں۔'' (ص 12) سہولت کے لیے کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جس کے پہلے حصے میں مصنف نے مجتبیٰ حسین کی تین کتابوں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ پہلی کتاب 'تکلف برطرف' ہے جو مجتبیٰ حسین کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کی اشاعت 1968 میں پہلی بار عمل میں آئی تھی۔ اس مجموعے میں بارہ مزاحیہ مضامین اور ایک مزاحیہ رپوتاژ شامل ہے۔ مجتبیٰ حسین نے کتاب کی ابتداء میں 'مجھ سے ملیے' عنوان کے تحت اپنا سوانحی خاکہ تفصیل سے پیش کیا ہے۔ جس کا تجزیہ پیش کرنے سے قبل مصنف موصوف نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجتبیٰ حسین کے حالات زندگی پر تفصیلی گفتگو کتاب کے آخری حصے میں شامل کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف نے یہاں مجتبیٰ حسین کے حالات زندگی کو زیر بحث لانے کے بجائے صرف ایک مختصر اقتباس پر اکتفا کیا ہے۔

'قطع کلام' مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین کا دوسرا 'قطع کلام اور قصہ مختصر' تیسرا مجموعہ ہے۔ جو 1969 اور 1984 میں بالترتیب منظر عام پر آیا۔ پہلے مجموعے کی طرح ان دونوں مجموعے کے مضامین کا بھی ڈاکٹر افسر کاظمی نے بخوبی تجزیہ پیش کیا ہے۔ مضامین کے تجزیہ کے ساتھ مجتبیٰ حسین کے فکری سرچشمے کو کاظمی صاحب نے جس انداز میں پیش کیا ہے اس کی مثال کچھ یوں ملتی ہے ''مجتبیٰ حسین نے اپنی مزاح نگاری کا محرک اور مدعا ہنسنا ہنسانا بتایا ہے۔ ہنسی کو وہ ایک مقدس فریضہ گردانتے ہیں لیکن انھیں یہ بھی احساس ہے کہ آج کے انسان کی ہنسی کبھی کبھی آنسو بن کر آنکھ سے ٹپک پڑتی ہے۔ مجتبیٰ حسین ایک حساس فنکار ہیں۔ انھوں نے زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا ہے۔'' (ص 44-45) یہ سچ ہے کہ صنعتی تحریک اور مشینی آلات نے جس طرح تہذیبی اقدار کو پامال کیا ہے اور انسان کو اپنے جال میں جکڑا ہے، ان سے نکلنا تو دور سکون کے کچھ پل تلاش کرنا بھی محال معلوم ہوتا ہے۔ ایسے میں کسی مزاحیہ تحریر میں جب ان چیزوں کا مشاہداتی اور تجرباتی احساس پرویا جاتا ہے تو ان میں طنز کے نشتر کچھ زیادہ ہی تیکھے نظر آتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے اپنی تحریروں کو اسی تیکھے نشتر سے سجایا ہے۔ جو بقول شمس الرحمن فاروقی ''اس روایت کو زندہ کیا ہے جس کا سلسلہ سودا اور میر سے لے کر پطرس بخاری تک پھیلا ہوا ہے۔'' (ص 23)

مجتبیٰ حسین نے اس روایت کو زندہ کرنے میں بسیار نویسی سے کام لیا۔ لیکن معیار اور اپنے خاص اسلوب کے ساتھ خود کی شناخت قائم کرنے میں کامیابی بھی حاصل کی۔ انھیں پہلوؤں پر مرکوز 'مجتبیٰ حسین کا اسلوب' عنوان کے تحت کتاب کا یہ دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔

کہنے کو یہ حصہ مختصر ضرور ہے لیکن جامعیت کے ساتھ تقریباً ان تمام نکات کو زیر بحث لانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، جن کی آمیزش سے مجتبیٰ حسین کی تحریر ایک خاص سانچے میں ڈھلتی ہے۔

تیسرے حصے میں مصنف نے مجتبیٰ حسین کا سوانحی خاکہ پیش کرنے کے ساتھ ان کی دیگر تصنیفات، ملک اور بیرون ملک اسفار، انعام و اعزازات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے ان کی وابستگی و دیگر سرگرمیوں کے علاوہ مجتبیٰ حسین کے فن اور شخصیت پر کیے گئے تحقیقی کام کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے۔ یہ فہرست تحقیقی نوعیت کی ہے، جو یقیناً مستقبل میں مجتبیٰ حسین پر کام کرنے والوں کے لیے کارآمد ہے۔ ڈاکٹر افسر کاظمی نے جس سلیقے سے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے اس سے مجتبیٰ حسین سے ان کی عقیدت صاف جھلکتی ہے۔

فکشن

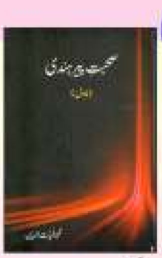

صحبت پیر ہندی (ناول)

مصنف: محمد غیاث الدین

صفحات: 208، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

مبصر: سہیم الدین خلیل الدین صدیقی

شعبۂ اردو، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد، دکن 431001

قاضی عبدالستار نے کہا تھا کہ ''اکیسویں صدی ناول کی صدی ہوگی'' اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر ہم اس دور کا جائزہ لیں تو یہ علم ضرور ہوگا کہ آج کے لکھنے والے 'ناول' کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں، موجودہ دور میں پیش آنے والے مسائل کو فکشن کے ذریعے قارئین تک پہنچانے میں نمایاں کارکردگی انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر محمد غیاث الدین صاحب کا شمار بھی اسی اکیسویں صدی کے بہترین ناول نگاروں میں ہوتا ہے، آپ 14 جولائی 1958 میں دھونسی، دربھنگا میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ گئے اور وہاں سے ہی ماہر فکشن نگار پروفیسر قاضی عبدالستار کے نگرانی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کا مقالہ فرقہ واریت اور اردو ہندی افسانے کے مسئلے پر لکھا، یہ ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز تھا۔ اب تک آپ کی ایک درجن سے زائد تصانیف و تالیف منظر عام پر آچکی ہیں، آپ نے اب تک دو ناول 'زوال آدم خاکی' اور 'عذاب دانش حاضر' لکھے ہیں، جو اردو ناول نگاری میں مقبول عام کی سند حاصل کر رہے ہیں، زیر تبصرہ ناول 'صحبت پیر ہندی' آپ کا تیسرا اہم ناول ہے، موصوف نے ناول ہی نہیں لکھے بلکہ افسانہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے، حال ہی میں اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ 'قصہ روز و شب' منظر عام پر آیا ہے، مصنف نے افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق کا کام بھی انجام دیا ہے اور ترتیب و تالیف کا بھی جس کی بہترین مثال 'آئینہ ایام' اور 'نذر قاضی عبدالستار' میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ ماہر ترجمہ نگار کی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں اور شعبۂ اردو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد میں شعبۂ اردو کے صدر کی خدمات بھی۔

زیر تبصرہ ناول 'صحبت پیر ہندی' نے اردو ناول نگاری میں ایک نئے باب کا آغاز کیا ہے۔ انھوں نے اس ناول میں کشمیر کی خوبصورت وادی، پہلگام، گلمرگ کے ٹیڑھے میڑھے راستے، گنڈولہ اسٹیشن وہاں کی آب و ہوا، بابا رشی کا مقبرہ، ڈل جھیل، سری نگر کی جامع مسجد، نسیم باغ، نشاط باغ، شالیمار باغ، یونیورسٹی، لائبریری، آسمان، زمین، ہریالی سے بھرے میدان، پہاڑ، درخت، پتھر، ندی، نالے، جھیل، چشمے، کشمیری لوگ، چنار کے

درخت، سیب کے باغ، میزبان کا گھر، کار کا ڈرائیور، پکوان اور سبزی پر تبصرہ بیان کیا گیا ناول نگار نے اپنے اس ناول میں سب سے بہترین شخص جبہ قبا والا ڈاکٹر مولانا پدوی عدنی احمد چمن عرف 'صحبت پیر ہندی' کے حال واحوال تعصب وکنجوسی، کا ذکر بڑی خوبصورتی سے پیش کی ہے، اسی کے ساتھ ایک عالم کے اقدار کے زوال کا ذکر بھی کیا ہے، اس کے علاوہ ہم اسے سفرنامہ کشمیر بھی کہیں تو کوئی غلط بات نہ ہوگی، کیونکہ اس میں 'صحبت پیر' کے ساتھ کشمیر میں گزارے ہوئے چھے دن اور اس کے علاوہ سفر میں بتائے چار دن آنے اور جانے کے ایسے کل دس دنوں کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا، اس کو سفرنامہ کہنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں کشمیر کے مناظر فطرت کی عکاسی بھی بڑی کامیابی وخوبصورتی کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ منظر نگاری، زبان وبیان، ظلم وستم، وہاں کی خوبصورتی، بدصورتی اور حقیقت پسندی کا سارا احوال بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ اس ناول کا آغاز جنگ آباد یونیورسٹی سے ہوتا ہے پروفیسر عاصم کشمیری طالب علم کو گائیڈ کرتا ہے اور اس کے کشمیری موضوع سے متعلق بحث کرتا، ان کے تحقیقی کام کے متعلق اپنی رائے پیش کرتا ہے، عاصم کے ملاقاتیوں میں مولوی چمن صاحب ہیں، جو کہ پیشے سے ایک کالج کے پروفیسر ہے، ان کا سائیڈ بزنس بھی چلتا ہے وہ کمیشن پر فلیٹ فروخت کرتے ہیں کبھی کبھی ان فلیٹوں کو سستے داموں میں خود خرید لیتے ہیں۔ اور پھر اسے دوگنے تین گنے داموں میں فروخت کر کے لاکھوں کروڑوں کماتے ہیں، انہیں سیر وسیاحت کا بہت شوق ہے، لیکن روپے پیسے خرچ کرنے میں تنگ دستی دکھاتے ہیں، وہ موقع شناس اور منجھے ہوئے کھلاڑی دونوں ہیں۔

اس ناول میں ناول نگار نے کشمیر کے ساتھ ساتھ دہلی کی جامع مسجد، مچھلی مارکیٹ، ہوٹل کا کھانا، ہوٹل کمرہ، ایئرپورٹ اور وہاں کی بھیڑ بھاڑ کا ذکر بھی بڑے خوبصورت و دلکش انداز میں کیا ہے۔ یہ ناول اس وقت کامیابی کے زینے چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے، جب ناول نگار کشمیر کے فطری مقامات کی سیر کراتا ہے، لیکن کہیں کہیں پر کرداروں کی کمی کا احساس ضرور ہوتا ہے چونکہ جہاں عاصم نے چھے دن کا طویل وقفہ گزارا ہے جہاں وہ جس کے پاس مقیم رہا ہے جس نے اس کی مدد کی ہے اس کے بارے میں دو تین اقتباس کے سوا زیادہ بحث نہیں ملتی۔ لہٰذا زیر تبصرہ ناول میں عزیز احمد کے ناول 'آگ' کی طرح چلتے پھرتے کردار ہی نہیں بلکہ جیتے جاگتے کردار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کے اس ناول میں کرداروں کی تعداد کم ہے، لیکن چند کرداروں کو چھوڑ کر فنکار نے دیگر کرداروں کو واضح نہیں کیا ہے۔ ناول نگار کے فن کی خصوصیت سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ موصوف نے اپنے ناول میں کردار کی خوبیوں وخامیوں کو بیان کرنے میں بڑے ہی اختصار سے کام لیا ہے۔

البتہ اس ناول میں فنکار نے کشمیر کی میزبانی کا تذکرہ، سیاسی حکمرانوں کے ظلم وستم کو کشمیریوں کی زبان سے ادا کروایا ہے، سیر وسیاحت کے لیے وہاں کے مناظر فطرت، باغات، جھیلیں، چشمے، ندی نالے، اونچے اونچے پہاڑوں وسبز میدانوں کا ذکر، وہاں کے تاریخی مقامات اور سماجی ماحول کی عکاسی انتہائی خوبصورت و دلکش انداز میں بیان کی ہیں، کشمیر کی منظر نگاری کو انھوں نے حقیقت نگاری کا جامہ پہنانے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے، غرض یہ کہ ناول 'صحبت پیر ہندی' میں ناول نگار نے ناول کے تمام اجزائے ترکیبی کہانی، پلاٹ، کردار، اسلوب، منظر نگاری، زبان وبیان جیسے تمام اجزاء کا خاص طور سے خیال رکھا ہے، زبان میں سادگی، شگفتگی اور شائستگی برتی گئی ہیں، لیکن کہیں کہیں پر بوریت کا احساس ہوتا ہے، اس موقع پر ناول نگار بڑی چالاکی سے وہ اپنے کرداروں کی مدد سے بہت جلد قاری کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے جس سے قاری کی اُکتاہٹ دور ہو جاتی ہے، کبھی کبھی قاری عاصم اور چمن کا ہم سفر ہو جاتا ہے، اس ناول میں کہیں کہیں ناول نگار نے روزمرہ پیش آنے والے انگریزی و ہندی الفاظ سے بھی استفادہ کیا ہے، جس سے اس ناول کی زبان بے ساختہ وآسان ہوگئی ہے اسی کے باعث یہ ناول اردو کا کامیاب ناول بن کر اُبھرتا ہے، اور پڑھنے والوں کو متحرک کرتا ہے کہ وہ بھی کم از کم ایک مرتبہ کشمیر کی سیر وسیاحت کا لطف ضرور حاصل کریں۔ لہٰذا ہم یہاں اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ اردو کے ہر قاری کے لیے سودمند ثابت ہوگا۔

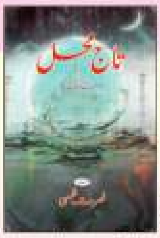

تاج محل

مصنفہ: نصرت شمسی

صفحات: 302، قیمت: 184، سنہ اشاعت: 2017

مبصر: وسیم مینائی، تارین جلال نگر، شاہجہاں پور 242001 (یوپی)

اردو ادب میں ناول، ناولٹ، افسانہ اور دیگر ادبی اصناف متعدد وجوہات اور مقاصد کے تحت وجود میں آئیں۔ ادب میں مسبوقاتی رنگ کی سخت ضرورت تھی اور یہ تبھی ممکن تھا جب فطری زندگی کے ارد گرد گھومتے مسائل اور ان کے حل سے متعلق اصناف ادب کو متعارف کرایا جائے۔ جب اس طرح کے ادب نے اپنے پیر پھیلائے تو سارا جہان اس میں سمٹ گیا اور یہی اس کی کامیابی ہے۔ آج بھی ان اصناف میں نت نئے تجربات کے ساتھ احساسات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی زیر تبصرہ کتاب 'تاج محل' ہے جو مصنفہ نصرت شمسی کے احساسات وخیالات کے ترجمان افسانے اور ناولٹ کا مجموعہ ہے۔

مغل شاہی محبت کی نشانی تاج محل دنیا کی شاہکار عمارتوں میں سے ایک ہے۔ وہ عمارت جسے دیکھنے کے لیے دور دور سے سیاح آتے ہیں اور تاج محل کے میناروں اور گنبدوں کو دیکھ کر محو تماشا ہو جاتے ہیں لیکن یہ محض ایک شاہکار عمارت ہی نہیں جس کے قصیدے ہمیشہ پڑھے جائیں۔ بنظر غائر دیکھیں تو یہ شاہجہاں اور ان کی بیگم کا ایک مقبرہ بھی ہے۔ عمارت کا خوبصورت یا عالی شان ہونا اپنی جگہ ہے مگر یہ بھی تسلیم کرنا ضروری ہے کہ یہ ایک مزار بھی ہے۔ اسی نظریہ کو سامنے رکھ کر ''تاج محل'' نام سے ایک ناولٹ لکھا جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک شاندار حویلی کی شان وشوکت کے غرور تلے انسانیت نے دم توڑ دیا۔ اور تعیش اور فراوانی کے باوجود فطری زندگی سسک سسک کر رہ گئی ہے۔ سبھی افراد خانہ کھوکھلے وقار کے سایوں میں جیتے رہے اور زندگی ریت کی طرح پھسل گئی۔ رفتہ رفتہ وراثت اور وارث دونوں کم ہو گئے یکے بعد دیگرے پانچ قبریں شاندار حویلی اور نام نہاد زندگی کو منہ چڑھانے لگیں۔ نصرت شمسی کے قلم سے یہ کہانی شاہین بیگم کی زبانی آگے بڑھتی ہے اور جیسے جیسے کہانی بڑھتی ہے حویلی کے سناٹے اور اندھیروں کے سائے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ غم واندوہ اور گھٹن بھری زندگی پر مبنی اس کہانی کا نام تاج محل رکھنا بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ یہ کہانی بہت خوبصورت ہے اس لیے اسی کہانی کے نام سے اس کتاب کو موسوم کیا گیا ہے۔

نصرت شمسی ایک خاتون قلمکار ہیں انھیں نسوانی تقاضوں اور عورتوں کی مجبور زندگی کا بخوبی اندازہ ہے، انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ ایک شریف اور بااخلاق خاتون اپنے محدود دائرے میں فطرتاً سمٹ کر رہنا چاہتی ہے اور چاہ کر بھی اپنی خواہشوں کا بیان نہیں کر سکتی، وہ گھٹ گھٹ کر تو جی سکتی ہے مگر جذبات کو زبان پر نہیں لا سکتی۔

'اگلے جنم مجھے بیٹا نہ کیجو' ایک شریف النفس خاتون کی کہانی ہے جو تصوراتی رنگ میں شروع ہوتی ہے اور حقیقت کا روپ لے لیتی ہے۔ زیب النسا کا کردار خاندانی

رشتوں کی تعظیم کا آئینہ ہے۔ وہ بابر نام کے لڑکے سے محبت کرتی ہے یہ بات کسی کو معلوم نہیں مگر اس کی ذاتی ڈائری کے سارے اوراق محبت کی داستان سے بھرے پڑے تھے۔ یہ ڈائری جب اس کے چھوٹے بھائی کو ملتی ہے اور وہ اسے پڑھتا ہے تو زار و قطار روتا ہے کیونکہ زیب النساب اس دنیا میں نہیں تھی۔

جگ ظاہر ہے کہ قلمکار اور قاری دونوں کے احساسات درد والم کے واقعات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس لیے پلاٹ اور کردار دونوں کو اس طرح تیار کرتے ہیں کہ اضطرابی احساسات دونوں جانب برقرار رہتے ہیں اس کے برعکس پر مزاح اور طربیہ واقعات زیادہ متاثر نہیں ہوتے۔

نصرت شمسی نے بھی یہی حربہ استعمال کیا ہے مگر ایک چالاک قلم کار کی طرح ان جگہوں پر جہاں قاری زیادہ مضمحل اور اداس ہونے لگتا ہے ہلکی سی خوشی کی لہر دوڑا دیتی ہیں تا کہ فضا اتنی مکدر نہ ہو جائے کہ قاری کتاب بند کر کے رکھ دے۔

اس کتاب میں سماج کی برائیوں کو اجاگر کرتے کئی افسانے مل جائیں گے۔ ایک افسانہ 'اسکالرشپ'' جو محض دو صفحات پر مبنی ہے یہ سماج، سرکاری اصول اور انسان کی بے کسی کا ایک ایسا نقشہ پیش کرتا ہے کہ قاری کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اچانک ایک باپ مجبور ہو کر سڑک پر آ کر اس وقت جان دے دیتا ہے جب اس کے بچے کی اسکالرشپ کے لیے بچے کا یتیم ہونا لازمی ہوتا ہے۔

زندگی میں بعض واقعات ایسے رونما ہو جاتے ہیں جن کا لاکھ کوششوں کے باوجود کسی طرح حل نہیں نکلتا۔ ایک خوبصورت افسانہ 'پھانسی' اسی کشمکش کا آئینہ دار ہے۔ اسی طرح 'بوجھ'، پشیمانیاں، امتحاں، فریب ذات جیسے افسانوں میں زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

'تاج محل' میں انتساب اور افسانہ نگار سے متعلق آراء کے بعد 13 افسانے اور 6 ناولٹ شامل ہیں۔ نصرت شمسی نے واقعی دل کی گہرائیوں سے کہانیوں کو بُنا ہے اور فن کی کسوٹی پر فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

الغرض نصرت شمسی ایک کامیاب افسانہ اور ناول نگار ہیں میرے خیال میں اگر وہ اپنا رجحان ناول کی طرف زیادہ رکھیں تو زیادہ کامیاب رہیں گی۔

شاعری

دوائے دل

شاعر/ ناشر: عبدالحی پیام انصاری

صفحات: 160، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2017

مبصر: ماسٹر نثار احمد

413 مین روڈ گلی نمبر 8، نئی کردم پوری شاہدرہ دہلی 94

یہ بات اچھی خاصی مشہور ہے کہ پوروا (پورب سے چلنی والی ہوا) ہوا زخموں کو ہرا کرتی ہے۔ یہ ہوا چونکہ موسمی ہوتی ہے جس کا تعلق انسان کے اعضا و جوارح سے ہوتا ہے اور ظاہری زخموں پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن دلوں سے تعلق رکھنے والی ادبی ہوا الگ پورب سے آئے تو زخم دل پر اثر ہونا بھی یقینی ہے۔ یوں تو اس طرح کی ادبی ہواؤں سے متعدد بار سابقہ پڑ چکا ہے لیکن چونکہ ان میں دوائے دل کا دعویٰ موجود نہیں تھا اور صرف ادبی گرمی تھی جس کی وجہ سے دیگر ادب نوازوں کی طرح ہم نے بھی محسوس کیا اور اپنی ادبی معلومات میں اضافہ بھی کیا لیکن فی الوقت پورب سے جو ادبی ہوا آتی ہے جو جناب عبدالحی پیام انصاری دوائے دل کے نام سے لے کر آتے ہیں اس میں دلوں کو گرمانے، زخم دل کریدنے اور ہرا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا درماں بھی موجود ہے۔ اس طرح جو دوکان بہادر شاہ کے زمانے میں بند ہو گئی تھی جس کو انھوں نے بیان کیا تھا

کوئی کیوں کسی سے لگائے دل کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

اس کو عبدالحی پیام انصاری صاحب نے پھر سے کھول دیا ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں اور جو درد دل کے مریض ہیں ان کے لیے امید کی کرن ہیں۔

عبدالحی پیام انصاری صاحب نے درد دل کے مریضوں کے لیے مختلف قسم کے نسخے تجویز کیے ہیں اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا ہے۔ پیام انصاری ایک رمز آشنا اور مزاج شناس شاعر ہیں جنھوں نے زمانے کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور جو کچھ دیکھا ہے اپنی شاعری میں اس کو برتا ہے۔ شاعری یوں تو تخیلاتی دنیا میں سیر کرنے کا نام ہے لیکن ضروری نہیں شاعر کبھی کبھی مشاہدہ اور تجربات سے بھی خوب روبرو ہوتا ہے۔ پیام انصاری صاحب کی شاعری پڑھنے سے قاری ان تمام باتوں کا مشاہدہ کھلی آنکھوں سے کرے گا۔ کیا اس سچائی سے انکار کی کوئی گنجائش ہے بغیر کسی تصنع اور بناوٹ کے آپ نے کس خوبصورتی سے سچائی بیان کی ہے۔

شکوے تمام تجھ سے غم زندگی مگر
دل میں ہزار سال ہے جینے کی آرزو

اسی کو کہتے ہیں سہل ممتنع کہ بات کو سیدھے سیدھے طور پر اس طرح بیان کر دے کہ نثر معلوم ہو۔

اگر آپ نے درد دل کا روگ پال رکھا ہے اور چاہتے ہیں کہ اس کی دوا تجویز ہو تو پیام انصاری صاحب کے مشورے سے استفادہ کیجیے کیونکہ انھوں نے اپنے تجربات کو اکثر شعری جامہ پہنا کر اور لسانی حسن سے سجا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے محو گفتگو ہیں اور تجربات زندگی بیان کر رہے ہیں اور کتابی نام کے حوالے سے بھی اسم با مسمّی کی خوبصورت تصویر پیش کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ غم بیان کرنے اور دوسروں کا درد بانٹنے سے ہلکا ہوتا ہے۔ پیام انصاری صاحب نے اس کی منظر کشی یوں کی ہے۔

آپ کے دل کی بیماری کی یہ بھی ایک دوا ہے
اپنے خول سے باہر نکلیں درد کسی کا بانٹیں

آپ کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ سلیس اور آسان زبان میں گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں یہ شاید اس لیے کہ بغیر کسی پس و پیش کے آپ اپنا پیغام قاری تک پہنچا دیں۔ ویسے یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ اکثر ادبا و شعرا اس بات کے قائل ہیں کہ سیدھی سیدھی سامنے کی بات ہونی چاہیے اور جو آپ کہنا چاہتے ہیں اس کو سمجھنے میں کسی طرح کی دشواری نہ ہو۔ بات اگر چہ درست ہے اگر صرف سلاست تک محدود ہو اور لسانی حسن برقرار رہے۔ اگر یہ نہیں تو پروفیسر محمد رضی الرحمٰن صاحب گورکھپوری کی اس بات کو میں بہت اہمیت دیتا ہوں کہ شاعری مرصع سازی کا عمل ہے اور غیر فصیح الفاظ کے استعمال کو مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مجھے نہیں معلوم پروفیسر صاحب نے غیر فصیح الفاظ کا اشارہ کس طرف کیا ہے۔ پیام انصاری صاحب کی شاعری کے حوالے سے تو میں ڈاکٹر شکیل صاحب کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ پیام انصاری صاحب نے اردو غزل کو نئی جہت سے تو نہیں نوازا مگر خودداری بلند حوصلگی اور راست گوئی کو اپنی شاعری میں بڑے حوصلے کے ساتھ برتا ہے۔ روزمرہ زندگی کے کوائف میں آزمائشوں اور آسائشوں کے کئی مراحل ہوتے ہیں۔ ایک بلند حوصلہ اور فکر سلیم کا حامل شخص ہی ان سے بخوبی نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ اپنی صالح فکر کی بنیاد پر خود بھی نپی تلی رائے قائم کر کے دوسروں کو حق آگاہی کی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔

پیام صاحب کی غزلوں میں متعدد اشعار مل جاتے ہیں جو ان کی حق نوائی اور معاملہ فہمی کی گواہی دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو چند اشعار

ناخوشگوار رشتے بھی بنتے ہیں خوش گوار
تھوڑا سا صبر چاہیے تھوڑا سا درگزر
ہم نے آخر ڈھونڈ لیا ہے خوش رہنے کا نسخہ
جتنی لمبی چادر ہو اتنے ہی پاؤں پساریں
درگزر کرنا بھی سیکھو دوستو
کس سے ...... میں نہیں ہوتی ہے ......
اس کو غم یہ ہے کہ جام اس کا ہے آدھا خالی
اور میں خوش ہوں کہ ہے آدھا بھرا جام مرا

بہر حال یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ پیام انصاری صاحب نے اپنے اشعار کے اندر بڑے پتے کی بات کہی ہے اور ایک دانشورانہ، ذمہ دارانہ اور مصلحانہ سوچ کے ساتھ لوگوں کے درمیان آئے ہیں۔ دوائے دل کے اندر کل 160 صفحات ہیں جس میں 56 صفحات دانشوران ادب کی مثبت آرا پر مشتمل ہونا یہ بڑی بات ہے جو پیام انصاری صاحب کے لیے ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ سابقہ مجموعوں کی طرح 'دوائے دل' بھی واقعی دوائے دل ثابت ہو اور ادبی دنیا میں جناب پیام انصاری کا پیام مثبت پیام ثابت ہوگا۔

رسائل و جرائد

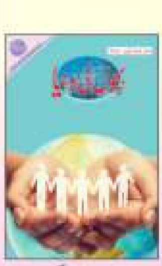

بچوں کی دنیا

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحیٔ
صفحات: 65، قیمت: 10 روپے، سنہ اشاعت: جولائی 2018
مطبع: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی
مبصر: توصیف بریلوی
ریسرچ اسکالر، ڈپارٹمنٹ آف اردو، اے ایم یو، علی گڑھ

کسی بھی زبان کی ترقی اور اس کے زندہ رہنے کا انحصار نہ صرف اس کے لکھنے اور پڑھنے والوں پر ہوتا ہے بلکہ اس زبان میں شائع ہونے والی کتابوں اور رسائل پر بھی ہوتا ہے۔ آج کا دور اردو کے انحطاطی دور سے تعبیر کیا جا رہا ہے لیکن کیا یہ صحیح ہے؟ آج بھی اردو میں کئی معیاری رسائل نکل رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ جب بچوں کے لیے معیاری اور عمدہ رسائل شائع ہو رہے ہوں تو پھر کیا کہنے۔ میری مراد ماہ نامہ 'بچوں کی دنیا' سے ہے۔ یہ بچوں میں نہ صرف اردو پڑھنے کا ذوق پیدا کرتا ہے بلکہ ان میں اچھے اخلاق و عادات موجزن کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں سائنس، کھیل کود، ماحولیات، تاریخ، جغرافیہ اور دیگر علوم ضروریہ کو سیکھنے کی طرف مائل بھی کرتا ہے۔ اس میں بچوں کو تمثیلی کہانیوں یا حکایتوں کے ذریعے نصیحت دی جاتی ہے تو کبھی قسط وار داستان یا ناول کے ذریعے۔

نظموں سے بھی نونہالوں کو اخلاق، سچ، ایمانداری اور تعلیم کا درس دیا جاتا ہے ساتھ ہی بچوں کی دلجوئی بھی ہو جاتی ہے۔ اس کے رنگین اور عمدہ اوراق دیدہ زیب ہونے کی وجہ سے چھوٹے بچوں کی توجہ اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب رہتے ہیں اور انھیں مطالعے میں دلچسپی بھی پیدا ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج انٹرنیٹ کے دور میں بھی 'بچوں کی دنیا' کی قدر و قیمت برقرار ہے۔ آیئے اب جولائی 2018 کے شمارے میں پیش کیے گئے مواد کا جائزہ لیتے ہیں:

سب سے پہلے اداریہ 'آپس کی باتیں' کے عنوان سے ہے، اس میں ماحولیات کے آلودہ ہونے، سیلاب اور طوفان سے جان مال کے نقصان پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد 'ڈاک خانہ' عنوان کے تحت تاثرات اور خطوط کو شامل کیا گیا ہے۔ شمس الاسلام فاروقی کی کہانی 'با ہمت ننھی پھدکی' بڑی اہم ہے اور مشکلات سے تدابیر کے ذریعے باہر نکلنے اور ہمت نہ ہارنے کا پیغام دیتی ہے۔

احرار حسین کا مضمون 'لیزر سرجری' اور شعیب عالم قاسمی کا مضمون 'ٹیلی گرام کیوں ضروری ہے' دونوں ہی سائنسی موضوع پر ہیں۔ نظموں میں جاوید مجیدی کی 'اتحاد'، ابرار اعظمی کی 'ہوم ورک' اور ستار فیضی کی 'کتب خانہ' اہم ہیں۔ سید پرویز قیصر کی رپورٹ 'عالمی کپ فٹ بال 2018' سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ 'چھوٹے لوگ، بڑے کارنامے' کے عنوان سے حمید ادیبی ناندوروی کا مضمون ہے جس میں سائنس دانوں، حکمرانوں، دانشوروں کا ذکر خیر ملتا ہے اور ان کے کارناموں سے آگے بڑھنے کی تحریک بھی۔ مشہور افسانہ نگار مرزا حامد بیگ کی کہانی 'ایک تھی بڑھیا' اور رؤف صادق کی کہانی 'جو ہی کی مالا' اہمیت کی حامل ہیں۔

نظموں میں 'چاند تاروں میں جاکے رہنا ہے' - قیوم اثر، 'میرا طوطا' - حنا شائم اور 'موز' - ساحر داؤ دنگری بھی خوب ہیں۔ کہانی 'ننھا بلو' - فرزانہ اسلم کی المیہ کہانی ہے۔ ندا تحریم کی نظم 'بیٹی باپ سے التجا کرتے ہوئے' بہت ہی خوبصورت ہے۔ عبدالمتین جامی کی کہانی 'گیدڑ کی موت' ایک سبق آموز کہانی ہے۔ محسن خان کی 'طوطا کہانی' با تصویر کہانی ہے جس کو خوبصورت تصاویر سے مزین کیا گیا ہے جس سے وہ مزید خوبصورت ہو گئی ہے۔

شکیل صدیقی کا ترجمہ شدہ جولز ورنے کا قسط وار ناول 'زمین کی تہہ میں' کی آخری قسط اس میں شامل ہے جو بچوں کو یقیناً متحیر کر دے گا۔ 'آئس کریم کی کہانی' - سلمیٰ یوسف حسین، معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔ 'چمن چمن کے پھول' کے تحت مختلف شعرا کے عمدہ اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ 'صبر کا پھل' - محمد سفیان غفار شیخ اور اقوال زریں - سیدہ اریبہ نایاب سید منیر الدین، نصیحت آمیز ہیں۔ 'مشہور عمارتیں' - قریشی ابو عامر حسن، دلچسپ معلومات ہے جو عام معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ امتیاز احمد الائی نے 'مفید معلومات' میں عمدہ اور دلچسپ باتیں پیش کی ہیں۔ محسن رضا نے 'ڈارون' مضمون میں اُس کے حالات زندگی سے آگاہ کیا۔ ننھی فنکارہ رمشا شیخ رئیس کی لکھی ہوئی کہانی 'احسان کا بدلہ' اور اس کے بعد پینٹنگس کی نمائش بہت اہم ہیں۔ ننھے فنکاروں کی فنکاری بچوں کے جوہر کو نکھارتی ہے اور ساتھ ہی ان میں حوصلہ بھی پیدا کرتی ہے۔ اردو فیس بک میں ماہ نامہ بچوں کی دنیا اور مختلف بچوں کی گفتگو کو شامل کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا مواد سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ 'بچوں کی دنیا' ایسا رسالہ ہے جس میں ادب کے ذریعے بہت سے علوم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے بچوں کی ذہنی تربیت بخوبی ہو سکے۔ اس کا تعلق صرف تعلیم و تعلم سے نہیں بلکہ نونہالوں کو سماج کا ذمے دار رکن بنانا بھی ہے۔ 'بچوں کی دنیا' زبان و ادب سکھانے کے علاوہ اخلاق حسنہ کا خوبصورت پیغام دیتا ہے کبھی بھی صحت مند معاشرے کے لیے بے حد ضروری ہے۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبر نامہ

اٹل بہاری واجپئی امن پسند اور معتدل رہنما تھے: کمل سنگھ

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں اٹل بہاری واجپئی کے انتقال پر تعزیتی نشست

نئی دہلی: قومی اردو کونسل میں ملک کے ہر دلعزیز رہنما اور سابق وزیر اعظم ہند آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کے انتقال پر ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس نشست میں قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر انتظامیہ جناب کمل سنگھ نے اٹل بہاری واجپئی کی رحلت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے درمیان سے ایک انمول رتن رخصت ہوگئے۔ موصوف نے واجپئی جی کی شاعری اور ان کی کتابوں کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ ان کی موت سے ملک کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ وہ امن پسند، معتدل رہنما اور بہتر قائد تھے، انھیں 'بھارت رتن' سے بھی نوازا گیا تھا، انھوں نے کہا کہ ملک کے تئیں ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

اس موقع پر اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک محترمہ شمع کوثر یزدانی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس کے علاوہ جناب شعیب رضا فاطمی نے کہا کہ آج جس صدر دفتر میں ہم انھیں خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں انھیں کے دور اقتدار میں اس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اٹل بہاری واجپئی کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اپنی خاکساری، خلوص اور دل نوازی سے ہندوستان کے بڑے بوڑھوں اور بچوں کو اپنا اسیر بنا رکھا تھا۔ ایسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ نشست میں دومنٹ کی خاموشی اختیار کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر کلیم اللہ، محمد احمد، شاہنواز محمد خرم، عبدالحی، ڈاکٹر فیروز عالم، جناب انتخاب عالم اور جناب اجمل سعید اور ڈاکٹر شاہد اختر کے ساتھ ساتھ قومی اردو کونسل کے تمام اسٹاف موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 اگست 2018

ہندوستان کی تفہیم کے لیے پریم چند کی تخلیقات کا مطالعہ ضروری: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں پریم چند کے یوم پیدائش پر ایک مذاکرہ

نئی دہلی: کسی بھی عظیم فنکار کو کسی خاص عہد یا خاص زبان کے حصار میں نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ ہر زمانے میں ان کی مقبولیت رہتی ہے اور مختلف زبانوں میں ان کے خیالات ونظریات پر خامہ فرسائی ہوتی رہتی ہے۔ منشی پریم چند کی بھی حیثیت کچھ ایسی ہی ہے کہ وہ ہر زمانے میں مقبول ہیں اور مختلف ترقی یافتہ زبانوں میں ان پر درس و تدریس کا کام بھی چل رہا ہے۔ اس حوالے سے اگر جائزہ لیا جائے تو پریم چند کی عصری معنویت جتنی ان کے عہد میں تھی آج بھی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہے۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کونسل کے صدر دفتر میں پریم چند کے 138 ویں یوم پیدائش کے موقع پر منعقدہ مذاکرے میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ پریم چند کی تخلیقات کا مطالعہ کیے بغیر ہندوستان کی تفہیم مشکل ہے۔ انھوں نے اس موقع پر پروفیسر عتیق اللہ کو حکومت مدھیہ پردیش کی جانب سے اقبال سمان سے نوازے جانے پر مبارک باد پیش کی اور کہا کہ پروفیسر عتیق اللہ اپنی علمی وادبی خدمات کے باعث اس سے بھی بڑے اعزاز کے مستحق ہیں۔ مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر گنگا پرساد ومل نے کہا کہ پریم چند ایک عظیم فنکار ہیں۔ آج بھی پریم چند کے کچھ ایسے گوشے باقی ہیں جن پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر پروفیسر اسد الدین نے بڑی پرمغز گفتگو کی۔ انھوں نے پریم چند کی 300 کہانیوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے جو پینگوئین بکس سے شائع ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترجمہ کا کام انتہائی پر خطر ہے لہٰذا ترجمہ نگار کو ہمیشہ انکساری اور عاجزی سے کام لینا چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پریم چند کا یہ کمال ہے کہ اپنے معاشرے میں رہتے ہوئے دوسری قوموں کے مسائل اور پریشانیوں کو غیر جانبداری اور ایمانداری سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے کبھی بھی ان مسائل کو عصبیت کے آئینے سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے پروفیسر عبدالبسم اللہ نے انتہائی معلوماتی گفتگو کی۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں بہت سے اہم نکات کا انکشاف کیا۔ انھوں نے کہا کہ کسی ادیب کا زمانے کے مطابق ہونا ٹھیک بھی ہے اور ٹھیک نہیں بھی ہے۔ پریم چند نے جن مسائل کو اپنی کہانیوں میں جگہ دی وہ مسائل آج بھی تازہ ہیں، بلکہ کچھ ایسے مسائل ہیں جو اُس عہد سے زیادہ شدت اختیار کر گئے ہیں۔ یہی باتیں پریم چند کی عصری معنویت کو تقویت بخشتی ہیں۔ اس موقع پر پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ پریم چند کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے تمام امکانات کو اپنی تخلیقات میں شامل کر لیا ہے اور یہ کام ایک عظیم فنکار ہی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر اسلم جمشید پوری اور سندھی کونسل کے ڈائرکٹر روی ٹیک چندانی نے بھی اظہار خیال کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 1 اگست 2018

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

تمام یونیورسٹیاں مضامین اپنی مادری زبان میں ہی پڑھائیں: وینکیا نائیڈو

نئی دھلی: نائب صدر جمہوریہ ہند ایم وینکیا نائیڈو نے

ملک کی تمام یونیورسٹیوں سے اپیل کی ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی سمیت مختلف مضامین اپنی اپنی متعلقہ مادری زبانوں میں ہی پڑھائیں۔ مسٹر نائیڈو پڈوچیری میں پڈوچیری یونیورسٹی کے طلبا اور فیکلٹی سے خطاب کر رہے تھے۔اس موقعے پر پڈوچیری کی لیفٹیننٹ گورنر ڈاکٹر کرن بیدی پڈوچیری کے وزیراعلی وی نارائن سامی اور دیگر معزز شخصیتیں موجود تھیں۔ نائب صدر جمہوریہ نے تعلیمی اداروں میں پڑھانے کے طور طریقوں میں از سر نو تبدیلی لانے کی ضرورت پر زور دیا تا کہ طلبا کی ذہانت کو اجاگر کیا جاسکے۔ انھوں نے یونیورسٹیوں کو اختراع اور تحقیق میں برتری کے عالمی مراکز میں تبدیلی کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم کو پیداوار کے ساتھ ساتھ اہلیت اور اثر پذیری بڑھانے کی بھی ضرورت ہے اور اپنے عمل کو زیادہ شفاف بنانا چاہیے اور اپنے لوگوں کی ضرورتوں پر توجہ دینی چاہیے۔ نائب صدر جمہوریہ نے 21ویں صدی کی دنیا میں انسانی وسائل کی شکل میں دستیاب سرمائے کے مضمرات کو بھرپور طریقے سے بروئے کار لانے پر بھی پر زور دیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 جولائی 2018

اردو کو ایک مذہب سے جوڑنا نقصان کی وجہ: ونکیا نائیڈو

نئی دھلی: ملک کے نائب صدر جمہوریہ ہند وینکیا نائیڈو

نے اپنی رہائش گاہ پر یونیسیف کے میڈیا مشیر و معروف صحافی ڈاکٹر مظفر حسین غزالی کی صحت و ماحولیات سے متعلق کتاب کا اجرا کیا۔ نائب صدر نے اردو زبان کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک شیریں زبان ہے اور آزادی سے پہلے سب اس زبان کا استعمال کیا کرتے تھے اور یہ زبان مجھے بہت پسند ہے۔ ڈاکٹر مظفر حسین غزالی نے 'صحت، صفائی اور ماحولیات' کے عنوان سے یہ کتاب تحریر کی ہے جو دراصل ان کے اخباری مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو ان موضوعات پر لکھے گئے ہیں جس کا اجرا نائب صدر کے بدست عمل میں آیا۔ اس موقعے پر نائب صدر موصوف نے اردو کے بارے میں فرمایا کہ وہ فرقہ واریت کا شکار ہوئی ہے اور اسے ایک مذہب سے جوڑنے کی وجہ سے کافی نقصان پہنچا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اردو کی شیرینی اور مٹھاس سے بہت متاثر ہیں جو ایک مذہب سے جوڑنے سے پہلے پورے ہندوستان میں بولی اور پڑھی جاتی تھی۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ اردو ملک کی رابطہ کی زبان تھی۔ سابق وزیراعظم اٹل بہاری واجپئی جیسے لوگوں کی ہندی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اسے سمجھنے کے لیے کئی مرتبہ ڈکشنری کھولنی پڑتی ہے لیکن اردو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ملک کی دیگر زبانوں میں ایسے موضوعات پر کم کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر غزالی نے ایک اچھا کام کیا ہے اور وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خیال رہے تقریبا دو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں 33 مضامین شامل ہیں جو صحت سے متعلق نئی قومی پالیسی سے لے کر ان موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں جن کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی اور ماحولیات سے ہے جس کے توسط سے معاشرے میں بیداری لائی جاسکتی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 جولائی 2018

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں برج کورس

نئی دھلی: اقلیتی امور کے مرکزی وزیر مختار عباس نقوی نے کہا کہ مرکزی حکومت 'مدرسوں پر تالا' نہیں بلکہ 'فارمل تعلیم کی مالا' چاہتی ہے۔ وزارت برائے اقلیتی امور اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے مشترکہ طور پر مدرسے کے طلبا اور اسکول ڈراپ آؤٹس کے لیے چلائے جارہے 'برج کورس' میں کامیاب طلبا اور طالبات کو سرٹیفکٹ تقسیم کرتے ہوئے مرکزی وزیر مختار عباس نقوی نے کہا کہ وزارت برائے اقلیتی امور کی جانب سے اسکول ڈراپ آؤٹس اور مدارس میں زیر تعلیم طلبا اور طالبات کو تعلیمی طور پر بااختیار بنانے کے لیے شروع کی گئی '3 ٹی' (ٹیچر، ٹفن، ٹوائلیٹ) مہم کو زبردست کامیابی ملی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مرکز کی مودی حکومت کی جانب سے اقلیتوں سمیت سماج کے تمام ضرورت مندوں کو تعلیمی طور پر بااختیار بنانے کی سمت میں کی گئی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج اقلیتی

مرکزی اقلیتی امور کے وزیر مختار عباس نقوی کے ذریعے سرٹی فیکٹ سے نوازے گئے طلبا

طبقے کے نوجوان مین اسٹریم کی تعلیم حاصل کر کے بہتر روزگار کے مواقع حاصل کر رہے ہیں۔نقوی نے کہا کہ گزشتہ ایک سال میں پورے ملک میں ہزاروں مدرسوں کو'3ڈی' سے جوڑا گیا ہے۔ وزارت اقلیتی امور'3ای' (ایجوکیشنل، امپلائمنٹ، امپاورمنٹ) کے عزم کے ساتھ کام کررہی ہے۔ گزشتہ تقریباً 6 ماہ میں مدارس سمیت اقلیتی طبقے کے ہزاروں تعلیمی اداروں کو'3ڈی' (ٹفن، ٹیچر، ٹوائلیٹ) سے جوڑ کر انھیں مین اسٹریم کے تعلیمی نظام میں شامل کیا گیا ہے۔ جناب نقوی نے کہا کہ کئی مدرسے فارمل تعلیم کے علاقے میں اچھا کام کر رہے ہیں۔ ہماری حکومت دیگر مدارس کی بھی حوصلہ افزائی کررہی ہے تاکہ وہ بھی مین اسٹریم کی تعلیم میں شامل ہونے میں اہم کردار ادا کریں۔ جناب نقوی نے کہا کہ ہماری کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ مسلم لڑکیوں کے اسکول چھوڑنے کی شرح جو پہلے 70-72 فیصد تھی، وہ اب تقریباً 35 فیصد ہوگئی ہے۔ ہم اسے صفر فیصد کرنا چاہتے ہیں۔ مدارس کو مین اسٹریم کے تعلیمی نظام سے جوڑنے کی مہم کے تحت وزارت اقلیتی امور نے مدرسے کے اساتذہ کے لیے بھی ٹریننگ پروگرام شروع کیا ہے۔ بڑی تعداد میں مدرسے کے اساتذہ کو وزارت اقلیتی امور کی جانب سے جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کے ذریعے منعقد ریزیڈینشیل ٹریننگ دی جارہی ہے۔ یہ اساتذہ مدرسوں میں مین اسٹریم کی تعلیم جیسے سائنس، ریاضی، کمپیوٹر، ہندی، انگریزی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ سرٹیفکٹ کی تقسیم کے لیے منعقد تقریب کے موقع پر جناب نقوی کے علاوہ وزارت اقلیتی امور کے سکریٹری جناب اے لوئی کھم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب طارق منصور، جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب طلعت احمد، گرو ہرکشن پبلک اسکول سوسائٹی کے چیئرمین جناب ایس منجیت سنگھ جی کے، دہلی ڈائسس۔ چرچ آف نارتھ انڈیا کے نمائندے بشپ کالین تھوڈور، مہابودھی انٹرنیشنل میڈیٹیشن سینٹر لیہہ۔ لداخ کے سکریٹری وین ناگ سینا، مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے سکریٹری جناب آر رحمان اور دیگر معزز حضرات موجود تھے۔

روزنامہ'میراوطن'، دہلی 2018

دھلی:

معروف افسانہ نگار رتن سنگھ کے اعزاز میں ایک پروقار تقریب کا انعقاد

نئی دھلی: ادارہ بیسویں صدی (اردو میگزین) کے اشتراک سے اکیڈمی اسٹاف جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شکھر آرگنائزیشن نے افسانہ نگار و ناول نگار رتن سنگھ کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد کیا۔ اس موقعے پر رتن سنگھ کی نئی کتاب 'ایک ندی نام سرسوتی' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ معروف افسانہ نگار انجم عثمانی نے کتاب کا مجموعی تعارف پیش کیا اور اردو ادب میں رتن سنگھ کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کیا۔ عذرا نقوی نے رتن سنگھ کی سادگی اور قلم کی روانی پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کتاب کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا، پروفیسر شکیل اختر، سہیل انجم، ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے اس کتاب کے ساتھ رتن سنگھ کی باکمال شخصیت پر اظہار خیال کیا۔ سبھی مقررین نے اعتراف کیا کہ رتن سنگھ جی کی بڑھتی عمر اور ان کی محنت سے لکھی گئی کہانیاں ذہن کو روشن کر دینے والی ہیں۔ رتن سنگھ اس وقت عمر کی 92 منزل میں ہیں اور ان کی کہانیاں آج بھی نوجوان ہیں۔ صدر محفل ڈاکٹر ترنم ریاض نے رتن سنگھ سے دیرینہ تعلق کا ذکر کرتے ہوئے رتن سنگھ کو اسی طرح تازہ دم رہنے اور بے تکان قلم کی روانی کی دعائیں دیں۔ پروگرام کی نظامت مشہور کہانی کار ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی نے کی۔ نامور فکشن نگار رتن سنگھ نے بڑی تشویش سے یہ بات کہی کہ اردو افسانہ نگاروں کی نئی نسل کہاں ہے؟ اور کب آئے گی؟ یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ نئی نسل کے کہانی کار کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی کہانی لکھے کہ رات کو جب دن بھر کا تھکا ماندہ انسان بستر پر لیٹ کر وہ کہانی پڑھے تو اس کے سرور میں رات بھر زندگی کے خواب دیکھے اور صبح ہوتے ہی ان خوابوں کی تکمیل کی جستجو میں جٹ جائے۔ انھوں نے نصیحت کی کہ کہانی کار کا کام صرف نام ونمود کی خاطر کہانی لکھنا نہیں بلکہ یہ ایک سماجی بہبود کا فریضہ ہے اور انسانی جذبات کے انتشار کی تسکین کا مستحکم ذریعہ ہے۔ انسان کے اس دنیا سے جانے کے بعد اس کی تخلیقات اس کو زندہ رکھتی ہیں۔ شکھر این جی او کے مینیجنگ ڈائرکٹر ندیم اختر نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 17 جولائی 2018

اتر پردیش:

فن خطاطی کی نمائش

رامپور: کائنات کے ذرّے ذرّے میں اللہ کی نعمتوں کا ظہور ہے لیکن اس کے لیے نظریات کی پاکیزگی لازم ہے۔ تب ہی انسان اسے محسوس کرسکتا ہے۔ ان احساسات کا اظہار فن خطاطی سے شغف رکھنے والی عذرا امین نے کیا۔ رامپور جو ہمیشہ سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے یہاں کے باشندوں نے دیگر فنون میں بھی اپنے وطن کو خصوصی پہچان دلائی ہے۔ اس سرزمین نے جہاں مجاہد آزادی اور معروف صحافی وادیب مولانا محمد علی جوہر کو جنم دیا تو وہیں مولانا عبدالوہاب خاں، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مولانا وجیہ الدین احمد خاں جیسے علماء کرام کو بھی پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ہی رامپور شاد عارفی، جلیل نعمانی، محشر عنایتی، بدر تسلیمی، خیال رامپوری، طرب ضیائی، شوق اثری اور ہوش نعمانی جیسے استاد شعرا کا بھی مادر وطن ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ تبدیل ہوا لیکن یہاں کے لوگوں نے اپنی مٹی کی فطرت سے بغاوت نہیں کی اور آج بھی وہ رامپور کا نام مختلف فنون کے ذریعے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ فن خطاطی میں ملک ایران کو مخصوص حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس فن کے فروغ میں رامپور کا بڑا حصہ ہے۔ استاد شہزادے خاں جادو رقم، سید احمد میاں خطاط، قیصر شاہ خاں استاد رامپوری کی وارثت کو آگے بڑھاتے ہوئے عذرا امین نے بھی فن خطاطی کو اپنی صلاحیتوں سے اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔ عذرا امین نے بتایا کہ فن خطاطی میں ان کی دلچسپی بچپن ہی سے رہی ہے۔ انھوں نے خطاطی کا پہلا نمونہ تقریباً 13 یا 14 سال کی عمر میں تیار کیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ ان کو خطاطی کی تحریک کہاں سے ملی تو انھوں نے کہا کہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں اللہ تعالی کی نعمتوں کا ظہور ہے بس اس کو محسوس کیا اور خیال پیدا ہوا

کہ کیوں نہ اسے فنِ خطاطی کے ذریعے کاغذ پر اتار لیا جائے۔ عذرا امین نے اپنے خطاطی نمونوں میں مختلف اشیاء کے عکس ابھارے ہیں جیسے درخت، شیر، کشتی، پتی، مچھلی، تلوار، چڑیا وغیرہ۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 23 جولائی 2018

موجودہ دور میں پریم چند کی معنویت

رامپور: رامپور رضا لائبریری کے خیابان رضا میں منشی پریم چند کے 138ویں یومِ پیدائش کے موقعے پر ایک توسیعی خطبہ بعنوان 'موجودہ دور میں پریم چند کی معنویت' کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی پروفیسر ابوالکلام قاسمی سابق صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے توسیعی خطبہ پیش کیا۔ اس موقعے پر توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ منشی پریم چند کی معنویت نہ صرف دورِ حاضر میں بلکہ رہتی دنیا تک برقرار رہے گی کیونکہ وہ ایک مشترکہ تہذیب کے علمبردار تھے۔ انھوں نے جن موضوعات کو اپنی ادبی تحریروں میں پیش کیا وہ ایک تحریک کے مدنظر وجود میں آئے۔ اس تقریب کی صدارت چودھری لیش پال سنگھ ممبر ہندی صلاح کار کمیٹی وزارت ثقافت حکومت ہند نے کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں چودھری یشپال سنگھ نے کہا کہ منشی پریم چند مہاتما گاندھی اور ڈائنامکس سے بے حد متاثر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دے کر گاندھی جی کے انگریزوں بھارت چھوڑو آندولن میں حصہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ منشی پریم چند نے اپنے افسانوں میں ایسے پسماندہ اور دبے کچلے لوگوں کو جگہ دی ہے جن کو دوسرے مصنفین نے ہمیشہ نظرانداز کیا تھا۔ اپنے افتتاحی کلمات میں لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر سید حسن عباس نے کہا کہ منشی پریم چند نے اپنے دور میں جس طرح کے افسانے اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ لکھے ہیں وہ آج بھی بالکل تازہ نظر آتے ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 30 جولائی 2018

قومی اردو کونسل کے نوتعمیر کمپیوٹر سینٹر کا افتتاح

مراد آباد: جنت نشاں تعلیمی مشن مرادآباد مغربی اترپردیش روہیل کھنڈ کا ہمہ جہت اردو تعلیم و میڈیم کا سرگرم سماجی، علمی، ادبی اور اقتصادی ادارہ ہے جو اپنے قیام 26 مئی 1967 سے اردو زبان کی تشہیر و اشاعت کے ذریعے اردو کے پیغام کو گھر گھر، قریہ قریہ پہنچانے میں منفرد مقام رکھتا ہے جو نئی نسل کو سماجی، علمی اور اقتصادی میدان میں خودگر خودنگر اور خودکفیل بنانے کے لیے مختلف علمی سرگرمیوں کے ذریعے بیداری پیدا کرنے کا فریضہ ادا کررہا ہے۔ جس نے ریاستی سطح پر جویا، بدایوں، سنبھل، امروہہ، سہسپور، دھام پور، چاند پور، کرتپور، سیوہارہ، شیرکوٹ، نگینہ، نیٹور، بجنور اور میرٹھ جیسے مسلم مردم خیز صنعتی مقامات پر جنت نشاں نام کے ادارے قائم کیے جس میں 22 ہزار سے زائد طلبا طالبات زیرِتعلیم ہیں۔ جنت نشاں یوں تو اترپردیش الہ آباد بورڈ سے منظور شدہ ہے لیکن مختلف علمی سرگرمیوں، سلائی، کڑھائی، ڈریس میکنگ، کمپیوٹر، کیلی گرافی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، NIOS اور NCPUL کے اردو، عربی، اور کمپیوٹر سینٹروں کا اسٹڈی سینٹر ہونے کی وجہ سے قرب وجوار میں مرجع خاص وعام ہے۔ 5 مئی 2018 کو قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے نوتعمیر کمپیوٹر سینٹر کا افتتاح کیا۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے جنت نشاں کے تعمیری کام اور NCPUL کی رقم کے جائز استعمال کی نہ صرف تعریف کی بلکہ یہ اظہار کیا کہ وزارت ترقی انسانی وسائل HRD نہ صرف ایسے اداروں کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتی ہے بلکہ ان کو مالی امداد دینا چاہتی ہے جو حکومتِ ہند کے تحت قائم NCPUL سینٹروں کے ذریعے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ جنت نشاں نے شہر مرادآباد میں تعلیمی بیداری پیدا کرکے تعلیمی فضا استوار کی۔

پریس ریلیز: محمد عتیق منیجر، جنت نشاں تعلیمی مشن مرادآباد، 11 جون 2018

بہار:

شین مظفرپوری یادگاری تقریب

پٹنہ: شین مظفرپوری ایک بہترین افسانہ نگار تھے اور اعلیٰ پایے کے صحافی تھے۔ انھوں نے زبان وادب اور اردو صحافت کی جو بے مثال خدمت کی، وہ اپنی نظیر آپ ہے لیکن اس کے باوجود شین مظفرپوری کی وہ قدردانی اب تک نہیں ہوسکی ہے، جس کے وہ مستحق ہیں۔ ان خیالات کا اظہار 'شین مظفرپوری یادگاری تقریب' میں دانشورانِ زبان وادب نے کیا۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیراہتمام ابھلیکھ بھون، بیلی روڈ میں منعقدہ تقریب کی صدارت اردو مشاورتی کمیٹی کے صدر شفیع مشہدی نے کی۔ مہمان اعزازی کی حیثیت سے ہندی پرگتی کمیتی کے چیئرمین ستیہ نارائن سنگھ شریک ہوئے۔ اس موقعے پر امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ شین مظفرپوری ایک ادیب، افسانہ نگار، ناول نگار، انشائیہ نگار اور ریڈیائی ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے صحافی بھی تھے۔ انھوں نے ادب کے لیے بہت کچھ لکھا اور بہت خوب لکھا۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے مشاورتی کمیٹی کے چیئرمین شفیع مشہدی نے کہا کہ تمام لوگوں کے مقالوں سے یہ بات سامنے آئی کہ شین مظفرپوری کو وہ مقام اب تک نہیں ملا، جس کے وہ حقدار ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس کے لیے ہم بھی ذمے دار ہیں کیونکہ ہم اپنے ہیرے اور جواہر کی خود قدر نہیں کرتے ہیں اور باہر کے ادیب شعرا سے مرعوب ہوجاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شین مظفرپوری کا مقام بحیثیت صحافی زیادہ بلند ہے اور ان کی تخلیقات اردو کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جولائی 2018

دربھنگہ میں اردو زبان وادب کا ارتقا

دربھنگہ: ہوپ فار ہیومن فاؤنڈیشن اور بہار اردو اکادمی کے اشتراک سے اقراء اکادمی بی بی پاکر دربھنگہ کے کانفرنس ہال میں قومی سمینار کا اہتمام کیا گیا۔ کلیدی خطبے میں نظر عالم نے دربھنگہ میں اردو زبان وادب کی تاریخ اور ارتقا کا جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ باصلاحیت اساتذہ سامنے آئیں اور نئی نسل کی صحیح رہنمائی کریں۔ اپنے مقالے میں ڈاکٹر منور راہی نے کہا کہ اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے تقاریب منعقد کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اس قیمتی ورثہ کی اہمیت وافادیت سمجھتے ہوئے اسے اپنے اپنے گھروں میں لازمی طور پر جگہ دینی چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالودود قاسمی نے اپنے مقالے میں دربھنگہ سے تعلق رکھنے والے قدیم وجدید نثرنگاروں کا تعارف کرایا اور ان کی خدمات کو اجاگر کیا۔ صحافی ڈاکٹر منصور خوشتر نے کہا کہ آج اردو گجراتی سے نیچے جا چکی ہے۔ اردو کی موجودہ حالت کے بڑے ذمہ دار خود اردو کے اساتذہ ہیں۔ انھوں نے نہایت جذباتی انداز میں اردو کے کئی مسائل کا ذکر کیا۔ اس موقع پر اپنی تمہیدی گفتگو میں ناظم ڈاکٹر عبدالمتین قاسمی نے کہا کہ دربھنگہ کو ہمیشہ امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ آج بھی ملک بھر میں پھیلے اردو اساتذہ میں دربھنگہ کے اساتذہ بڑا مقام رکھتے ہیں اور ان کی بڑی تعداد ہے جو ملک بھر کے طلبہ کو فیضیاب کررہے ہیں۔

صدر ڈاکٹر عالمگیر شبنم نے اپنی تقریر میں کہا کہ فروغِ اردو کے لیے ہم زمینی سطح پر کام کریں۔ بالخصوص اردو تدریس کو دلچسپ اور مؤثر بنانے کے لیے لائحہ عمل تیار کریں۔ نئی نسل کو اردو کی طرف راغب کریں۔ نئی نسل کی اردو سے بیزاری بہت ہی افسوسناک ہے۔ اس کا ذمہ دار

کون ہے احتساب کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ خود اردو پڑھیں اور اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں اور مدارس سے اپنا رشتہ مضبوط کریں۔ سمینار کے دوران عرفان احمد پیدل (بیورو چیف روزنامہ پندار)، فردوس علی (بیورو چیف روزنامہ راشٹریہ سہارا)، منصور خوشتر (بیورو چیف قومی تنظیم دربھنگہ)، احتشام الحق (نمائندہ انقلاب)، ڈاکٹر عبدالمتین قاسمی (بیورو چیف روزنامہ تاثیر) کو صحافتی خدمات کے لیے توصیفی سند اور شال دے کر اعزاز سے نوازا گیا۔

پریس ریلیز: عقیل صدیقی، دربھنگہ، بہار، 12 جولائی 2018

جموں و کشمیر:

اکیسویں صدی میں اردو ادب

سرینگر: 15 جولائی 2018 بروز اتوار شیخ العالم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی جموں و کشمیر کے زیر اہتمام یک روزہ قومی سمینار بعنوان 'اکیسویں صدی میں اردو ادب' ہوٹل شہنشاہ پیلس، ڈل گیٹ سرینگر میں منعقد کیا گیا۔ سمینار میں ریاست و بیرون ریاست کی قد آور ادبی شخصیات نے شرکت کی۔ سمینار منعقد کرانے میں جموں اینڈ کشمیر بینک، ہمالین ایجوکیشن مشن راجوری جموں، قادری ادبی فاؤنڈیشن دہلی کا جزوی تعاون حاصل رہا۔ پہلے سیشن کے ایوان صدارت میں شامل صدور حضرات وحشی سعید، مشتاق عالم قادری، ڈاکٹر الطاف انجم، بشیر چراغ اور ستیش ول تھے۔ نظامت سلمان عبدالصمد نے انجام دی۔ ادارے کے روح رواں غلام نبی کمار نے افتتاحی خطبہ پیش کیا جس میں انھوں نے سمینار میں شریک تمام مندوبین، اسکالروں، اساتذۂ کرام اور قلم کار حضرات کا شکریہ ادا کیا۔

اس موقعے پر ملک کے طول و عرض سے آئے مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے جن میں یوسف رامپوری، فیض قاضی آبادی، ڈاکٹر یاسین گنائی، مشتاق احمد گنائی، سالک جمیل براڑ، سید آفتاب، سمیرا بانو، پاکیزہ، اسما، بدرشا، خضر بانو، یونس ڈار، محمد لطیف، محی الدین زور کاشمیری، سلمان عبدالصمد، محمد مقبول فیروزی، توصیف احمد ڈار وغیرہ شامل تھے۔ ڈاکٹر مشتاق عالم قادری نے اس سمینار کی کامیابی پر پوری ٹیم کو مبارک دیتے ہوئے کہا کہ سرینگر میں منعقد کرایا گیا یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور ایک منفرد سمینار ہے۔ اس سمینار سے یقیناً جموں و کشمیر میں اردو ادب کو فروغ اور تقویت حاصل ہوگی نیز پورے ملک میں کشمیر میں اردو ادب کے حوالے سے مثبت تاثر قائم ہوگا۔ وحشی نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا کہ ریاست میں اردو زبان پھل پھول رہی ہے۔ یہاں اکیسویں صدی کا اردو منظر نامہ قابل ستائش ہے۔ آخر میں محمد اقبال آرگنائزنگ سکریٹری نے تمام مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 17 جولائی 2018

جھار کھنڈ:

اردو ترقی یافتہ سماج اور قومی یکجہتی کی بھی زبان

دھنباد: اردو نہ صرف ایک ترقی یافتہ زبان ہے بلکہ اردو قومی یکجہتی کی بھی زبان ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اس کی حصہ داری کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ ہندوستان میں اردو کی موجودہ خستہ حالی کا ذمہ دار ایک حد تک ملک کا بٹوارہ ہی ہے۔ ملک کی تقسیم سے اردو زبان کو کافی نقصان پہنچا۔ ان باتوں کا اظہار اردو کے ہمدرد و نامدھاری ہاسپٹل اینڈ ریسرچ سنٹر کے ڈائرکٹر ڈاکٹر جوگندر سنگھ نے نامہ نگار سے ایک خصوصی ملاقات میں کیا۔ ڈاکٹر جوگیندر سنگھ نے کہا کہ جدید ٹکنالوجی سے نہ صرف اردو کو بلکہ دوسری زبانوں کو بھی کافی نقصان پہنچا ہے۔ فون اور موبائل نے اس دور میں خط و کتابت کا سلسلہ تقریباً ختم کر دیا ہے۔ انھوں نے بہت حد تک مسلمانوں کو بھی خود اپنی زبان کو چھوڑنے کا ذمے دار ٹھہرایا اور مسلمانوں سے اردو کی بقا اور فروغ کے لیے اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دلوانے کی اپیل کی تاکہ اردو زندہ رہ سکے۔ انھوں نے خصوصی طور پر نوجوانوں سے اپیل کی کہ اردو جاننے والے نوجوان اپنے علاقوں میں اردو سکھانے کی مہم چلائیں۔ اردو کی پسماندگی کا ایک سبب اس علاقے میں مدرسوں اور دوسرے تعلیمی اقلیتی اداروں کی کمی ہے۔ اردو رسالے اور اخبارات اردو کے فروغ میں معاون رہے لیکن اتفاق سے جھارکھنڈ سے اردو کا کوئی معیاری رسالہ نہیں نکلا اور اگر نکلا بھی تو اسے پڑھنے والے لوگ نہیں۔ اردو کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود ہم اردو والے ہی ہیں جو اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دلاتے، اردو میں درخواست نہیں دیتے۔ اگر واقعی ہم اردو کی ترقی چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اپنے گھر میں اپنے بچوں کو اردو پڑھنے کے لیے راغب کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ جھارکھنڈ ریاست بنے عرصہ بیت گیا بہت افسوس کی بات ہے کہ اب تک جھارکھنڈ میں اردو اکادمی ہی نہیں ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 جولائی 2018

کرناٹک

مجلس شعور ادب گلبرگہ کی محفل افسانہ

گلبرگہ: 16 جولائی 2018 (راست) نئے افسانہ نگار اور شعرا اپنے مطالعے اور مشاہدے میں اضافہ کریں۔

کلاسیکی شعرا اور ادبا کے مطالعے اور مشاہدے سے قلمکاروں کی تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ قلمکار اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ ان کی تخلیقات قارئین کو متاثر کریں۔ ان خیالات کا اظہار سراج وجیہ تیر انداز صدر مجلس شعور ادب نے اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ مجلس شعور ادب گلبرگہ کی جانب سے معروف افسانہ نگار تنویر احمد تماپوری کے اعزاز میں تاریخ 15 جولائی کو نیشنل کالج کے غالب ہال میں منعقدہ محفل افسانے میں اظہار خیال کر رہے تھے۔ محفل افسانہ کو مخاطب کرتے ہوئے ممتاز ادیب نقاد خاکہ نگار ڈاکٹر وہاب عندلیب نے کہا کہ تنویر احمد تماپوری اور مسعود علی تماپوری کے افسانے متاثر کن ہیں۔ افسانوں کی پیش کش اور طرز اظہار بہت عمدہ ہے۔ پروفیسر عبدالرب استاد صدر شعبہ اردو گلبرگہ یونیورسٹی نے بتایا کہ محفل افسانہ میں منظور وقار، مسعود علی تماپوری اور تنویر احمد تماپوری کے افسانوں میں کرشن چندر کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان فنکاروں نے الفاظ کے تانے بانے سے اپنے افسانوں اور افسانچوں کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

مجلس شعور ادب گلبرگہ کے علاوہ شہر کی مختلف ادبی شخصیات کی جانب سے تنویر احمد تماپوری اور دیگر مہمانان خصوصی کی گلپوشی و شال پوشی کی گئی۔ جلسے کی نظامت معتمد مجلس شعور ادب گلبرگہ ڈاکٹر چندا حسینی اکبر نے بحسن و خوبی انجام دی۔

رپورٹ: ڈاکٹر سید چندا حسینی اکبر معتمد مجلس شعور ادب گلبرگہ، 16 جولائی 2018

مہاراشٹر:

چلو ملتے ہیں کتابوں سے

اورنگ آباد: موجودہ دور میں مطالعے اور کتابوں کے تئیں عدم دلچسپی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے سد باب کے لیے اور طلبا میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے کے

لیے ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن اورنگ آباد کی جانب سے 'چلو ملتے ہیں کتابوں سے' مہم کا آغاز امان اللہ موتی والا اردو ہائی اسکول اورنگ آباد سے شروع کیا گیا۔ اس موقعے پر فاؤنڈیشن کے صدر مرزا عبدالقیوم ندوی نے کہا کہ اسکولوں میں جاکر طلبا میں کتابوں کے تئیں دلچسپی پیدا کریں۔

اس موقعے پر اسکول کے طلبا میں قومی اردو کونسل دہلی سے شائع ہونے والا بچوں کا رسالہ 'ماہنامہ بچوں کی دنیا' تقسیم کیا گیا۔ واضح رہے کہ اس سے قبل بھی کئی مرتبہ اس نوعیت کے مختلف پروگرام منعقد کیے گئے تھے، جن کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے ہیں۔ طلبا میں 37 ہزار کیش باکس مفت تقسیم کرکے انھیں اس بات پر راغب کیا گیا تھا کہ وہ اپنے ملنے والے جیب خرچ میں سے کچھ نہ کچھ بچت کی عادت ڈالیں۔ اور جمع ہونے والی رقم سے کتابیں خریدیں جس کا اچھا اثر ہوا تھا۔ مختلف اسکولوں میں ایک، دو دن کے چھوٹے چھوٹے کتاب میلے منعقد کیے گئے تھے۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے امسال اورنگ آباد کے تمام اسکولوں میں یہ مہم چلائی جائے گی۔ اس مہم کے تحت مصنفین، ماہرین تعلیم کے خطاب، بچوں میں مفت کتابوں کی تقسیم، اسکولوں میں چلڈرن بک فیسٹول، اسکولوں میں کالجوں کی لائبریریوں میں موجود کتابوں کی نمائش اور ریلیاں بھی نکالی جائیں گی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 31 جولائی 2018

اعزاز و اکرام:

امروہہ کا اردو ادب ایوارڈ

امروھه: شہر امروہہ کی قدیم روایت ہے کہ یہاں تمام کام ادب اور تہذیب کے دائرے میں ہوتے ہیں اور اس کا ایک نمونہ آج کی یہ تقریب دعوت فصل بہاراں ہے جس میں ایک جانب جسمانی غذا حاصل ہورہی ہے تو دوسری جانب روحانی غذا بھی مل رہی ہے۔ مذکورہ خیالات یمنا ایکسپریس وے کے سینئر افسر اور گریٹر نوئیڈا اتھورٹی کے جنرل منیجر سید اثیج رضا زیدی نے امروہہ میں منعقد دعوت فصل بہاراں میں کیے جس کا انعقاد اترپردیش اردو ادب سوسائٹی کی جانب سے مدرسہ شیخ چاند میں کیا گیا تھا۔ معززین شہر کی موجودگی اور حاجی نسیم خاں کی صدارت میں تلاوت کلام الٰہی سے حافظ عنایت نے اس تقریب کا افتتاح کیا۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے پروگرام میں پہنچے عالمی شہرت یافتہ شاعر خورشید حیدر مظفرنگری، اثیج رضا زیدی و حسن شجاع نقوی کو اردو ادب ایوارڈ 2018 سے سرفراز کیا گیا۔ مہمان ذی وقار سید اثیج رضا زیدی نے کہا کہ پوری دنیا میں جہاں امروہہ کا نام آم کی مٹھاس کو لے کر مشہور ہے، وہیں شہر امروہہ کے ادبی حلقے سے ملنے والی چاشنی بھی پوری دنیا میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 جولائی 2018

ڈاکٹر بشیر بدر کو جوش اردو ایوارڈ 2018

بھوپال: بزم اردو، دبئی کے زیر اہتمام، بھوپال میں منعقد ایک پروقار تقریب میں عہد حاضر کے بڑے اور مشہور زمانہ شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کو اس برس کا جوش اردو ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر موجود بزم اردو، دبئی

کے بانی اور جنرل سکریٹری، ریحان خان نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کو یہ ایوارڈ دبئی میں 16 اگست کو ہونے والے، بزم اردو، دبئی کے سالانہ جلسے میں دیا جانا تھا مگر ان کی علالت کے باعث سفر ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے بزم اردو، دبئی نے یہ فیصلہ کیا کہ بھوپال میں ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ پر جاکر یہ ایوارڈ ان کو پیش کیا جائے۔ گذشتہ برسوں میں یہ ایوارڈ شمس الرحمٰن فاروقی، مشتاق احمد یوسفی، جاوید اختر جیسی قدر آور ادبی شخصیات کو پیش کیا جاچکا ہے۔ شہر بھوپال کی دیگر معزز شخصیات کے علاوہ اس تقریب میں ہندوستان کے کئی معروف ادیب بھی شریک ہوئے جن میں بدر واسطی، مہتاب عالم، ساجد رضوی، آدرش شریواستو، رضیہ حامد بیگم اور شعیب علی خاں شامل ہیں، جنھوں نے ڈاکٹر بشیر بدر کی ادبی خدمات پر اپنا اظہار خیال کیا۔ اس محفل کی نظامت ترنم احمد نے کی۔ ڈاکٹر صاحب کی زوجہ محترمہ راحت بدر نے بزم اردو، دبئی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ محفل کے آخر میں احیا بھوج پوری نے بزم اردو، دبئی کی جانب سے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 8 جولائی 2018

رامپور رضا لائبریری کی جانب سے ایوارڈ کا اعلان

لکھنؤ: گورنر رام نائک کی صدارت میں منگل کو رامپور رضا لائبریری کی میٹنگ میں 2016-17 کے لیے کئی ادیبوں کو اعزاز دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ وارانسی کے ڈاکٹر ناہید عابدی کو سنسکرت میں ان کی خدمات کے لیے نواب رضا علی خاں ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی قرون وسطی کی تاریخ کے لیے ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب حیدرآباد کو 'نواب فیض اللہ خاں' ایوارڈ، فارسی کے لیے دہلی یونیورسٹی کے سابق شعبہ صدر فارسی پروفیسر شریف حسین قاسمی کو 'نواب رضا علی خاں' ایوارڈ، صحافت کے لیے احمد سعید ملیح آبادی کو 'مولانا محمد علی جوہر' (سینئر) ایوارڈ اور اردو کتابوں کی طباعت کے لیے 'منشی نول کشور' ایوارڈ الحسنات بکس پرائیویٹ لمیٹڈ نئی دہلی کو دیا جائے گا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جولائی 2018

پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر شافع قدوائی کو اقبال سمان

نئی دہلی / علی گڑھ: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر عتیق اللہ کو حکومت مدھیہ پردیش کی جانب سے اقبال سمان سے نوازا گیا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ عہد حاضر کے ایک بڑے ناقد اور شاعر ہیں۔

پروفیسر عتیق اللہ

پروفیسر شافع قدوائی

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں 29 برسوں کی تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد وہ لگاتار تصنیف و تالیف میں لگے رہنے والے ادیب ہیں۔ ان کے اب تک چار شعری مجموعے، ایک سو غزلیں، بین کرتا ہوا شہر، عبارت اور تکلم بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ کو اقبال سمان ملنے سے ادبی حلقوں میں مسرت کی لہر ہے اور شائقین اردو اس سے کافی خوش ہیں۔ دوسری جانب علی گڑھ کی ممتاز ادبی تنظیم 'دیار ادب انڈیا' نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے ماس کمیونیکیشن شعبہ کے سینئر استاد، عظیم نقاد اور قلم کار پروفیسر شافع قدوائی کو مدھیہ پردیش حکومت کے گراں قدر ایوارڈ 'اقبال سمان' سے سرفراز کیے جانے پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر قدوائی اور تمام اے ایم یو برادری کو مبارکباد پیش کی ہے۔ 'دیار ادب انڈیا' کے بانی سکریٹری اویس جمال شمسی نے کہا کہ مدھیہ پردیش حکومت نے ان کو اپنے گراں قدر اعزاز سے سرفراز کرکے 'حق بہ حقدار رسید' کا ثبوت پیش کیا ہے جس کے لیے تمام علی گڑھ برادری مدھیہ پردیش حکومت کی شکرگزار ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 19 جولائی 2018

اجرا:

اے ایم یو نیوز لیٹر

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے اپنے دفتر میں اے ایم یو کے کشن گنج سینٹر کے نیوز لیٹر کا اجرا کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ نیوز لیٹر میں کشن گنج سینٹر کے مجوزہ نصابات کا ذکر کرتے ہوئے اساتذہ کے ترقیاتی عمل اور طلبہ کی سرگرمیوں سمیت اب تک کے مکمل ترقیاتی کاموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پروفیسر طارق منصور نے نیوز لیٹر کے اولین شمارے کی اشاعت کے لیے مرکز کے ڈائرکٹر پروفیسر راشد نہال کو مبارکباد پیش کی۔ نیوز لیٹر کی ادارت پروفیسر راشد نہال نے کی ہے جبکہ شعبۂ انگریزی کے سربراہ پروفیسر محمد عاصم صدیقی اس کے مہمان مدیر ہیں۔ اس موقعے پر اے ایم یو کے پرووائس چانسلر پروفیسر تبسم شہاب، شعبۂ رابطہ عامہ کے ممبر انچارج پروفیسر شافع قدوائی اور اے ایم یو رجسٹرار ڈاکٹر ناظم حسین جعفری موجود تھے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 6 جولائی 2018

مرقع چغتائی (دیوانِ غالب)

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام عبدالرحمن چغتائی کی اہم ترین تصنیف 'مرقع چغتائی' کی رسم رونمائی کے موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر، سید شاہد مہدی نے اپنی خصوصی تقریر میں کہا کہ اشعار پر

تصاویر بنانے کا رواج اردو میں حمزہ نامہ سے شروع ہوتا ہے۔ فن مصوری میں ہندوستانی مصوروں نے اپنے فن سے ہمیشہ شیرینی پیدا کی۔ عبدالرحمن چغتائی کی تربیت نقاشی سے شروع ہوئی تھی اور انھوں نے یہ نقاشی مسجدوں کے نقش ونگار سے سیکھی۔ چغتائی نے اسلامی مصوری کے ساتھ کرشن اور رادھا کی بھی تصاویر بنائیں۔ انھوں نے کہا کہ فنکار کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور نہ وہ اپنے فن کو مذہبی دائروں کا پابند بناتا ہے۔ ہمیں کسی کے بھی فن کو سرحدوں میں محدود نہیں کرنا چاہیے۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ عبدالرحمن چغتائی کو عالمی سطح پر فن مصوری میں شہرت ملی، ہمیں یہ کہتے ہوئے بھی افسوس ہو رہا ہے کہ جتنی شہرت آپ کو ملنی چاہیے وہ نہیں ملی۔ ہم میں سے بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ عبدالرحمن چغتائی ایک بڑے مصور کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار بھی تھے۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فائن آرٹس کے سابق ڈین پروفیسر سید غضنفر حسین زیدی نے کہا کہ مصوری کی دنیا میں عبدالرحمن چغتائی کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ غالب انسٹی کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے کہا کہ غالب ایک عظیم شاعر تھے اور پوری دنیا میں برصغیر کی شعری روایت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہم جتنی بار غالب کو دیکھیں اور سوچیں ہمیں محسوس ہوگا کہ کلام غالب میں کچھ نئی باتیں ہمارے سامنے آرہی ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے کہا کہ عبدالرحمن چغتائی دنیا کے ممتاز مصوروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں پہلی بار اس کتاب کی اشاعت غالب انسٹی ٹیوٹ نے کی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 اگست 2018

سہ ماہی 'عالمی میراث'

پونے: 4 جولائی 2018 آج پترکار بھون، پونے میں ایک سہ ماہی ادبی رسالے عالمی میراث کی رسم رونمائی

انجام دی گئی۔ اس تقریب کا اہتمام راسک مترا منڈل ای این یو فاونڈیشن اور شری پردیپ ماونٹ پونے کے زیراہتمام کیا گیا۔ تقریب کی صدارت شری سریش چندر صورت والا نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر سید تقی عابدی شریک تھے۔ ڈائس پر ذی احترام شخصیات میں سے جناب منور پیر بھائی، سابق چیرمین اعظم کیمپس پونے، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر پریمی رومانی، مدیر سہ ماہی عالمی میراث، جناب زبیر صاحب پریزڈنٹ ای این یو فاونڈیشن اور ڈاکٹر ممتاز پیر بھائی تھے۔

تقریب کے آغاز میں صاحب صدر جناب سریش چندر صورت والا نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور اس تنظیم کے بارے میں تفصیلات پیش کیں۔ اس کے بعد جناب منور پیر بھائی نے پنڈت برج نرائن چکبست لیکچر سیریز کے تحت اردو کے اس عظیم شاعر کی شخصیت کے حوالے سے پرمغز تقریر کی اور اس محب وطن شاعر کی ادبی خدمات کو یاد کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر پریمی رومانی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے عالمی میراث کی رسم رونمائی جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی نے انجام دی۔ ڈاکٹر عابدی نے سہ ماہی عالمی میراث کو سراہتے ہوئے کہا کہ یہ رسالہ ترقی کی طرف گامزن ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر پریمی کی کوششوں کو سراہا اور انہیں مبارک باد پیش کرکے اس کام کو آگے بڑھانے کا حوصلہ دیا۔ اردو زبان کے عظیم اور وطن پرست شاعر پنڈت برج نرائن چکبست کی شخصیت اور ان کی شاعری پر ڈاکٹر عابدی نے سیر حاصل تبصرہ کرکے انھیں ایک وطن دوست شاعر قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ چکبست کی جوانمرگی کی وجہ سے ان کا کلام ابھی تک بکھرا ہوا ہے جس کو سمیٹنے کی ضرورت ہے تاکہ اس ان کا مکمل کام منظر عام پر آجائے۔ ڈاکٹر پریمی رومانی نے اپنی تقریر میں سہ ماہی عالمی میراث کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی اور کہا کہ وہ تین پشتوں سے اردو زبان وادب کی خدمت کرتے آئے ہیں۔

پریس ریلیز: پریمی رومانی، پونے، 6 جولائی 2018

حکیم الامت

ترورکاڈ (ملاپرم، کیرالا 30 جون 2018): جب سماج گہرے انحطاط اور غیر معمولی تنزلی کی طرف گامزن ہونے لگتا ہے تو ادیبوں کو آگے بڑھ کر اس کی تہذیب کے تحفظ کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لینی چاہیے۔ (ٹی اے احمد کبیر ایم ایل اے) کشمیر سے شائع ہونے والا اردو ماہنامہ 'حکیم الامت' جون 2018 کا خصوصی شمارہ کے پی شمس الدین ترورکاڈ کا اجرا کرتے ہوئے ایک پروقار تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اظہار خیال کر رہے تھے۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ شمس الدین ترورکاڈ

کی تحریریں بھی وائیکم محمد بشیر کی طرح اپنے سماج کے تہذیبی انحطاط پذیرے کے خلاف جدوجہد کرنے والی دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ دوسری کوئی اور سرگرمی تحریر کا بدل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے نئی نسل کے ادیبوں کو

مختلف زبانوں میں پائی جانے والی مہارتوں کو بڑھ چڑھ کر اپنانے کی ضرورت ہے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ اُردو ماہنامہ 'حکیم الامت' نے ایک ملیالی اُردو ادیب ومحقق شمس الدین ترورکاڈ کے ادبی خدمات کا تجزیہ کرتے ہوئے خصوصی نمبر شائع کیا ہے۔

پریس ریلیز: کے پی شمس الدین، کیرالہ، 24 جولائی 2018

خواب محل

حیدرآباد: کچھ عرصے قبل حیدرآباد میں ادیب وشاعر کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی، جتنی آج کے دور میں ہے جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یقیناً اردو کا مستقبل روشن اور تابناک ہے، بطور خاص ریاست تلنگانہ میں اردو نے زیادہ ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ دورِ جدید

میں حیدرآباد کی خواتین اردو کے میدان میں نمایاں نظر آرہی ہیں، ان میں سے ایک افسانہ نگار وشاعرہ خاتون کشور سلطانہ ہیں، جن کی اردو ادب کی خدمات نمایاں ہیں، کشور سلطانہ شاعری کی دنیا میں بھی ایک کامیاب خاتون نظر آرہی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر سکریٹری اردو اکیڈمی نے ادارہ اقلیم ادب حیدرآباد کے زیر اہتمام اردو ہال گلشن حبیب حمایت نگر میں منعقدہ تقریب رسم اجرا (خواب محل) میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ کشور سلطانہ کی نظموں کا مجموعہ 'خواب محل' ان کی شاعری کی پہلی کتاب ہے جو قابل قدر وقابل مطالعہ ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اس خواب محل کا احساس دلایا ہے جس کا ہر خاتون تصور نہیں کرسکتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود جعفری نے کہا کہ ان کی شاعری میں ظاہری بناوٹ اور غم دوراں وغیرہ نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری فکر وفلسفے اور بلند سوچ سے عبارت ہے۔ اس کے علاوہ شفیع اقبال مدیر پروانہ دکن، محمد عبدالرحیم خان، خواجہ کمال الدین مقیم حال امریکہ نے اپنے اپنے تاثرات پیش کیے۔

پریس ریلیز: مختارالدین احمد، حیدرآباد، 13 جولائی 2018

ماڈرن ابلا

ممبئی: ادب، زبان اور تہذیب کی کوئی سرحدیں نہیں ہوتیں، ہندوستان کی ہندی زبان میں چھپی کتاب کا

پاکستان کے اُردو شاعر کے ہاتھوں رسم اجرا اس بات کا مظہر اور قومی یکجہتی کی مثال ہے۔ برِ صغیر کی عالمی شہرت یافتہ شاعرہ، گیت کار اور سماجی کارکن محترمہ لتا حیا کی نئی کتاب 'ماڈرن ابلا' (بہ زبانِ ہندی) کا 8 جولائی 2018 کو النور انٹرنیشنل ٹیکساس امریکہ میں منعقدہ عالمی مشاعرے میں پاکستان کے مشہور شاعر جناب پیرزادہ قاسم کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شمسہ قریشی صاحبہ، جناب شیخ اعجاز صاحب، النور انٹرنیشنل امریکہ کے روحِ رواں جناب نور امروہوی صاحب، جناب منظر بھوپالی صاحب (انڈیا)، جناب اشفاق حسین صاحب (کینڈا)، جناب جمیل احسن صاحب (سویڈن)، جناب خالد عرفان صاحب (نیویارک)، ڈاکٹر صبیحہ صبا صاحبہ (نیویارک)، محترمہ نیلوفر عباسی صاحبہ اور محبانِ اُردو امریکہ کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ تمام شرکاء نے اس کتاب کی پذیرائی کی اور محترمہ لتا حیا کے اس انقلابی اقدام پر انھیں مبارکباد دے کر اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ محترمہ لتا حیا نے مشاعرے میں جب اس کتاب میں چھپی کچھ نظمیں جو ہندی زبان میں تھیں سُنائیں تو سامعین نے بے ساختہ کھڑے ہوکر تالیاں بجائیں اور اپنی داد وتحسین سے نوازا اور ہاتھوں ہاتھ اس کتاب کی تمام کاپیاں خرید لیں۔

ہندی زبان میں شائع لتا حیا کی نئی کتاب 'ماڈرن ابلا' جدید نظموں پر مشتمل ہے جس میں آج کے دور میں خواتین کے ساتھ ہو رہی ناانصافیوں اور زیادتیوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ بہت جلد اس کتاب کو اُردو زبان میں بھی شائع کیا جانے والا ہے، واضح رہے کہ لتا حیا کا پہلا مجموعہ کلام 'حیا' ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں ایک ساتھ شائع ہوا، اس کے بعد دوسرا مجموعہ کلام 'لتا سے حیا تک' اُردو زبان میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔

ڈاکٹر محمد راغب دیشمکھ، ممبئی 20 جولائی 2018

شگرفی آنچل کے سائے

ممبئی: اردو کی ترقی وترویج اور اس کی بقا کے لیے نئی نسل کی زبان وادب سے وابستگی انتہائی ضروری ہے اور انجمن اسلام نے بہترین زبان وادب سے نوجوانوں کو جوڑنے کے لیے منصوبہ سازی کا فیصلہ کیا ہے، جس پر جلد عمل شروع ہوگا، لیکن اس مقصد کے لیے اردو داں طبقے کا تعاون ضروری ہے۔ انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی نے ایک خاتون افسانہ نگار فریدہ نثار انصاری کی کتاب 'شگرفی آنچل کے سائے' کے اجرا کی تقریب میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ انجمن اسلام کے صدر نے کہا کہ اردو کی بقا اور اس کے فروغ وتشہیر کے لیے انجمن نے اردو ذریعہ تعلیم کو متعدد اداروں میں برقرار رکھا ہے اور آئندہ بھی اس مقصد کے تحت کوشش جاری رہے گی۔ اس سے قبل اپنے پہلے افسانے کے مجموعہ کے اجرا پر فریدہ انصاری نے کہا کہ خلیجی ممالک میں برسرروزگار افراد کے مسائل اور ان کے اہل خانہ کو درپیش پریشانیوں کو سادگی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تقریب کے صدر سابق ایم ایل اے سہیل لوکھنڈ والا نے کہا کہ فریدہ انصاری نے قطر میں رہ کر وہاں برسرروزگار ہندوستانیوں کے مسائل کو صاف ستھرے انداز میں پیش کیا ہے اور ان کی کتاب کا عنوان 'شگرفی آنچل کے سائے' ہی اس کی مقبولیت کی ضامن ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 31 جولائی 2018

اردو شاعری کے معتبر چہرے

مئو: ادارۂ فروغ اردو کے زیر اہتمام پورہ معروف کرتھی جعفر پور مئو میں اسامہ ارشاد معروف کی کتاب 'اردو شاعری کے معتبر چہرے' کی رسم اجرا کی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر چیئرمین طیب پالکی نے شرکت کی جبکہ مہمان اعزازی کے طور پر ڈاکٹر شکیل احمد اور ڈاکٹر شفیق اعظمی شریک ہوئے۔ اس موقعے پر ادارۂ فروغ اردو کے ڈائرکٹر مولانا ارشاد خلیل قاسمی نے گل پوشی کے ذریعے مہمانوں کا استقبال کیا۔ کتاب کے مصنف اسامہ ارشاد معروفی کو ادارۂ فروغ اردو کی جانب سے ایک یادگاری 'مومنٹو' پیش کیا گیا۔ مولانا انصار احمد معروفی قاسمی نے نظامت کے فرائض انجام دیے جبکہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے صدارتی خطبہ پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 اگست 2018

سید غیور حسن نقوی: فن وشخصیت

امروہہ: سرزمین امروہہ کے معروف خاکہ نگار وانشاپرداز سید غیورالحسن نقوی کے لکھے ہوئے مقالات پر سماجی شخصیت تنویر حسن نقوی کی جانب سے مرتب کی گئی کتاب 'غیور حسن نقوی: فن وشخصیت' کی رونمائی راشدہ بیگم

ڈگری کالج میں عمل میں لائی گئی۔ اس تقریب رونمائی میں سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد مزمل نے شرکت فرمائی جبکہ صدارت کے فرائض کمال فاروقی ممبر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نیانجام دیے۔ مقررین میں صحافی ڈاکٹر مہتاب امروہی، جنید اکرم فاروقی، ڈاکٹر ابوراشد اعظمی نے اس کتاب پر اپنا مقالہ پیش کیا اور تنویر حسن نقوی کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 27 جولائی 2018

وفیات:

گوپال داس نیرج

نئی دہلی: پدم بھوشن سے سرفراز معروف نغمہ نگار گوپال داس نیرج کا جمعرات کی شام 19 جولائی کو 94 سال کی عمر میں ایمس میں انتقال ہوگیا۔ شام تقریباً 7:50 بجے

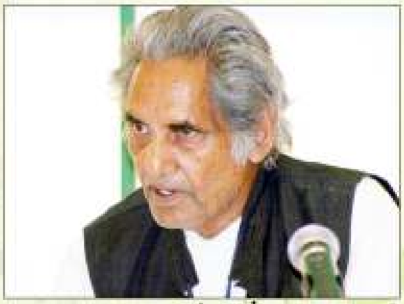

انھوں نے آخری سانس لی۔ گوپال داس نیرج کو 1991 میں پدم شری ایوارڈ، 1994 میں یش بھارتی ایوارڈ، 2007 میں پدم بھوشن ایوارڈ سے سرفراز کیا جاچکا ہے۔ انھیں فلمی دنیا میں سب سے بہتر نغمہ لکھنے کے لیے 70 کی دہائی میں لگاتار تین مرتبہ فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ وہیں اترپردیش کی اکھلیش سرکار نے انھیں بھاشا سنستھان کا صدر بنا کر کابینہ وزیر کا درجہ دیا تھا۔ ان کی پیدائش 4 جنوری 1924 کو اناوہ ضلع کے پراولی گاؤں میں ہوئی۔ بعد میں وہ علی گڑھ میں مستقل رہائش بنا کر رہنے لگے۔ اپنی رومانی شاعری کے سبب نیرج کو ملک بھر کے کوی سمیلنوں میں بلایا جاتا تھا۔ ان کا شمار ہندی شاعری میں منچ کے معروف ومشہور شاعروں میں ہوتا تھا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 27 جولائی 2018

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

نئی دہلی: نامور محقق، نقاد اور صحافی پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کا 15 اگست کو انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 82 برس کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ ان کی 23 کتابیں شائع ہوئیں جو سبھی مقبول عام ہیں۔ ان کی کتابوں میں رشید احمد صدیقی: حیات اور فن، اسلوب اور انتقاد، تنقید شعر، اردو شاعری میں اشاریت، تنقید اور تہذیب، آنگن آنگن، دکھ کے پیڑ اور ادب کا بدلتا مزاج وغیرہ کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ اپنی تحریروں میں اپنی چھاپ چھوڑنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کے انتقال سے اردو دنیا ایک عظیم ناقد، شاعر اور خاکہ نگار سے محروم ہوگئی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 اگست 2018

جلیس شیروانی

ممبئی: معروف مکالمہ نویس، نغمہ نگار اور فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے سابق صدر جلیس شیروانی بدھ یعنی کم اگست 2018 کو انتقال کرگئے۔

اطلاع کے مطابق وہ کچھ دنوں سے علیل تھے۔ جلیس شیروانی کے تعلق سے نغمہ نگار اے ایم طراز نے بتایا کہ ''ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے 72 فلموں کے لیے نغمے ومکالمے تحریر کیے جن میں سے 22 سلمان خان کی فلمیں تھیں۔ 'کنورلال، پرتی گھات، مافیا اور مرتیو داتا جیسی فلموں کے مکالمے لکھنے کے بعد انھوں نے ہیلو برادر، ٹائیگر 2 اور تیرے نام جیسی سپرہٹ فلموں کے نغمے بھی لکھے۔ فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے نائب صدر جاوید دانش کا کہنا ہے کہ ''جلیس بھائی کوئی چار مرتبہ ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ آج جو یہ ادارہ اتنا پروقار نظر آرہا ہے تو یہ جلیس بھائی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے قلمکاروں کی رائلٹی کے لیے کافی جدوجہد کی اور ان کا حق دلوا کر رہے۔'' معروف شاعر عبید اعظم نے بتایا کہ ''جلیس شیروانی مشاعروں میں بھی بلوائے جاتے تھے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے اور بڑے بے تکلف اور بھلے انسان بھی تھے۔''

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، 2 اگست 2018

ڈاکٹر نورالسعید

ممبئی: فارسی اور اردو کے استاد نورالسعید اختر 26 جولائی کو امریکہ میں انتقال کرگئے۔ فارسی اور اردو کے عالم، محقق پروفیسر نورالسعید اختر 13 نومبر 1939 میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد عبدالحمید کھام گاؤں (بلڈانہ) کے کلکٹر تھے۔ نورالسعید اختر نے 1962 میں ناگپور یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا، جس پر انھیں گولڈ میڈل دیا گیا، مرحوم نے ممبئی یونیورسٹی سے 1969 میں پی ایچ ڈی کی اور دوبارہ انھوں نے ڈی لٹ (اردو- ناگپور یونیورسٹی 1989) کیا جس میں ایک موضوع اردو اور دوسرا فارسی (ناگپور یونیورسٹی 1991) تھا۔ (1972 میں) مہاراشٹر کالج (ممبئی) کے پہلے ریڈر اور پھر شعبہ فارسی کے صدر بنائے گئے۔ 1991 تک انھوں نے یہاں تدریسی خدمات انجام دیں۔ انھیں 2000 میں فارسی ہی کے سلسلے میں صدر جمہوریہ کی جانب سے اعزاز بھی دیا گیا، مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی نے بھی اپنے خاص ایوارڈ سے پروفیسر نورالسعید اختر کو سرفراز کیا تھا۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہوئیں جن میں سلاطین کا شوق (قلم پبلی کیشنز، ممبئی) اور مضراب سخن (گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر) مشہور ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 28 جولائی 2018

قاضی فضل الٰہی

کولکاتا: کولکاتا پریس کلب کے مشہور جرنلسٹ قاضی فضل الٰہی کا 5/اگست 2018 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 70 سال کے قریب تھی۔ ایک ہفتہ قبل وہ پریس کلب کے یوم تاسیس کے پروگرام میں موجود تھے۔ وہ کولکاتا آبزرور، سی ٹی وی این، سی این ٹی وی میں کام کرچکے ہیں۔ وہ گزشتہ کئی سالوں سے پریس کلب سے وابستہ تھے اور ایگزیکٹیو کمیٹی کے رکن رہنے کے ساتھ کلب کے خزانچی کے عہدے پر بھی کام کرچکے ہیں۔ دوسری طرف پریس کلب نے اپنے سینئر اور فعال صحافی قاضی فضل الٰہی کے اچانک انتقال پر گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 اگست 2018

محمد مختار وفا

دربھنگہ: معروف شاعر محمد مختار وفا، مغربی چمپارن کا 9 اگست کو سہ پہر تین بجے کے قریب حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ وہ 63 برس کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ محمد مختار وفا انتہائی خلیق اور منکسر المزاج شخصیت کے مالک تھے۔ انتقال سے دو روز قبل انھوں نے فیس بک پر یہ شعر پوسٹ کیا تھا۔

سکوت شب کی گویائی بہت ہے
میسر ہو تو تنہائی بہت ہے

محمد مختار وفا کے انتقال کی خبر جیسے ہی سوشل میڈیا پر عام ہوئی

ان کے چاہنے والوں پر غم واندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سیکڑوں افراد نے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے سانحۂ ارتحال کو شعروادب کی دنیا کا ایک بڑا خسارہ قرار دیا۔

فیس بک 10 اگست 2018

سید ہاشم رضا

بتیا: ماہر تعلیم، ممتاز شخصیت اور بانی ہیڈ ماسٹر آمنہ اردو ہائی اسکول، بتیا (مغربی چمپارن) سید ہاشم رضا (ولادت: یکم دسمبر 1935، محلّہ: قلعہ، بتیا) کا انتقال 14 اگست 2018 کو 3 بجے سہ پہر میں طویل علالت کے بعد ہوگیا اور ان کی تکفین بعد نماز ظہر بڑی عیدگاہ قبرستان میں عمل میں آئی جنازے میں

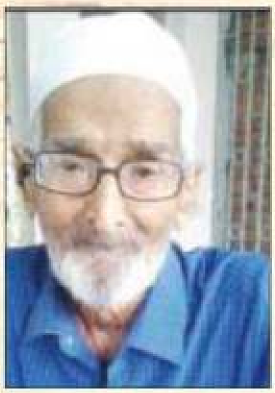

خویش واقارب کے علاوہ شہر کے معززین اور شاگردان کثیر تعداد میں شریک ہوئے اور مغفرت کی دعا کی۔ مرحوم کے والد بزرگوار بتیا رجسٹری آفس کے رجسٹرار تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹیاں نزہت جہاں (لوسی) اور نصرت جہاں (نوشی) اور ان کے خویش ڈاکٹر انتصار الحق (سرجن) ہیں۔ ان کے بے حد عزیز شاگردوں میں ڈاکٹر امام اعظم، سید نیر حسنین، پروفیسر صفدر امام قادری، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' پٹنہ، 11 اگست 2018

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ رمنی آرڈر.............................. بتاریخ..............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language مسلک ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام: ....

پتہ: ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

انتخاب سخن (جلد چہارم) سلسلۂ مظہر جان جاں

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 315
قیمت: 155 روپے

میکرو اکنامکس برائے عوام

مصنف: سید اطہر رضا بلگرامی
صفحات: 196
قیمت: 110 روپے

اردو فکشن کی تنقید

مصنف: پروفیسر ارتضیٰ کریم
صفحات: 546
قیمت: 230 روپے

کلیات خواجہ احمد عباس (آٹھ جلدیں)

تدوین و ترتیب: ارتضیٰ کریم
صفحات (سیٹ): 3923+30
قیمت (سیٹ): 1935 روپے

کہکشاں کیا ہے؟

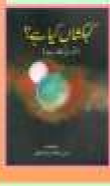

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 65
قیمت: 60 روپے

چلو چاند پر

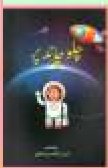

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 33
قیمت: 40 روپے

پیکر فکر و عمل: سید حامد

مرتب: سید منصور آغا
صفحات: 454
قیمت: 210 روپے

یہ پیڑ پودے

مصنف: انصار احمد معروفی
صفحات: 52
قیمت: 20 روپے

یہ زمین

مصنف: انصار احمد معروفی
صفحات: 75
قیمت: 25 روپے

کلیات فراق (غزلیات) جلد اوّل و دوم

مرتب: جعفر رضا
صفحات: 556 (اوّل) 576 (دوم)
قیمت: (سیٹ) 520 روپے

اصلاح الاصلاح

مصنف: ابر احسنی گنوری
مقدمہ: شمس رمزی
صفحات: 129
قیمت: 85 روپے

خلا میں ہندوستانی پروگرام کی جھلکیاں

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 50
قیمت: 50 روپے

جتنے دور اتنے پاس

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا
صفحات: 289
قیمت: 140 روپے

محمود ایاز کی تحریریں

مرتب: اکرم نقاش
صفحات: 619
قیمت: 275 روپے

انتخاب سخن (جلد سوم) سلسلۂ مومن

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 326
قیمت: 155 روپے

تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات

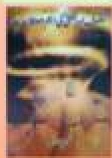

مصنف: شمیم طارق
صفحات: 411
قیمت: 185 روپے

عروجِ فن کلیات خلیل الرحمٰن اعظمی

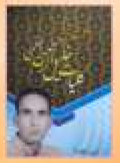

مرتب: ہما مرزا
صفحات: 260
قیمت: 145 روپے

کلیات ماجدی (شخصیت) جلد چہارم

ترتیب و تدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی
صفحات: 527
قیمت: 230 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, September-2018, Vol.20, Issue:09
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/08/2018
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025